وطن عزیز پر مرمٹنے والوں کی جاں گداز داستان

واجدہ وینا اور وطن

حکایت کا مشہور و معروف سلسلہ، پہلی بار کتابی صورت میں

حصّہ اوّل



عنایت اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔



پیش لفظ!

وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہیں جن کی رگوں میں حبِ پاکستان لہو کے ساتھ رواں دواں ہے۔ کتنے مقدس ہیں وہ لوگ جو اس پاک سرزمین کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں۔ کتنے عظیم ہیں وہ لوگ جو اس کی بقاء کے لئے سینہ سپر ہیں۔ ایسے لوگ تو قوم وملت کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ اس سرمائے کی حفاظت کرنا ہمارا فرضِ اولین ہے۔

اور کس قدر گھناؤنے ہیں وہ لوگ جو اپنے نفس کی خواہشات کے تابع ہو کر' زر کے غلام ہو کر اور زن کے مرید ہو کر اپنی زندگیوں کو خوشحال بنانے کے لئے اس پاک سرزمین کا سودا کرتے ہیں۔ اس کے ماتھے پر لہو کا ٹیکہ لگاتے ہیں۔ اس کی مانگ بھرنے کے بجائے اجاڑنے پر ہمہ وقت کمربستہ رہتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ یہ زر' زن اور زمین تو عارضی پناہ گاہیں ہیں۔ بھلا یہ تینوں چیزیں بھی کسی کی ہوئی ہیں۔ آگ اور پانی کا ملاپ بھی کبھی ہوا ہے۔ جہاں پانی ہو گا وہاں آگ کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

پھر بھلا کیوں لوگ اس آگ کے تعاقب میں ہیں جو پروانوں کی طرح جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ ظاہر وباطن کو فنا کر دیتی ہے۔ محض چند رنگین کاغذی ٹکڑوں کی خاطر ہم اتنے گر جاتے ہیں۔ کہ برے اور بھلے کی تمیز ہی نہیں رہتی۔ آنکھوں کے آگے خواہشات کی پٹی چڑھ جاتی ہے۔ جس سے دنیا کی حقیقت پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ کب تک آخر کب تک ہم اس حقیقت سے چشم پوشی کرتے رہیں گے۔ ایک دن تو یہ پٹی اتر کر رہے گی اور وہ دن کتنا خوفناک ہو گا۔ کتنا اذیت ناک ہو گا۔ اس دن سے ہم کیونکر آنکھیں ملائیں گے۔

یہ پاک سرزمین جس کے حصول کے لئے ہمارے پرکھوں نے جان' مال اور عصمتوں کا نذرانہ پیش کیا۔ کیا یہ قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔ ہمارے بزرگوں کا وہ لہو کیا ہوا۔ کیا اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ کیا ان کی کوئی وقعت نہ تھی۔ کیا ان کے لہو کی قیمت ہم اس طرح چکائیں گے۔ کیا ان کی قربانیوں کو بھی روند ڈالیں گے۔ کیا ان کی محبتوں کو

یوں بھلا ڈالیں گے۔

یہ لمحہ فکریہ ہے۔ ایک طرف تو اپنے ہی اس ملک کے درپے ہیں اور دوسری طرف مکار بنیا اسے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس ملک کے سپوت ہی اسے کھوکھلا کرنے میں مصروف ہیں۔ جب اپنے ہی گھر کے دشمن ہو جائیں تو اس گھر کی بنیادیں کس طرح قائم رہ سکتی ہیں۔ اس کا اتحاد کیسے برقرار رہ سکتا ہے۔ آخر ہماری سوچ کس طرف جا رہی ہے۔ ہمارے نظریات کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ وقت کا دھارا پلٹتا رہتا ہے۔ میزان کے دونوں پلڑے کبھی یکساں نہیں رہتے۔ ایک پلڑا جھکتا ہے تو دوسرا اٹھتا ہے۔ توازن برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ توازن ہی کا نام زندگی ہے۔ یہ اونچ نیچ یہ اٹھک بیٹھک زندگی کی علامت تو ہے۔ مگر حاصل زندگی نہیں۔ ہم خواہشات کے گرداب میں پھنس چکے ہیں۔ ہمیں اس گرداب سے نکلنا ہے۔ ایک نئی تعمیری سوچ لے کر۔ اپنے ملک کو درخشندہ کرنے کی خواہش لے کر۔ ایک عزم صمیم لے کر جذبہ تعمیر لے کر پھر کہیں جا کر ہم میں محمد بن قاسم پیدا ہوں گے۔ پھر کہیں طارق بن زیاد کی شکل دکھائی دے گی۔ انہیں صورتوں میں کچھ تو میجر عزیز بھٹی ہوں گے' کچھ راشد منہاس اور کچھ کیپٹن کرنل شیر خان اور حوالدار لالک جان ہوں گے۔ جو اپنے لہو کا نذرانہ دے کر اس وطن کی سالمیت کے چراغ کو روشن رکھیں گے۔ واجدہ' وینا اور وطن بھی ایسے ہی لوگوں کی کہانی ہے۔ جنہوں نے اپنے وطن کی مانگ بھرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دی۔ جن کے لئے وطن ہی سب کچھ تھا۔ جن کا ایمان ہی پاک دھرتی تھی۔ جو اس دھرتی کے دشمنوں کے لئے سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوئے۔ جنہوں نے اپنے لہو سے اس چراغ کو روشن رکھا۔

ہماری نئی نسل ان قربانیوں سے ابھی آشنا نہیں ہوئی جو ہمارے بزرگوں نے اس ملک کے لئے دیں۔ ان قربانیوں کی یاد ہی ہماری زندگی ہے۔

آیئے عہد کریں کہ ان قربانیوں کو فروغ دیں گے۔ اس ملک کی سالمیت کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اسے اپنی ماں کی طرح مقدس خیال کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عہد پر کاربند رکھے۔

میجر عثمان کی ڈرائیونگ اُس شام دیکھنے والی تھی۔ گنجان ٹریفک میں اُس کی سوزوکی کار کسی گاڑی کو دائیں طرف سے' کسی کو بائیں طرف سے اوور ٹیک کرتی اُڑی جا رہی تھی۔ ایک چوک کی بتی سرخ ہوئی۔ دوسری طرف کی ٹریفک چل پڑی۔ میجر عثمان نے جیسے سگنل لائٹ دیکھی ہی نہ ہو۔ اس نے رفتار کم نہ کی۔ اپنے سامنے رکی ہوئی دو گاڑیوں کے بائیں سے گاڑی نکال کر لے گیا۔ چوک کے آگے کھڑا ٹریفک کانسٹیبل اسے رکنے کا اشارہ دے کر اس کے راستے میں آگیا لیکن اچھل کر پھر فٹ پاتھ پر جا پہنچا کیونکہ میجر عثمان کی سوزوکی کی رفتار ذرا سی بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی ٹریفک کانسٹیبل کے قریب سے زناٹے سے گزر گئی۔

یہ سفید سوزوکی اُسی رفتار پر چھاؤنی کے پل پر چڑھی' اُتری' فورٹریس سٹیڈیم کی طرف مڑی اور چھوٹے سے ایک ریستوران کے سامنے اس طرح رکی کہ بریکوں کی چیخیں دُور دُور تک سنائی دیں۔ میجر عثمان گاڑی سے نکلا۔ دروازہ لاک کیا اور جب ریستوران کی طرف چلا تو ایک نسوانی آواز نے اسے روک لیا۔

"اتنی دیر؟" ___ اسے مانوس آواز سنائی دی ___ "پندرہ منٹ سے...."

"اوسویٹ!" — میجر عثمان نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا — "آج آفس میں پھنس گیا تھا۔ کور کمانڈر بڑے ہی غلط وقت پر آن دھمکا اور اس نے ڈیڑھ گھنٹہ میرے بریگیڈ کمانڈر کے ساتھ لگادیا۔ وہ گیا تو بریگیڈ کمانڈر نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے آفیسرز کو بلاکر احکام دینے شروع کر دیئے"۔

"کوئی خاص بات تھی؟" — اُس لڑکی نے پوچھا جس نے عثمان کا بڑھا ہُوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا — "کوئی ایمرجنسی؟"

"کچھ بھی نہیں" — عثمان نے بے پرواہی سے جواب دیا — "روٹین .... آؤ"

— وہ لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ریستوران کے دروازے کی طرف چل پڑا — "گھر پہنچا تو نہ بیوی کی طرف توجہ دی نہ بچوں کی طرف۔ وردی اتاری' یہ کپڑے پہنے اور وہ بولی چائے رکھ دی ہے۔ واسی میری ٹانگ سے لپٹ گیا۔ بائی گاڈ' نہ بچے کی طرف دھیان گیا نہ بچے کی ماں کی طرف جس نے کپڑے بدلنے کے دوران چائے تیار کر لی تھی۔ بچے سے ٹانگ چھڑائی اور اس کی ماں سے کہا کہ برٹش آرمی کا ایک ڈیلیگیشن آیا ہُوا ہے۔ مجھے فوراً آفیسرز مَیس پہنچنا ہے اور ڈنر کے انتظامات دیکھنے ہیں"۔

وہ دونوں ریستوران کے اندر جاکر ایک کونے کی ٹیبل پر بیٹھ گئے تھے۔ ریستوران کا ایک ہی کمرہ تھا جو ڈائننگ ہال کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ میزیں عام ہوٹلوں کی نسبت دُور دُور تھیں اور ہر میز کے اوپر مدھم روشنی تھی جس میں میز پر بیٹھنے والے ایک دوسرے کو اور میز پر رکھی ہوئی کھانے پینے کی اشیاء کو ہی دیکھ سکتے تھے۔ اس کمرے کی تمام میزوں پر کھانے والے موجود ہوتے تو بھی یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی ایک انسان بھی موجود نہ ہو۔ ہر ایک کے ہونٹ ہلتے نظر آتے تھے لیکن کسی کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس ریستوران میں ڈسپلن اور آداب و اخلاق کے پابند لوگ آتے تھے بلکہ یہاں وہ لوگ آتے تھے جن کا ڈسپلن اور آداب و اخلاق کے ساتھ دُور پار کا بھی تعلق نہیں ہوتا تھا۔

یہ سب نوجوان ہوتے تھے .... نوجوان جوڑے .... اپنے کلچر سے بیزار' امریکہ کے مادر پدر آزاد کلچر کے شیدائی نوجوان' رشوت خور افسروں' بڑے زمینداروں' جاگیرداروں' سمگلروں کے بیٹے تھے اور بیٹیاں بھی۔ یہ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے اپنے آپ کو پاکستان کے عوام سے برتر اور اعلیٰ نسل کا سمجھتے تھے لیکن یہ نئی تہذیب کے

گندے انڈے تھے جو عشق و محبت کی پینگیں بڑھانے کے لئے اس ریستوران میں جایا کرتے تھے۔

یہ ایک ہی نہیں' پاکستان کے بڑے شہروں مین ایسی بے شمار ریستورانیں کھل گئی تھیں جن کے اندر نیم تاریکی کی حد تک روشنی کم رکھی جاتی تھی تاکہ جوڑوں کو ہر قسم کی حرکت کرنے کی آزادی ہو۔ اس قسم کی ریستورانوں میں امیرماں باپ کے بیٹے اپنی گرل فرینڈز کو کھلانے پلانے کے لئے لے جاتے ہیں۔

ایسی ریستورانیں کھچا کھچ بھری ہوئی ہوں تو بھی خاموش اور خالی لگتی ہیں حالانکہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ مسلسل بولتے ہیں۔ وہ ذرا اونچی آواز میں اس لئے نہیں بولتے کہ وہ جو باتیں کر رہے ہوتے ہیں وہ سرگوشیوں میں ہی کی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ انگریزی ہَلا گُلا گانے بھی دھیمی آواز میں سنائی دیتے تھے۔ یہ کیسٹ ریستورانوں والے چلائے رکھتے تھے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ ایک میز پر بیٹھے ہوئے جوڑے کی سرگوشیاں ساتھ والی میز تک بھی نہیں پہنچتی تھیں۔

اسلامی مملکت میں ایسی باتیں کی جاسکتی ہیں لیکن سرگوشیوں میں!

اسلامی مملکت میں نازیبا حرکتیں کی جاسکتی ہیں لیکن مدھم روشنی میں!

یہ ریستورانیں اور کیبنوں والے جدید ہوٹل اسلامی مملکت میں نئی تہذیب کا عشق و محبت کرنے والوں کو گوشہ تنہائی مہیا کرتے ہیں اور دولت سمیٹ رہے ہیں۔

ان ریستورانوں کے نام بھی رومانی قسم کے تھے۔ میجر عثمان لڑکی کو ساتھ لے کر جس ریستوران میں جا بیٹھا تھا' اس کا نام "لورز کارنر" (محبّت کرنے والوں کا گوشہ) تھا۔

"میں تو اداس ہوگئی تھی کہ تم نہیں آؤ گے" — لڑکی نے عثمان سے کہا۔

"ایسا ہو نہیں سکتا" — عثمان نے کہا — "میں نے تمہاری سالگرہ پر تمہیں ڈنر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ڈِنر کے بعد تحفہ تم خود پسند کرلینا.... تم نہیں جانتیں میں کس طرح یہاں پہنچا ہوں۔ چوکوں پر ٹریفک سگنلز کی بھی پرواہ نہیں کی۔ مجھے کور کمانڈر پر غصہ آرہا تھا جو ڈو کمانڈر کو ساتھ لئے بے وقت آن دھمکا تھا.... بریگیڈ میجر ہونا بھی ایک لعنت ہے .... لو مینو کارڈ اور خود ہی آرڈر دو"۔

لڑکی مینو کارڈ دیکھنے لگی۔

میجر عثمان علی خان ایک ریٹائرڈ کرنل کا بیٹا تھا۔ اس خاندان کے کسی آدمی کو نوکری کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں تھی۔ بہت بڑا جاگیردار خاندان تھا۔ کرنل کے باپ دادا کو انگریزوں نے تاج برطانیہ کی وفاداری اور پہلی جنگ عظیم میں بہادری کے کارناموں کے صلے میں نہری علاقے میں بے شمار مربعے زمین عطا کی تھی۔ کچھ زمین اپنی بھی تھی۔ فوجی سروس اس خاندان کی روایت بن گئی تھی۔ میجر عثمان کا باپ بھی فوج میں تنخواہ کے لئے نہیں بلکہ کرنیل اور جرنیل بننے کے لئے گیا تھا۔ اس کی فوجی زندگی لیفٹیننٹ کے عہدے سے شروع ہوئی تھی۔ وہ چونکہ جاگیر کی آمدنی کی وجہ سے شہزادہ قسم کا فوجی افسر تھا اس لئے کرنیلی سے آگے ترقی نہ پاسکا اور پنشن کے لئے سروس پوری ہو گئی۔

اس نے اپنے بیٹے عثمان کو بھی مل ملا کر اور خاندان کی فوجی خدمات کا ریکارڈ دکھا کر کمیشن کے لئے سلیکٹ کرا لیا اور ٹریننگ کے بعد عثمان سیکنڈ لیفٹیننٹ بن کر ایک انفنٹری رجمنٹ میں چلا گیا۔ وہ قومی جذبے کے زیر اثر فوج میں نہیں گیا تھا۔ اسے صرف افسر بننا تھا۔ باپ نے اسے کبھی نہیں کہا تھا کہ بیٹا! ملک کی سرحد ماں اور بہن کی مانگ جیسی مقدس ہوتی ہے۔ وہ کہا کرتا تھا' میرا بیٹا پہلے بٹالین کمانڈر' پھر بریگیڈ کمانڈر اور پھر ڈویژن کمانڈر بنے گا۔

عثمان گھر کا شہزادہ تھا۔ چار بہنوں میں ایک ہی بھائی تھا۔ نازوں پلا تھا۔ ہر فرمائش منوانا اس کی فطرت بن گئی تھی۔ اس کی ماں اسے فوج میں نہیں جانے دے رہی تھی۔ کہتی تھی لڑائی لگ گئی تو میرا کوہ نور ہیرے جیسا بیٹا مورچوں کی مٹی میں مٹی ہو جائے گا۔

"تمہارا بیٹا کسی لڑائی میں نہیں جائے گا" ـــــ عثمان کے باپ نے اس کی ماں کو یقین دلایا تھا ـــــ "کبھی انڈیا کے ساتھ لڑائی ہو گئی تو میں بیٹے کو مورچوں میں نہیں جانے دوں گا۔ جی ایچ کیو میں میرا اثر رسوخ چلتا ہے۔ میں بیٹے کو اس کی بٹالین سے نکلوا کر رجمنٹل سینٹر میں بھجوا دوں گا جہاں یہ عیش موج کرے گا"۔

عثمان رجمنٹ میں جا کر بھی شہزادہ ہی رہا۔ پوری تنخواہ ہضم کر کے تنخواہ جتنی رقم ہر مہینے ماں باپ سے لے لیا کرتا تھا۔ باپ نے بھی اسے اتنی فضول خرچی اور عیاشی سے کبھی نہیں روکا تھا۔ اس کی دلچسپی لڑکیوں میں تھی۔ جیب پیسوں سے بھری ہوئی ہو تو اس ہابی میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اس کی کلاس کی لڑکیاں جسے معاشرے کی اپر کلاس کہا جاتا ہے' آسانی سے دستیاب تھیں۔ ان لڑکیوں کے تو جیسے چہروں پر لکھا تھا

ـــ "صلائے عام ہے یارانِ...."

اس کی شادی ہو گئی اور جس لڑکی کے ساتھ شادی ہوئی اسے وہ پہلے سے جانتا تھا۔ اس کی ذات اور برادری کی لڑکی تھی۔ رنگ کچھ زیادہ سفید تو نہیں تھا لیکن چہرے کے خدوخال اور نقش و نگار میں جاذبیت اور جسم کی متوازن ساخت میں کشش تھی۔ قد کاٹھ تو اور زیادہ اچھا لگتا تھا۔ وہ گریجوئیٹ تھی اور نام اس کا واجدہ نسرین تھا۔ سمارٹ' ذہین اور خوش طبع لڑکی تھی۔

شادی کی پہلی رات تک عثمان کی زندگی میں تین چار لڑکیاں باری باری آ چکی تھیں۔ وہ خوبصورت تھیں یا نہیں' ان میں خوبی یہ تھی کہ وہ آسانی سے عثمان کی زندگی میں بلکہ اس کے جال میں آ گئی تھیں۔ عثمان جیسے شکاری اور ماں باپ کے اکلوتے شہزادے عموماً" ضد کیا کرتے ہیں کہ وہ اپنی پسند کی شادی کریں گے لیکن عثمان نے ایسی ضد نہ کی۔ ماں اور بہنوں نے واجدہ نسرین کے انتخاب سے پہلے عثمان سے کہا تھا کہ وہ خود فیصلہ کرے۔ عثمان نے اپنے مخصوص زندہ دل انداز میں اپنا فیصلہ واجدہ کے حق میں دیا تھا۔

پہلی رات عثمان کی وارفتگی بتا رہی تھی کہ واجدہ اس کے دل میں اُتر گئی ہے۔ پہلی رات ہی اس نے واجدہ نسرین کو پیار سے وینا کہنا شروع کر دیا تھا اور اگلی صبح جو اس کی ازدواجی زندگی کی پہلی صبح تھی' اپنے گھر کے تمام افراد سے کہہ دیا تھا کہ آج سے واجدہ کو وینا کہا جائے گا۔ عثمان کی بہنوں نے یہ نِک نیم بہت پسند کیا تھا۔

ہنی مون کے لئے وہ وینا کو اسلام آباد لے گیا اور ایک فائیو سٹار ہوٹل میں قیام کیا تھا' پھر اسے مری برفباری دکھانے کے لئے لے گیا اور نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرتا رہا تھا۔ وہ تو وینا کا ہی ہو کے رہ گیا تھا۔ سلامیوں کی کئی ہزار کی رقم اس کی جیب میں اور وینا کے پرس میں تھی۔ ہنی مون سے واپس آ کر عثمان وینا کو دوسری تیسری شام ہوٹل میں لے جا کر کھانا کھلاتا تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔

"اب ہمیں اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق سنجیدہ ہو جانا چاہئے" ـــــ وینا نے عثمان سے کہا تھا ـــــ "بہت عیش کر لی"۔

"کیا جلدی ہے تمہیں سنجیدہ ہونے کی؟" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "ساری عمر پڑی

ہے.... ابھی تو میں تمہیں اپنے خاص دوستوں کے ہاں لے جاؤں گا"۔

○

اور ایک شام وہ وینا کو اپنے خاص دوستوں کی محفل میں لے گیا۔ یہ محفل تین کنال کی ایک کوٹھی میں بپا کی گئی تھی۔ وہاں نوجوان تھے اور تین چار جواں سال تھے۔ یہ دس بارہ تھے اور ساتھ آٹھ نوجوان لڑکیاں تھیں۔ امپورٹڈ پرفیومز سے کمرہ مہک رہا تھا۔ لڑکیوں کے بال کٹے ہوئے تھے اور انہوں نے جو کپڑے پہن رکھے تھے' ان میں وہ نیم عریاں لگتی تھیں۔ نیم عریانی کو ہی وہ حسن کا راز سمجھتی تھیں۔ ان کا اندازِ کلام مصنوعی' ناز و انداز میں تصنع اور دیگر حرکات پر مغربیت غالب تھی۔ انہوں نے بھنویں پنسل سے بنائی ہوئی تھیں۔ ان کے میک اپ قوس قزح کے رنگوں جیسے تھے۔ ان کی زبان انگریزی تھی۔ کوئی اکی دکی لڑکی کسی مجبوری کے تحت چند الفاظ یا ایک آدھ جملہ اردو کا بولتی تھی۔

نوجوان اور جواں سال لڑکوں کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ان میں سے بھی بعض نے بھنویں پنسلوں سے بنائی ہوئی تھیں اور ہلکا ہلکا پاؤڈر بھی لگا رکھا تھا۔ ان کے بولنے کے انداز ایسے اور حرکتیں جیسے ان میں سے ہر ایک یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ امریکہ یا یورپ کے کسی ملک کی پیداوار ہے اور ہپی بن کر پاکستان میں آ گیا ہے اور وہ سب سے زیادہ ہپّی ہے۔

کیسٹ پلیئر پر انگریزی گانوں کا جسے پاپ میوزک کہتے ہیں' کیسٹ لگا ہُوا تھا۔ اس کی آواز ہلکی تھی۔ جونہی عثمان اور وینا کمرے میں داخل ہوئے' کسی نے کیسٹ پلیئر کی آواز اونچی کر دی اور کسی نے بلند آواز سے انگریزی میں اعلان کیا کہ کیپٹن عثمان اپنی سویٹ وائف کے ساتھ آ گیا ہے۔

کمرہ چیخوں سے گونجنے لگا اور سب نے عثمان اور وینا پر ہلّہ بول دیا۔ لڑکیوں نے تو وینا سے ہاتھ ملانا ہی تھا' لڑکے بھی اس سے ہاتھ ملا رہے تھے اور وینا سُکڑی سمٹی جا رہی تھی۔ دو تین لڑکوں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کے ہلایا۔

"او سویٹ!" —— ایک نے کہا۔

"او' وَٹ اے بیوٹی!" —— دوسرے نے کہا۔

"ونڈر فل!" —— تیسرے نے کہا —— "یُو آر لکی عثمان!"

وینا کا تو وہاں دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ عثمان کی پناہ میں چھپ جانا چاہتی تھی لیکن عثمان اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس طوفان بدتمیزی اور بدتہذیبی میں گم ہو گیا تھا جسے پاکستانی معاشرے کا یہ بالائی طبقہ جدید تہذیب کہتا تھا۔

یہ پاکستان کے اونچے طبقے کا ننگ پن تھا۔

عثمان اس محفل کی دو لڑکیوں کے ساتھ مگن ہو گیا تھا.... کچھ انگریزی میں کچھ اردو میں.... وینا سے اس نے توجہ ہی ہٹا لی تھی۔ وینا کو نئی تہذیب کی گِدّھیں نوچ رہی تھیں۔ اگر وہ اَن پڑھی ہوتی یا مڈل کلاس کی پردہ نشین لڑکی ہوتی تو اس محفل سے بھاگ جاتی۔ وہ اپر کلاس فیملی کی لڑکی تھی۔ بڑے اچھے کالج میں پڑھی تھی اور کالج کی تقریبوں اور سرگرمیوں کی حد تک سوشل تھی۔ اس میں گھٹن اور جھجک نہیں تھی۔ وہ خوش طبع اور زندہ مزاج تھی لیکن اس نے اپنے اردگرد ایک حصار کھینچا ہُوا تھا۔ یہ شرافت اور وقار کا دائرہ تھا جس سے وہ کبھی باہر نہیں نکلی تھی۔

اس نے اس سوسائٹی کی جسے ڈسکو یا پاپ سوسائٹی کہا جاتا تھا' بہت باتیں سنی تھیں اور اس سوسائٹی کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھا بھی تھا بلکہ دیکھتی رہتی تھی۔ اس کے کالج میں ایسی کئی لڑکیاں پڑھتی تھیں جو اس ہپی کلچر کی دلدادہ تھیں۔ ان کی ہر حرکت پر ہپی ازم غالب تھا۔ وہ سگریٹ بھی پیتی تھیں۔ وینا ان لڑکیوں کی نقلیں اتارا کرتی اور ان کے ساتھ کبھی گپ شپ بھی لگا لیا کرتی اور انہیں نفرت کی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا خاوند اسی سوسائٹی اور اسی بے حیا کلچر کا شیدائی ملے گا۔ شادی ہوئی تو خاوند اسے اسی سوسائٹی میں لے گیا جسے وہ کسی کلچر کی غلاظت کہا کرتی تھی۔ اس نے بناوٹی مسکراہٹوں سے یہ ظاہر کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ اس دعوت میں آ کر بہت خوش ہوئی ہے لیکن جوں جوں اس دعوت میں ہنگامہ بڑھتا گیا' وینا کی مسکراہٹ کا پھیکا پن نمایاں ہوتا چلا گیا۔

یہ ہنگامہ شور شرابے تک ہی محدود نہیں تھا' کھانے کے بعد جب ناچ شروع ہو گیا تو وینا کو چکر آنے لگے۔ یہ اگر باقاعدہ ناچ ہوتا تو کوئی بات بھی تھی' یہ تو پاگلوں جیسی اچھل کود تھی۔ ناچتے ناچتے بلکہ اچھلتے کودتے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جاتی تھیں۔ وینا عثمان کو ڈھونڈ رہی تھی لیکن وہ اسے نظر آتے ہوئے بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک دو لڑکوں نے وینا کو بھی بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹا لیکن اس نے ایسی مسکراہٹ سے ٹال دیا جس میں بناوٹ

اور نفرت تھی۔ وہ الگ بیٹھ گئی۔

آدھی رات ہونے کو آئی تھی جب یہ محفل برخاست ہوئی۔ وینا کو فی الواقع چکر آنے لگے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ دیکھ نہ سکی کہ ان نوجوانوں میں بعض جھومنے اور لڑکھڑانے لگے تھے۔ یہ نشے کا اثر تھا جو وہ سگریٹوں میں پیتے رہے تھے۔ وینا کے سر کے چکرانے کی ایک وجہ یہ بدبُو بھی تھی جس سے یہ کمرہ بھر گیا تھا۔ باہر آکر وینا کو جب ٹھنڈی ہوا لگی تو اس نے کچھ سکون محسوس کیا۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کی یہ ذہنی حالت غصے کی وجہ سے ہے' نفرت کی وجہ سے ہے یا یہ اضطراب تھا۔ یہ جو کچھ بھی تھا' وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔

"کہو' لطف آیا؟" — عثمان نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے وینا سے پوچھا۔

وینا نے عثمان کی طرف دیکھا اور چپ رہی جیسے اُسے کوئی جواب سوجھ نہیں رہا تھا یا وہ جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے عثمان سے منہ پھیر لیا۔

"کیوں وینا!" — عثمان نے پوچھا — "تم تو چپ ہی ہو گئی ہو۔ کوئی خاص بات۔ میرا خیال ہے تم نے اس محفل میں اجنبیت محسوس کی ہو گی"۔

"گھر چلیں عثمان صاحب!" — وینا نے اکتاہٹ کے لہجے میں کہا — "پلیز' جلدی گھر چلیں"۔

○

گھر پہنچ کر وینا نے اتنی تیزی سے اپنے کپڑے اتارے جیسے عروسی کے اس لباس سے بھی اسے نفرت ہو گئی ہو۔ وہ کپڑے اتار نہیں رہی تھی بلکہ اپنے جسم سے انہیں نوچ رہی تھی۔ یہ کپڑے تو اس نے بڑے شوق سے پہنے تھے۔ عثمان کے ساتھ شادی کر کے اسے روحانی مسرّت حاصل ہوئی تھی حالانکہ اس نے اپنے دل میں اس خواہش کو کبھی نہیں آنے دیا تھا کہ اس کی شادی عثمان کے ساتھ ہی ہو۔ ہاں ایک خواہش اس کے دل میں اکثر دھڑکتی تھی کہ وہ کسی فوجی افسر کی بیوی بنے۔ عثمان کو اس نے اسی لئے اپنی روح کی گہرائیوں میں اتار لیا تھا کہ وہ پاک فوج کا افسر تھا' اور وہ خوبرو اور امیر ماں باپ کا بیٹا تو تھا ہی' لیکن اس رات اُسے بہت دکھ ہُوا کہ عثمان کا اصل روپ کچھ اور ہے اور آگے چل کر وہ اس کے ساتھ روپ بہروپ کا کھیل کھیلے گا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں آج کا فنکشن اچھا نہیں لگا" — عثمان نے کہا — "تمہیں سوشل ہونا پڑے گا وینا! تم ایک کیپٹن کی بیوی ہو"۔

"اس فنکشن میں اچھا لگنے والی کون سی بات تھی؟" — وینا نے کہا۔ وہ کپڑے بدل چکی تھی اور اب وہ عثمان کا سامنا کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھی۔ اس نے کہا — "اور جہاں تک آپ کے کیپٹن ہونے کا تعلق ہے وہ میری ایک دلی خواہش تھی جو اللہ نے پوری کر دی لیکن عثمان صاحب میری خواہش کپتانی کے عہدے سے یا افسری سے شادی کرنے کی نہیں تھی' میں کسی فوجی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ فوجی سے میری مراد وطن کا وہ سرفروش ہے جو اپنے ملک کی آن پر اپنا سر کٹوا دیتا ہے"۔

"او نو وینا!" — عثمان نے کہا — "تمہارے منہ سے یہ باتیں مجھے عجیب لگی ہیں۔ ایسی باتیں پاکستان کے مڈل کلاس کے لوگ کیا کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے تم یہ بھی کہو گی کہ میں چاہتی ہوں کہ تم محمد بن قاسم بنو اور تم طارق بن زیاد بنو"۔

"یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ آپ محمد بن قاسم یا طارق بن زیادہ بنیں گے" — وینا نے کہا — "لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ آپ اس سوسائٹی کے سانچے میں ڈھل جائیں جس میں آپ کہتے ہیں کہ بہت مزہ آتا ہے"۔

"تو کیا تمہیں یہ سوسائٹی اچھی نہیں لگی؟" — عثمان نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"آپ پوچھتے ہیں اچھی نہیں لگی!" — وینا نے کہا — "مجھے اس سوسائٹی سے نفرت ہے عثمان صاحب! میں آئندہ آپ کے ان دوستوں سے ملنا پسند نہیں کروں گی"۔

"او شٹ اپ وینا!" — عثمان نے دوستانہ بے تکلفی کے لہجے میں کہا — "تم جیسی پُرکشش اور ہائی کلاس فیملی کی لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ کل تم یہ بھی کہو کہ میں بھی تمہیں اچھا نہیں لگتا"۔

"میرے منہ سے آپ ایسی بات مرتے دم تک نہیں سنیں گے" — وینا نے کہا — "میں نے آپ کو روح کی گہرائیوں سے قبول کیا ہے۔ آپ کی شخصیت کا دوسرا پہلو یعنی آپ کا فوجی ہونا مجھے اور زیادہ اچھا لگا ہے۔ اس طرح میرے ذہن میں آپ کا ایک ایسا امیج بن گیا ہے جسے ذرا سی بھی ٹھیس پہنچی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا"۔

"میری بات غور سے سنو وینا!" — عثمان نے سنجیدگی سے کہا — "میں یہ بات پہلی اور آخری بار کہہ رہا ہوں۔ مجھے اُس قسم کا فوجی نہ سمجھنا جیسا تم نے اپنے ذہن میں امیج بنایا ہُوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ میں کم عقل نہیں اور میں اسی معاشرے کا فرد ہوں۔ میں جانتا ہوں عام لوگ کیا باتیں کرتے ہیں۔ تم مجھے مجاہد سمجھ

رہی ہو۔ وقت آیا تو معلوم نہیں میں کیا کروں گا۔ اتنا ضرور ہے کہ میں محاذ سے بھاگ نہیں جاؤں گا لیکن میں تمہیں صاف الفاظ میں بتا دیتا ہوں کہ میں فوج میں کسی قومی یا ملکی جذبے سے بھرتی نہیں ہُوا نہ میں نے کبھی ایسا نعرہ لگایا ہے کہ میں اپنے وطن کی آن پر جان قربان کر دوں گا۔ یہ تاریخی ناولوں کے مکالمے ہیں جو میں نے نہ بولے ہیں نہ بولوں گا"۔

"آپ کی یہ باتیں سن کر میرے دل کو تکلیف سی ہو رہی ہے" ___ وینا نے کہا۔

"ہو گی!" ___ عثمان نے کہا ___ "میری خاطر تھوڑی سی تکلیف برداشت کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہوں وہ تمہیں ایک ہی بار بتا دوں۔ میں تمہیں کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا.... یہ تو تمہیں معلوم ہو گا ہی کہ ملٹری سروس ہمارے خاندان کی روایت ہے۔ میں یہ کہنے سے بھی نہیں جھجکوں گا کہ ہمارے گھر میں اب بھی انگریزوں کی تعریفیں ہوتی ہیں۔ میں اپنی مرضی سے فوج میں نہیں گیا' یہ میرے ابّو کی خواہش تھی بلکہ حکم تھا جو میں ٹال نہیں سکتا تھا"۔

"آپ ٹال سکتے تھے" ___ وینا نے کہا ___ "مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ ماں باپ کے اکلوتے بیٹے ہیں اور آپ اپنی ہر بات منوا لیتے ہیں۔ اگر آپ یہی ضد لے بیٹھتے کہ فوج میں نہیں جانا تو آپ کے والدین آپ کو فوج میں نہ بھیجتے"۔

"تم نے جو سنا ٹھیک سنا تھا" ___ عثمان نے کہا ___ "لیکن میں نے کچھ اور بھی سوچ لیا تھا۔ تم میری عقلمندی کی تعریف کرو کہ میں نے کتنی دُور کی سوچی تھی۔ سوچی یہ تھی کہ ابّو سے میں نے کچھ وصول بھی کرنا تھا۔ تم نہیں جانتی کہ ان کا دماغ فوجی ہے اور وہ سختی کرنا بھی جانتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اپنی تنخواہ میں سے یہ عیش و عشرت کر سکتا ہوں؟ میں جتنی تنخواہ فوج سے لیتا ہوں' اس سے ڈیڑھ گنا زیادہ وظیفہ ابّو یا امّی سے بٹور لیتا ہوں"۔

"پھر یوں کہیں کہ آپ بگڑے ہوئے شہزادے ہیں" ___ وینا نے مسکراتے ہوئے کہا ___ "اور میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ آپ کو آگے جانا پڑا تو آپ توپ کے گولے کا دھماکہ بھی برداشت نہیں کر سکیں گے"۔

"آگے جانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی" ___ عثمان نے کہا ___ "ابّو نے میرے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے کہ لڑائی کی صورت میں وہ مجھے سینٹر میں ہی رکوا لیں گے یا ان کے اثر و رسوخ سے مجھے چھاؤنی کی ہی کسی ڈیوٹی پر لگا دیا جائے گا"۔

وینا کا سر جھک گیا اور اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔

"کیوں وینا!" ___ عثمان نے وینا کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا سر اوپر کرتے ہوئے کہا ___ "کیا سوچ رہی ہو؟.... یہ ایسا مسئلہ نہیں جس کے متعلق اتنا زیادہ سنجیدہ ہو گئی ہو!"

"ایک بات بتائیں عثمان صاحب!" ___ وینا نے پوچھا ___ "کیا فوج میں تمام افسر یا زیادہ سے زیادہ افسر آپ جیسے شہزادے ہی ہیں؟"

"نہیں" ___ عثمان نے جواب دیا ___ "شہزادے بھی ہیں اور وہ مجاہد بھی ہیں جن کا امیج تم نے اپنے ذہن میں بٹھا رکھا ہے۔ وہ لڑنے مرنے کے لئے بھرتی ہوئے ہیں۔ وہ سب مڈل کلاس فیملیوں کے سر پھرے نوجوان ہیں۔ ان کی موجودگی میں اگر چند ایک افسر شہزادے بنے رہے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم 'پلے بوائے' پڑھتے ہیں اور ہم پلے بوائے سوسائٹی کے لوگ ہیں۔ ہم عیش کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور عیش و عشرت کرتے ہی دنیا سے اُٹھ جائیں گے۔ ہمیں مرنے کی کوئی جلدی نہیں۔ اس ملک کو دشمن سے بچانے کے لئے بہت سے لوگ موجود ہیں"۔

"ایک بات پر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے" ___ وینا نے کہا ___ "وہ یہ کہ آپ مڈل کلاس کی بات اس طرح کرتے ہیں جیسے ملک کی چوکیداری اسی کلاس کی ذمہ داری ہے لیکن یہی وہ کلاس ہے اور اس کے نیچے کے غریب لوگ ہیں جو انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ میں ان لوگوں کو مظلوم کہا کرتی ہوں لیکن ملک پر جب بھی مصیبت کا وقت آیا تو یہی فریب خوردہ مخلوق ملک کے کام آئی"۔

"تم کیسی دقیانوسی باتیں کرتی ہو وینا" ___ عثمان نے کہا ___ "تم مڈل کلاس کی لڑکی تو نہیں۔ میں حیران ہوں کہ تم ایسی باتیں کر رہی ہو۔ تم اپنی کلاس کے وقار کا خیال رکھو۔ اس ملک کی لیڈرشپ ہمارا حق اور ہمارا ورثہ ہے۔ میری برادری میں اس وقت بھی چار ایم این اے ہیں اور دو منسٹر رہ چکے ہیں۔ تمہارا خاندان بھی سوشل سٹیٹس میں کچھ کم نہیں"۔

"لیکن عثمان صاحب!" ___ وینا نے کہا ___ "میں یہ نہیں بھول سکتی کہ میں مسلمان گھرانے کی لڑکی ہوں۔ میں اپر کلاس کی لڑکی تو ہوں لیکن جب خیال آتا ہے کہ میں اسلام کی پیروکار ہوں تو میری نظریں اپر سے لوئر کلاس میں گر جاتی ہیں"۔

عثمان نے منہ پھیر لیا۔ اس کے چہرے پر اکتاہٹ کا تاثر نمایاں ہو گیا تھا اور اس تاثر میں ایسی جھلک بھی تھی جیسے وہ اس موضوع پر وینا کے ساتھ مزید بات نہ کرنا چاہتا ہو۔

کچھ ایسا ہی تاثر وینا کے چہرے پر بھی تھا بلکہ عثمان کی نسبت کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس تاثر میں مایوسی کی جھلک بھی تھی۔

دونوں ایک ہی بیڈ پر لیٹ گئے۔ ان کے جسموں کے درمیان تو کوئی فاصلہ نہیں تھا لیکن دل ایک ندی کے دو کناروں کی مانند ہو گئے تھے جن کے ملنے کا امکان ہی نہیں ہوتا۔ ان کے خیالوں میں' سوچوں میں اور ذہنیتوں میں اتنا زیادہ فرق تھا جیسے دو مختلف راستے مختلف منزلوں کو جا رہے ہوں۔



پانچ سال گزر گئے۔ ان پانچ سالوں میں عثمان فوج میں میجر اور گھر میں دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ بڑا بچہ تین سال کا اور چھوٹا ابھی چند مہینوں کا تھا لیکن عثمان کی زندگی اُس ڈگر پر چلی گئی تھی جہاں باپ اپنے آپ کو غیر شادی شدہ سمجھنے لگتا ہے۔ گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہی وہ بھول جاتا ہے کہ وہ کسی بیوی کا خاوند یا بچوں کا باپ ہے۔ عثمان اس مقام سے بہت دُور نکل گیا تھا اور وہ چھوٹے سے ایک جدید ریستوران میں ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا اور اسے بڑے فخر اور مسرّت سے سنا رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی چائے ٹھکرا کر اور اپنی ٹانگ سے لپٹے ہوئے بچے کو ٹانگ سے نوچ کر اس کے پاس پہنچ گیا ہے۔

"تمہیں شادی کرنی بھی نہیں چاہئے تھی!" ـــــ اس لڑکی نے عثمان سے کہا ـــــ "تمہاری قدر مجھ سے زیادہ اور کوئی لڑکی نہیں کر سکتی"۔

اس لڑکی کا نام لبنیٰ سعید تھا اور عثمان اسے لُوسی کہتا تھا۔

"بیوی بچے میرے اور تمہارے درمیان حائل نہیں ہو سکتے" ـــــ میجر عثمان نے نشیلے سے لہجے میں کہا ـــــ "ایسا کبھی نہیں سنو گی کہ میں نے بیوی کے کہنے پر تمہیں کہیں انتظار میں رکھا ہو اور تم تک نہ پہنچا ہوں.... ہٹاؤ ان باتوں کو لُوسی' یہ بتاؤ کہ تمہارے ممی اور ڈیڈی نے کوئی فیصلہ کیا ہے یا نہیں۔ میں تو اب بیتاب ہو گیا ہوں"۔

"اتنی بیتابی کی تو کوئی ضرورت نہیں" ـــــ لُوسی نے کہا ـــــ "وہ تو جب ہو کہ میں تمہیں نہ مل سکوں۔ تم نے جب کہا' جہاں کہا میں وہاں تم سے پہلے پہنچ گئی۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ میرا منگیتر ایک چٹان بن کر ہمارے راستے میں کھڑا ہو گیا ہے۔ تم میرے

والدین کی مجبوری کو بھی جانتے ہو.... وہی برادری کی پابندیاں"۔

"کس قدر دقیانوسی لفظ ہے یہ' برادری" ـــــ میجر عثمان نے میز پر زور سے ہاتھ مار کر کہا ـــــ "ہمارے بوڑھوں نے ہمیں بھی اپنی قدیم اور زنگ آلود زنجیروں میں باندھ رکھا ہے۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ ہم نوجوان زمانے کے ساتھ کتنے ایڈوانس ہو گئے ہیں لیکن ہم نئی روشنی اور جدید کلچر کے باوجود صدیوں پرانی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ٹریجیڈی ہوئی ہے۔ وینا جتنی خوبصورت اور جتنی زندہ دل ہے اتنی ہی دقیانوس اور قدیم خیالات کی ہے۔ میں تو اسے صرف بچے پیدا کرنے کے لئے استعمال کر رہا ہوں۔ ایسی پتھر ہے کہ میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتی"۔

"وہ تمہاری بات سمجھنا ہی نہیں چاہتی" ـــــ لُوسی نے طنزیہ لہجے میں کہا ـــــ "تم نے پہلے کبھی بتایا تھا کہ وہ اس دور میں بھی جہاد اور قومی جذبے وغیرہ کی باتیں کرتی ہے... مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ کہاں پھنس گئے!"

"تم اپنے منگیتر کو راستے سے ہٹاؤ" ـــــ میجر عثمان نے کہا ـــــ "اگر ہٹتا نظر نہیں آتا تو مجھے بتاؤ"۔

"ڈیڈی بھی یہی کہتے ہیں" ـــــ لُوسی نے کہا ـــــ "میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ ڈیڈی تمہیں بہت چاہتے ہیں اور وہ سوچتے رہتے ہیں کہ یہ منگنی کسی بہانے توڑی جائے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ منگیتر میری جان کا عذاب بنا ہُوا ہے"۔

"تم کہو تو میں اسے سرے سے غائب ہی کر دوں؟" ـــــ میجر عثمان نے کہا۔

"اغوا کرانا چاہتے ہو یا قتل؟"

"میں دونوں کام کر سکتا ہوں" ـــــ عثمان نے جواب دیا ـــــ "لیکن تم مجھے کچھ کرنے نہیں دیتیں"۔

"میں تمہیں یہ کام تو کبھی بھی نہ کرنے دوں گی" ـــــ لوسی نے کہا ـــــ "تم پکڑے گئے تو میری دنیا اندھیر ہو جائے گی"۔



لبنیٰ سعید جو میجر عثمان کی لُوسی تھی' منگنی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ تقریباً ایک سال پہلے ان دونوں کی ملاقات کسی سوشل فنکشن میں ہوئی تھی۔ لوسی پر عثمان ایک

طلسم کی طرح طاری ہو گیا تھا اور عثمان نے لوسی کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اتار لیا تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی دونوں ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے تھے' اور اُسی رات سے عثمان کے دل سے وینا نکلنی شروع ہو گئی تھی۔ ان چند مہینوں میں ہی عثمان وینا سے اکتانے لگا تھا۔ اُس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اب لوسی اس کی بیوی بنے گی لیکن دو چار ملاقاتوں کے بعد لوسی نے عثمان پر یہ بم پھینکا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اور اس کا منگیتر چونکہ آزاد خیال ہے اس لئے وہ اس سے ملتا ہے' اسے ہوٹلوں میں لے جاتا ہے اور اس کا انداز مغربی معاشرے کی طرح کورٹ شپ والا ہے۔

لُوسی اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھی۔ مجبوری اس وقت پیدا ہوئی تھی جب لُوسی نے عثمان کو دل میں بٹھا لیا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ منگیتر کو ہر لحاظ سے پسند کرتی' اس کا انتظار کرتی' دن رات میں ایک دو مرتبہ فون پر اس کے ساتھ بات کرتی اور ہنسی خوشی اس کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ اب عثمان کو وہ بتاتی تھی کہ یہ منگیتر اسے ذرا سا بھی اچھا نہیں لگتا اور اس سے وہ آزاد ہونا چاہتی ہے لیکن منگنی توڑنا ناممکن نظر آتا ہے۔

لوسی کے بیان کے مطابق یہ منگنی برادری کی پابندیوں کے تحت ہوئی تھی۔ اسے توڑنے کے لئے برادری کے بزرگوں کی رضامندی لازمی تھی لیکن وجہ اتنی ٹھوس ہونی چاہئے تھی کہ برادری کے بڑے محسوس کریں کہ یہ منگنی ٹوٹ ہی جانی چاہئے۔ ایسی کوئی وجہ موجود نہیں تھی۔ لوسی کی یہ بات سننے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا کہ وہ اب منگیتر کی بجائے کسی اور کو چاہتی ہے۔

لوسی منگنی ٹوٹ نہ سکنے کی ایک وجہ یہ بھی بتاتی تھی کہ اس کا منگیتر بڑے مضبوط خاندان کا ہے۔ اگر منگنی توڑنے کا نام بھی لیا گیا تو وہ لوسی کو اغوا کر لے گا۔

لوسی نے عثمان کو بتایا تھا کہ اس کا منگیتر اس کے خاندان پر کچھ ایسے ناگوار طریقے سے سوار ہو گیا ہے کہ اس کے والدین بھی اب اس منگیتر کو اچھا نہیں سمجھتے۔ لوسی نے اپنے والدین کے ساتھ میجر عثمان کا ذکر کیا تھا اور انہوں نے لوسی کو اجازت دے دی تھی کہ وہ عثمان کو گھر لے آئے۔

ایک شام لوسی عثمان کو اپنے گھر لے گئی اور اپنے والدین سے ملوایا۔ عثمان خوبرو جوان تھا اور وہ زبان کا جادو بھی چلا سکتا تھا۔ اس نے لوسی کے والدین کو متاثر کر لیا۔ تیسری چوتھی ملاقات میں لوسی کے باپ نے بے ساختہ کہہ دیا کہ وہ لوسی کے منگیتر کو پسند

نہیں کرتا اور لوسی کی شادی عثمان کے ساتھ کرنے کو تیار ہے لیکن منگیتر کو راستے سے ہٹائے بغیر اس کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد عثمان نے لوسی کے گھر جانا شروع کر دیا تھا۔ لوسی اسے اپنے ساتھ الگ کمرے میں بٹھاتی تھی اور اپنے ہاتھوں اسے مشروب پلاتی اور خاطر تواضع کرتی تھی۔ میجر عثمان جب اس کے ہاتھ سے کوکا کولا یا اس قسم کا کوئی اور مشروب پیتا تو کچھ دیر بعد وہ ایک سرور سا محسوس کرنے لگتا تھا۔ اس دوران لوسی سراپا رومان بنی رہتی تھی۔ ایسے میں لوسی عثمان کو اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور پُرکشش نظر آتی تھی جتنی وہ تھی۔ عثمان پر جو نشے اور سرور کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اسے وہ لوسی کے حسن و عشق کا خمار سمجھتا تھا۔

لوسی اتنی حسین تھی یا نہیں' اس کے ناز و انداز ایسے تھے جو عثمان کو مسحور کر لیتے تھے۔ یہ تو قدرتی بات ہے کہ جو انسان دل میں سما جائے اس کی بُری بات بھی اچھی لگتی ہے۔ لُوسی کے مقابلے میں اسے جب وینا کا خیال آتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے حلق میں ایک چھپکلی اٹک گئی ہے جسے نہ وہ نگل سکتا ہے نہ اُگل سکتا ہے۔ وینا اسے ذرا سی بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ عثمان جس شام لوسی کے گھر جاتا اور وہ اسے الگ کمرے میں بٹھا کر مشروب وغیرہ پلاتی تھی اس شام گھر آ کر وہ وینا کو دیکھتا تو وہ اسے اور زیادہ بری لگتی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ اونگھنے لگتا اور وقت سے بہت پہلے وہ گہری نیند سو جاتا تھا۔

لوسی کے گھر میں ہی عثمان کی ملاقات لوسی کے منگیتر کے ساتھ ہوئی تھی۔ منگیتر اسے اتنے تپاک اور پیار سے ملا تھا جیسے وہ پہلے سے ہی ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح جانتے ہوں اور ایک عرصے بعد ان کی ملاقات ہوئی ہو۔ منگیتر نے یہ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ یہ کون اجنبی ہے جو میرے ہونے والے سسرال کے گھر میں اس بے تکلفی سے آتا ہے۔ منگیتر کو دیکھ کر عثمان کے دل میں رقابت کی جو آگ بھڑکی تھی وہ منگیتر کے بے ساختہ اچھے سلوک اور زندہ دلی سے بجھ گئی لیکن اسے جب خیال آتا تھا کہ یہ اس کی محبوبہ کو ہمیشہ کے لئے لے جائے گا تو رقابت کی چنگاری پھر جل اٹھتی تھی۔



میجر عثمان کے گھر کی فضا میں بڑا تکلیف دہ تکدر اور کھچاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ باپ نے

اسے الگ کوٹھی لے کر دے رکھی تھی جس میں عثمان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وینا نے کئی مہینے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ عثمان نے کہیں اور دل لگا لیا ہے اور گھر سے اس کا دل اکھڑ گیا ہے۔ شروع شروع میں تو عثمان اسے ہنس کر ٹالتا رہا اور اسے اپنی محبت کا یقین دلاتا رہا لیکن عثمان نے اپنی جذباتی دنیا میں جو الاؤ جلا لیا تھا اس کے دھوئیں کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ وینا تو اس کے پیچھے ہی پڑ گئی ہے تو اس نے وینا کو ڈانٹنا شروع کر دیا اور ایک روز پہلی بار ان کے درمیان لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچی اور پھر تُو تُو مَیں مَیں آئے دن کا معمول بن گئی۔

وینا نے عثمان کے والدین کے ساتھ ذکر کیا تو عثمان کی ماں نے اسے کہا کہ عثمان کو غلط نہ سمجھو وہ زندہ مزاج اور ہنسنے کھیلنے والا لڑکا ہے لیکن بدکار نہیں۔ عثمان کے باپ کا ردِّعمل بھی کچھ ایسا ہی تھا البتہ باپ نے عثمان کو بلا کر کچھ کھینچا تانی کر دی لیکن اس کا اثر اُلٹا ہُوا۔ اس نے گھر آ کر وینا کو خوب ڈانٹا کہ اسے وہ بدنام کر رہی ہے۔

وینا چار دیواری کی دنیا میں قید رہنے والی بیوی نہیں تھی۔ وہ باہر گھومنا پھرنا جانتی تھی۔ کوئی اجنبی ہو یا جان پہچان والا' اس کے ساتھ کھل کر بات کرنے کا شعور اور صلاحیت رکھتی تھی اور وہ مجبور ہو کر بیٹھ جانے والی عورت نہیں تھی۔ عثمان کے دو دوست تھے جو عثمان کے گھر آتے رہتے تھے۔ کئی بار انہوں نے وہیں کھانا کھایا تھا اور وینا ان کے ساتھ بے تکلف ہو گئی تھی۔ دو تین مہینوں سے وینا نے عثمان کے ان دوستوں سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ عثمان باہر کسی عورت کے چکر میں الجھ گیا ہے اور گھر سے بالکل لاپرواہ ہو گیا ہے۔

"ہفتے میں ایک دو مرتبہ وہ نشے کی سی حالت میں گھر آتا ہے" ـــــ وینا نے عثمان کے دوستوں کو ایک روز بتایا ـــــ "اس پر غنودگی طاری ہوتی ہے۔ کھانا بھی نہیں کھاتا۔ میری طرف اور بچوں کی طرف بھی دھیان نہیں دیتا اور سو جاتا ہے"۔

وینا نے انہیں کچھ اور باتیں بھی بتائیں جن سے عثمان کے بدلے ہوئے رویّے کا صاف پتہ چلتا تھا۔ یہ دونوں جن میں سے ایک میجر اور ایک کیپٹن تھا' عثمان کے بڑے گہرے' بے تکلف اور ہمراز دوست تھے۔ انہوں نے وینا کی باتیں سنیں تو افسوس اور غصے کا اظہار کرنے لگے اور انہوں نے وینا سے کہا کہ وہ دیکھیں گے کہ عثمان جاتا کہاں ہے۔

○

عثمان کے دونوں دوستوں نے اگلے ہی روز سے عثمان کا تعاقب شروع کر دیا۔

تھے تو یہ دونوں بھی فوجی ہی اور میجر عثمان کی طرح ہی فوجی افسر لگتے تھے لیکن یہ وردی اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے تھے۔ وردی کے اندر بلکہ ان کے جسموں کی کھالوں کے اندر جھانک کے دیکھنے سے ہی پتہ چل سکتا تھا کہ یہ کتنے مختلف ہیں۔ عثمان کے یہ دونوں دوست عثمان سے کچھ زیادہ ہی زندہ دل اور ہنس مکھ تھے لیکن ذہنیّت اور کردار کے لحاظ سے ان میں اور عثمان میں سیاہ اور سفید یا زمین اور آسمان جیسا فرق تھا۔

یہ دونوں کھاتے پیتے اور معاشرے میں اچھا مقام رکھنے والے خاندانوں کے بیٹے تھے اور وہ عثمان کے گہرے دوست بن گئے تھے۔ ان کی دوستی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں برابر کے شریک ہوتے تھے اور ان کی دوستی ان کے گھروں تک پہنچ گئی تھی۔ یہ ایک دوسرے کی ماؤں بہنوں کو اپنی سگی مائیں بہنیں سمجھتے تھے' اور ایک دوسرے کے گھروں کے رازوں سے بھی واقف تھے۔ وینا تو ان دونوں کو اپنے سگے بھائی سمجھتی تھی۔ ان دونوں میں سے اگر کوئی اکیلا وینا کے پاس بیٹھ جاتا تو عثمان کو کبھی اعتراض نہیں ہُوا تھا۔

اب وینا نے انہیں بتایا کہ عثمان گھر سے لاتعلق ہو گیا ہے تو ان دونوں نے یوں محسوس کیا جیسے ان کی اپنی بہن کسی مشکل میں گرفتار ہو گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی انہیں پریشان کرنے لگا کہ ان کا عزیز دوست کسی جال میں پھنس گیا ہے اور انہیں معلوم بھی نہیں۔ البتہ یہ معلوم تھا کہ عثمان عیش موج کرنے والا آدمی ہے اور ان سے الگ ہٹ کر اس کی کوئی خفیہ پرائیویٹ زندگی بھی ہے۔ انہوں نے اس سے کئی بار پوچھا بھی تھا لیکن عثمان نے ہنس کر ٹال دیا تھا۔ اب وینا نے انہیں عثمان کے بدلتے ہوئے رویّے کے متعلق بتایا تو انہیں یقین ہو گیا کہ ان کا یہ دوست کسی اور ہی راستے پر جا رہا ہے۔

"عثمان سے براہِ راست بات نہ کر لی جائے؟" ـــــ عثمان کے ایک دوست کیپٹن آصف نے اس کے دوسرے دوست میجر سمیع سے کہا۔

"نہیں" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "پوچھنے سے وہ کبھی نہیں بتائے گا۔ اگر اس نے اپنی پرائیویٹ زندگی کو راز میں نہ رکھنا ہوتا تو وہ ہمیں کبھی کا بتا چکا ہوتا کہ کسی لڑکی

کے ساتھ اس کا دوستانہ چل رہا ہے"۔

"ایک بات بتاؤ" ــــ کیپٹن آصف نے پوچھا ــــ "وینا بھابی نے جو باتیں کی ہیں‘ کیا تم نے انہیں سچ مان لیا ہے؟"

"ہاں یار!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "میں نے بھابی کی ہربات کو سچ سمجھا ہے۔ تم نے نوٹ نہیں کیا جو میں کچھ عرصے سے کر رہا ہوں۔ عثمان کا کوئی الگ تھلگ اور خفیہ شغل ہے جو وہ ہم سے چھپاتا ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ وہ ڈسکو اور پاپ میوزک کا شوقین ہے اور اس کے دو تین سویلین دوستوں کو میں جانتا ہوں جو اسی قماش کے لگتے ہیں.... ہمیں جاسوسی کرنی پڑے گی"۔

○

ایک دو روز بعد شام کو عثمان کے یہ دونوں دوست عثمان کو اطلاع دیئے بغیر اس کے گھر کو جا رہے تھے۔ ان کی گاڑی ابھی عثمان کی کوٹھی سے دور ہی تھی کہ عثمان کی گاڑی کوٹھی سے نکلی اور دوسری طرف چلی گئی۔ انہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ گاڑی میں عثمان اکیلا تھا۔ کچھ فاصلہ رکھ کر انہوں نے اپنی گاڑی عثمان کے تعاقب میں ڈال دی۔ ایک تو وقت رات کا تھا اور ٹریفک بھی خاصی تھی اس لئے عثمان کو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اس کے پیچھے اس کے دوستوں کی گاڑی آ رہی ہے۔

میجر سمیع گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ صرف فوجی ہی نہیں تھا‘ اس نے کمانڈو ٹریننگ بھی لی تھی اور اب وہ ایک انفنٹری بٹالین میں تھا۔ اس کا تعاقب مکمل طور پر کامیاب تھا۔ عثمان کی گاڑی دو تین چوکوں سے گزرتی‘ موڑ کاٹتی ایک کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ میجر سمیع نے اپنی گاڑی دُور ہی روک لی پھر چند منٹ بعد اس نے گاڑی چلائی اور آہستہ آہستہ اس کوٹھی کے سامنے سے گزرا۔ کوٹھی کے گیٹ پر کوٹھی کے نمبر کے علاوہ نام کی جو پلیٹ لگی ہوئی تھی اُس پر صرف ایم اے خان لکھا ہوا تھا۔

میجر سمیع نے کوٹھی سے تقریباً ایک فرلانگ دور جا کر گاڑی سائیڈ پر کر کے پارک کر دی اور دونوں سوچنے لگے کہ یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ یہ ایم اے خان کون ہے اور اس کا عثمان کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

"ہو سکتا ہے ان کا کوئی رشتہ دار ہی ہو" ــــ کیپٹن آصف نے کہا۔

"رشتہ داری تو ان کی بڑی لمبی چوڑی ہے" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "لیکن یہاں

مجھے کچھ شک ہوتا ہے"۔

دونوں گاڑی سے نکل آئے اور گاڑی کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

"شک تو ہو سکتا ہے" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "شک یہی ہوتا ہے کہ عثمان کا کسی لڑکی کے ساتھ دوستانہ ہو گیا ہے لیکن میں سوچتا یہ ہوں کہ لڑکیاں تو باہر ملا کرتی ہیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہمارا یار لڑکی سے ملنے اس کے گھر آیا ہو"۔

"تم ابھی بچے ہو آصف!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "تمہاری نظروں میں ابھی گہرائی اور دُوربینی پیدا نہیں ہوئی۔ یہ پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ تم نے ابھی اپنی سوسائٹی کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہماری اس اپر کلاس میں ایسی بے غیرتی پیدا ہو گئی ہے کہ اپنی بیٹی کے ذریعے امیر کبیر آدمیوں کی جیبیں خالی کرتے ہیں"۔

"یہ تو طوائفوں کے ہاں ہوتا ہے" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "میں نے یہ بات سنی تو ہے لیکن ماننے کو جی نہیں چاہتا"۔

"ماننے کو اس لئے جی نہیں چاہتا کہ تم شریف اور باعزت خاندان کے بیٹے ہو" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "کیا تم نے مڈل کلاس اور اس سے بھی نیچے کی سوسائٹی کو غور سے نہیں دیکھا؟ ان لوگوں میں بھی ایسے والدین پائے جاتے ہیں جو کسی کھاتے پیتے خوشحال گھرانے کے نوجوان کو اپنی خوبصورت بیٹی کے رشتے کا لالچ دے کر پھانس لیتے ہیں اور اسے چیونٹیوں کی طرح کھانا شروع کر دیتے ہیں"۔

"یہ تو ٹھیک ہے" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "ایسے گھرانے تو میں بھی جانتا ہوں۔ وہ مڈل کلاس کے لوگ ہیں۔ انہوں نے ایک امیر کبیر ٹھیکیدار کے بیٹے کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دیا پھر شادی بھی کر دی۔ لڑکی کی ماں بڑی ہی چالاک عورت ہے۔ اس کی دو بیٹیاں اور بھی ہیں۔ خدا نے ان سب کو حسن سے نوازا ہے اور زبان کا جادُو چلانا انہوں نے خود سیکھ لیا ہے۔ شادی کے بعد انہوں نے اپنے داماد پر ایسا طلسم طاری کیا کہ لڑکے کے باپ کی آدھی آمدنی لڑکے کے سسرال جانے لگی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے"۔

"اپر کلاس میں تو یہ دھندہ کھلے عام چلتا ہے" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہم دونوں بھی اسی کلاس کے افراد ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس کلاس میں اس دھندے پر سوشل کلچر کا لیبل لگا دیا گیا ہے۔ یہ لوگ اپنی بیٹی کو اس لائن پر

ڈال کر فخر سے کہتے ہیں کہ ہماری بیٹی سوشل ہے۔ میں تمہیں شادی شدہ عورتیں دکھا سکتا ہوں جنہوں نے امیر کبیر آدمیوں کے ساتھ یاری لگا رکھی ہے اور ان کی آمدنی پر ہاتھ صاف کر رہی ہیں۔ عثمان کو تم جانتے ہو۔ اسے ہم بلاوجہ تو شہزادہ نہیں کہتے۔ ماں باپ نے اسے پیسے دے دے کر اور زیادہ بگاڑ رکھا ہے۔ مجھے شک ہے کہ اسے کسی ایسے خاندان نے گھیر لیا ہے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں"۔

"خدا ہم لوگوں پر رحم کرے" ــــ کیپٹن آصف نے آہ بھر کر کہا ــــ "ہمارا ملک امریکہ بنتا جا رہا ہے۔ ہر کوئی دولت کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اپنی عزت اور غیرت کو بھی نیلام گھر میں رکھ دیا ہے۔ فیملی پلاننگ کے محکمے نے ایسے خاندانوں کی لڑکیوں کے لئے کوئی خطرہ رہنے ہی نہیں دیا۔ برتھ کنٹرول کا سامان کھلے عام ملتا ہے...."

"ٹھہرو" ــــ کیپٹن آصف نے چونک کر کہا ــــ "وہ عثمان کی گاڑی نکلی"۔

عثمان کی گاڑی اِدھر ہی آ رہی تھی۔ میجر سمیع سڑک کے ساتھ ہو گیا۔ عثمان کی گاڑی آئی تو میجر سمیع ذرا اور آگے ہو گیا۔ عثمان نے اسے دیکھ لیا اور اس نے گاڑی روک لی۔ اس کی گاڑی پندرہ بیس گز آگے جا رکی تھی۔ وہ اتر کر میجر سمیع کی طرف دوڑا آیا۔ اس کے بازو میجر سمیع کے ساتھ بغلگیر ہونے کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ میجر سمیع نے بھی اپنے بازو پھیلا دیئے۔ دونوں دوست اس طرح ملے جیسے ایک مدت بعد ملے ہوں۔ کیپٹن آصف بھی دوڑا آیا اور ایسی ہی بے تکلفی اور پیار سے عثمان ملا۔

"ہیلو سر!" ــــ عثمان نے سمیع سے پوچھا ــــ "آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں سر؟"

"کیوں سر، سر کئے جا رہے ہو یار!" ــــ سمیع نے کہا ــــ "ہم تو ایسے ہی گھومنے پھرنے نکلے تھے۔ تم کہاں جا رہے ہو؟"

"ایک میٹنگ پر جا رہا ہوں" ــــ عثمان نے برا سا منہ بنا کر کہا ــــ "ان رشتہ داروں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے.... اوہ ڈیم اِٹ.... یہ باسٹرڈ کزن ہے۔ حکم ملا ہے کہ اسے ماڈل ٹاؤن ڈراپ کر دینا۔ اس پک اینڈ ڈراپ نے تو میری جان کھا لی ہے۔ جی چاہتا ہے گاڑی بیچ ڈالوں"۔

"یہ ایم اے خان تمہارے کوئی رشتہ دار ہیں؟"

"نو فار ریلیشن" ــــ عثمان نے کہا ــــ "دُور پار کی رشتہ داری ہے اور ان کی میرے فادر کی بڑی گہری دوستی ہے جو مجھے کبھی کبھی بڑی مہنگی پڑتی ہے"۔

"چلو پھر ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے آتے ہیں" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "اسے ڈراپ کرو اور پھر کہیں چل کر ٹائم پاس کرتے ہیں"۔

"نہ یار!" ــــ عثمان نے کہا ــــ "یہ لوگ ابھی مجھے چھوڑیں گے نہیں"۔

میجر سمیع باتیں کرتے کرتے آہستہ آہستہ عثمان کی گاڑی کی طرف چل پڑا۔ عثمان نے اس کا بازو پکڑ لیا کہ وہ اس کی گاڑی کی طرف نہ جائے لیکن آصف بھی اس کی گاڑی کی طرف چل پڑا۔ عثمان دونوں کو ظاہری طور پر روک نہیں سکتا تھا۔ اس نے کوئی بات شروع کر دی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے یہ دوست اس وقت دوست کم اور جاسوس زیادہ تھے۔ وہ نہ رکے۔ میجر سمیع نے اپنا بازو میجر عثمان کی کمر میں ڈال لیا اور کوئی بات شروع کر کے آہستہ آہستہ اسے بھی اس کی گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔

"تم یہیں ٹھہرو یار!" ــــ عثمان نے تیزی سے کہا ــــ "میں ذرا جلدی میں ہوں.... اوکے.... بائی بائی!"

میجر سمیع نے اس کی بائی بائی کی طرف توجہ ہی نہ دی اور اسے بازو کے گھیرے میں لئے ہوئے چلتا گیا اور اس کی گاڑی تک پہنچ گیا۔

گاڑی کی اگلی سیٹ پر لوسی بیٹھی تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ یہ سب اس کی طرف آ رہے ہیں تو اس نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ سوشل ہے اور سوسائٹی کے آداب جانتی ہے، گاڑی سے نکل آئی۔

"یہ میری کزن ناہید ہیں" ــــ میجر عثمان نے اپنے دوستوں سے تعارف کرواتے ہوئے کہا ــــ "اور ناہید! یہ میرے دوست میجر سمیع اور کیپٹن آصف ہیں"۔

سلام و دعا، ہیلو، ہاؤ ڈو یو ڈو کا تبادلہ ہوا۔ عثمان نے کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ کئے بغیر سمیع اور آصف سے ہاتھ ملایا، لوسی کو گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔ خود بھی گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی چلی گئی۔

"اس لڑکی کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے" ــــ سمیع نے آصف سے کہا ــــ "اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ دو تین آدمیوں نے اس لڑکی کے متعلق ایسے ریمارک کس دیئے تھے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کوئی شریف لڑکی نہیں۔ میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ عثمان کی کزن نہیں"۔

"یہ تو وینا بھابی بتا دے گی" ــــ آصف نے کہا ــــ "اس سے پوچھ لیں گے کہ

فلاں کوٹھی میں ان کا ایم اے خان نام کا کوئی رشتہ دار رہتا ہے"۔

"یہ ٹھیک کہا تم نے" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "وینا بھابی سے ہی پوچھ لیں گے۔ پہلے یہ تو دیکھ لیں ماڈل ٹاؤن جا رہا ہے یا کہیں اور"۔

سمیع اور آصف یہ باتیں اپنی گاڑی میں بیٹھے کر رہے تھے اور ان کی گاڑی کچھ فاصلہ رکھ کر عثمان کی گاڑی کے پیچھے جا رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ماڈل ٹاؤن کی طرف مڑنے کی بجائے عثمان کی گاڑی دوسری طرف مڑ گئی تھی۔ میجر سمیع نے فاصلہ ذرا اور زیادہ کر دیا۔ دونوں کی نظر عثمان کی گاڑی پر تھی۔ جاتے جاتے عثمان کی گاڑی فورٹریس سٹیڈیم کے اندر مڑ گئی اور اسی ریستوران کے سامنے جا رکی جہاں وہ اکثر جایا کرتے تھے۔

میجر سمیع اور کیپٹن آصف گاڑی اسی ریستوران سے دور پارک کر کے باہر کھلے لان میں جا بیٹھے اور عثمان کے نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

عثمان اور لوسی ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت بعد ریستوران سے نکلے، گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔ سمیع اور آصف نے اپنی گاڑی میں ان کا تعاقب کیا۔ عثمان کی گاڑی پھر ایم اے خان کی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ میجر سمیع اپنی گاڑی آگے لے گیا اور ایک جگہ روک کر دونوں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پیچھے دیکھنے لگے۔ عثمان کی گاڑی کوٹھی سے نکلی اور دوسری طرف چلی گئی۔ اس کے دونوں دوستوں نے نے دیکھا کہ عثمان گاڑی میں اکیلا تھا۔ اب تو کوئی شک ہی نہ رہا۔

اگلے روز میجر سمیع نے عثمان کے گھر فون کیا۔ اس وقت عثمان اپنے آفس میں تھا۔ وینا نے فون سنا۔ سمیع نے وینا سے پوچھا کہ فلاں جگہ فلاں نمبر کی کوٹھی میں رہنے والا ایم اے خان آپ کا کیا لگتا ہے۔

"نہیں بھائی جان!" ــــ وینا نے کہا ــــ "ہمارے رشتہ داروں میں کوئی ایم اے خان نہیں اور جو جگہ آپ بتا رہے ہیں اُس طرف تو ہماری رشتہ داری یا برادری کا کوئی آدمی نہیں رہتا..... کیوں بھائی جان! آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

سمیع ابھی اسے بتانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن وینا نے اتنی ضد کی کہ سمیع کو بتانا پڑا۔

"عثمان کو ہم نے اس کوٹھی میں جاتے دیکھا ہے" ــــ میجر سمیع نے وینا کو بتایا ــــ "آپ کا شک ٹھیک ہے لیکن میری ایک بات مان لیں۔ آپ عثمان سے باز پُرس نہ کرنا،

انجان بنی رہنا تاکہ اسے یہ پتہ نہ چلے سکے کہ اس کا راز کھل گیا ہے، پھر وہ محتاط ہو جائے گا اور ہم اسے پکڑ نہیں سکیں گے۔ آپ یہ کام ہم پر چھوڑیں..... یہ بتائیں کہ گزشتہ رات عثمان نے کھانا گھر کھایا تھا؟"

"نہیں بھائی جان!" ــــ وینا نے جواب دیا ــــ "کہتے تھے پیٹ بڑا سخت خراب ہے اس لئے آج کچھ بھی نہیں کھاؤں گا پھر وہ باہر نکل گئے تھے"۔

"بھابی جان!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "میں آپ کو بڑی سختی سے ایک بار پھر کہتا ہوں یہ عثمان پر آپ ظاہر ہی نہ ہونے دیں کہ آپ کو اس پر کچھ شک ہے۔ اس کی بے رخی اور وہ تمام رویّہ جو آپ کو ناگوار گزرتا ہے وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتی رہیں"۔

وینا نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں سمیع کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے گی۔



میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے اگلے چودہ پندرہ دنوں میں دو تین مرتبہ اسی طرح میجر عثمان کا تعاقب کیا۔ ایک بار اسے ایم اے خان کی کوٹھی میں داخل ہوتے اور لوسی کو ساتھ لئے ایک ہوٹل میں جاتے دیکھا۔ ایک بار عثمان کوٹھی میں داخل ہُوا۔ سمیع اور آصف ایک گھنٹہ باہر کھڑے رہے۔ عثمان نہ نکلا اور پھر ایک بار عثمان لڑکی کو ساتھ لئے کہیں اور چلا گیا۔ ٹریفک کے رش کی وجہ سے اس کے یہ دونوں دوست اس کا تعاقب نہ کر سکے۔

ایک روز میجر سمیع اس علاقے میں اپنے کسی کام سے گیا۔ چھٹی کا دن تھا۔ سمیع نے جہاں اپنی گاڑی پارک کی وہاں سے ایم اے خان کی کوٹھی سامنے نظر آ رہی تھی۔ وہ ویسے ہی ٹہلتا ٹہلتا اس کوٹھی کے گیٹ کے سامنے سے گزرا پھر اگلے گیٹ کے سامنے سے گزرا اور واپس آ گیا۔ گیٹ کے سامنے رک کر اس نے اندر دیکھا پھر آہستہ آہستہ آگے کو چلا پھر رُکا اور پیچھے کو مڑا۔ ساتھ والی کوٹھی کے گیٹ پر ایک معزز صورت ضعیف العمر آدمی کھڑا تھا۔ وہ کوئی باوقار شخصیت لگتا تھا۔ وہ سمیع کو دیکھ رہا تھا۔ سمیع بھی خوبرو اور خوش پوش جوان تھا۔ وہ جب ایک بار پھر ایم اے خان کی کوٹھی کے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا تو اسے آواز سنائی دی۔

"کیوں بیٹا!" ــــ یہ اُس معزز بوڑھے کی آواز تھی۔

سمیع نے ادھر دیکھا۔ بوڑھا اس سے مخاطب تھا۔

"کسی کا گھر تلاش کر رہے ہو؟"

"ہاں انکل!" ___ سمیع نے بوکھلا کر جواب دیا جیسے وہ پکڑا گیا ہو ___ "یہ کوٹھی دیکھ رہا ہوں۔ معلوم نہیں یہ کون ایم اے خان صاحب ہیں.... آپ تو انہیں جانتے ہوں گے۔ یہ کون لوگ ہیں؟"

"پہلے یہ بتاؤ" ___ اس بزرگ نے پوچھا ___ "کیا یہ لوگ تمہارے رشتہ دار ہیں؟"

"نہیں انکل!" ___ سمیع نے اُکھڑی اُکھڑی سی آواز میں جواب دیا ___ "میں انہیں زیادہ نہیں جانتا"۔

بوڑھے نے سمیع کے ساتھ کچھ اور باتیں بھی کیں۔ سمیع نے بھی باتیں کیں۔ بوڑھے نے سمیع کے لب و لہجے سے کچھ محسوس کیا اور اس کے بوڑھے ہونٹوں پر تبسم سا آ گیا۔ یہ بزرگ عمر کے اُس مقام تک پہنچ گیا تھا جہاں موقع بے موقع تجسس پیدا ہو جاتا ہے اور زبان بے قابو ہو کر کچھ نہ کچھ بولنے لگتی ہے۔ اس عمر میں انسان بے خوف اور نڈر ہو جاتا ہے۔ اس بزرگ نے سمیع کا انداز دیکھ کر ایسی ہی بے خوفی اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔

"ایک بات بتاؤ بیٹا!" ___ بوڑھے نے کہا ___ "اگر تم ان لوگوں کو نہیں جانتے تو یہاں کیوں آئے ہو؟.... معاف رکھنا' میں تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دے رہا ہوں لیکن کچھ سوچ اور کچھ سمجھ کر.... اس کوٹھی میں تم جیسے نوجوان اور جوان آدمی آتے ہی رہتے ہیں اور میرا خیال ہے وہ سب ان کے رشتہ دار نہیں ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے تم بھی انہی جوانوں میں سے ہو"۔

"انکل!"

"مجھے انکل نہ کہو تو کتنا اچھا لگے" ___ بوڑھے نے بڑے پیارے لہجے میں کہا ___ "ہم اُس دَور کے آدمی ہیں جب انکل کا لفظ انگریزی میں پڑھا تھا تو یہ مجھ جیسے نالائق طالب علموں کو بہت برا لگا تھا کیونکہ ہمیں اس کے سپیلنگ (ہجے) یاد نہیں رہتے تھے۔ میں انکل کو ہمیشہ یو این سی اے ایل لکھا کرتا اور ماسٹر سے ایک دو تھپڑ کھایا کرتا تھا۔ ویسے ہی انکل کا لفظ سن کر گورے بادشاہ یاد آ جاتے ہیں یا ذہن میں انکل سام آ جاتا ہے۔۔۔

دونوں چیزیں مجھے بہت بُری لگتی ہیں"۔

ضعیف العمری کے اثرات کے تحت اس بزرگ کی زبان بے قابو ہو گئی تھی۔ سمیع خاصا ذہین فوجی افسر تھا۔ اس نے ہنس کر بوڑھے کی زبان کی باگیں کھینچ لیں۔

"بابا جان کہہ لوں؟" ___ سمیع نے اس بزرگ سے پوچھا ___ "یا جو آپ کو اچھا لگے"۔

"ہاں یہ بات!" ___ بوڑھے نے کہا ___ "بابا جان کتنا پیارا لفظ ہے.... اب بات کرو"۔

"دراصل بابا جان!" ___ سمیع نے کہا ___ "بات یہ ہے کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ ایم اے خان کون ہیں۔ اگر یہ آپ کے کوئی عزیز یا دوست ہیں تو پھر میں بات نہیں کروں گا"۔

"اندر آ جاؤ!" ___ بوڑھے نے سمیع سے کہا اور اسے اندر لے گیا اور لان میں رکھی ہوئی کرسیوں پر دونوں جا بیٹھے۔ بوڑھے نے کہا ___ "یہ میرے کچھ نہیں لگتے.... کیا تم سی آئی ڈی کے آدمی ہو یا ملٹری انٹیلی جنس کے؟ تمہاری ڈیل ڈول بتاتی ہے کہ تم پولیس کے آدمی ہو یا فوج کے"۔

"نہ بابا جان نہ!" ___ میجر سمیع نے جواب دیا ___ "میں فوج کا آدمی نہیں نہ پولیس کے ساتھ میرا کچھ تعلق ہے۔ میں آپ کے ساتھ صاف بات کر دوں۔ میرا ایک دوست اس کوٹھی میں آتا ہے اور یہاں سے ایک لڑکی کو گاڑی میں بٹھا کر چلا جاتا ہے۔ وہ شادی شدہ ہے اور اس لڑکی کے ساتھ اس نے تعلقات پیدا کر رکھے ہیں"۔

"اور تم جاننا چاہتے ہو کہ یہ کون لوگ ہیں" ___ بوڑھے نے سمیع کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا ___ "اس کوٹھی میں آدمی آتے ہی رہتے ہیں۔ ان میں عورتیں بھی ہوتی ہیں اور مرد بھی۔ آمد و رفت کا یہ سلسلہ رات کو کچھ زیادہ ہو جاتا ہے۔ تمہاری طرح میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ میں پرانے وقتوں کا آدمی ہوں جب لوگ ایک دوسرے کو اس لئے جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ آپس کا پیار بڑھے اور ہو سکتا ہے اس اجنبی کو کسی چیز کی ضرورت ہو مگر آج وہ زمانہ آ گیا ہے کہ ایک گھر میں میت پڑی ہے اور ساتھ والے گھروں سے فلمی گانوں اور انگریزی میوزک کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ دیکھ لو ان کی اور ہماری کوٹھی کی دیوار سانجھی ہے لیکن ہم ایک دوسرے کو جانتے اور

پہچانتے ہی نہیں.... کیا تم اپنے دوست کے متعلق اس لئے پریشان ہو کہ وہ اس کوٹھی میں آتا ہے؟"

"ہاں بابا جان"۔

"یہ کوئی مشکوک قسم کے لوگ ہیں" —— بزرگ نے کہا —— "بہت بُرا لگتا ہے کہ کسی شہادت اور ثبوت کے بغیر کسی کے خلاف کوئی بات کی جائے لیکن اس کوٹھی کی سرگرمیاں کچھ ایسی پُراسرار سی ہیں کہ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ جو کوئی بھی ہیں، شریف لوگ نہیں۔ یہ عصمت فروش ہو سکتے ہیں۔ آج کل عصمت فروشی بھی نئے کلچر کا حصہ بن گئی ہے۔ رنڈیوں کے بازار کی طرح اب عصمتوں کے سودے نہیں ہوتے البتہ لین دین کسی اور طریقے سے ہوتا ہے اور یہ لوگ اپنے آپ کو اونچی اور مہذب سوسائٹی کے افراد کہلاتے ہیں.... مجھے یہ سمگلر بھی نظر آتے ہیں لیکن سمگلروں کی حرکتیں ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ دیکھو بیٹا! میں نے یہ بال دھوپ میں بیٹھ کر سفید نہیں کئے۔ میں خاندانی لحاظ سے زمیندار ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم سے خاصی زیادہ زرخیز اراضی کا مالک ہوں۔ اس کے علاوہ میں انگریزوں کے وقتوں کا ریٹائرڈ صوبیدار میجر ہوں۔ جنگ عظیم کے زمانے میں مَیں انٹیلی جنس میں بھی رہ چکا ہوں۔ فوجی سے مراد یہ نہیں کہ میں ان پڑھ تھا جیساکہ انگریزوں کے زمانے میں فوجی ہُوا کرتے تھے۔ میں کچھ پڑھا لکھا بھی ہوں۔ مجھے یہ لوگ مشکوک لگتے ہیں"۔

"میں یہی جاننا چاہتا تھا" —— میجر سمیع نے چونک کر کہا —— "بابا جان! اگر آپ میری مدد کریں تو یہ بہت بڑی نیکی ہوگی.... میں اب آپ کو اپنے متعلق سچّی بات بتا سکتا ہوں۔ میں پاک آرمی میں انفنٹری میں ہوں اور میں میجر ہوں"۔

"اوہ بسم اللہ!" —— بوڑھے نے اشتیاق سے سمیع کا ایک ہاتھ پکڑ کر چوما اور بولا —— "پھر تو تم میرے سگے بیٹے ہو"۔

"ضروری نہیں کہ یہ لوگ سمگلر یا جاسوس ہی ہوں" —— میجر سمیع نے کہا —— "ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا یہ دوست اس کوٹھی کی ایک لڑکی کے جال میں آگیا ہے۔ اس کا سب سے پہلا برا اثر تو اس کے اپنے ہی گھر پر پڑا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس کی توجہ اپنی بیوی اور بچوں سے ہٹ گئی ہے۔ توجہ بھی ایسی ہٹی ہے کہ ان سے اکتایا اُکتایا سا لگتا ہے جیسے ایک بیوی اور دو بچوں کا بوجھ سزا کے طور پر اس پر ڈال دیا گیا ہو۔ میرا یہ دوست

بیوی بچّوں سے دُور ہی دُور ہٹتا چلا جارہا ہے بلکہ یوں کہئے کہ وہ گُم ہوگیا ہے"۔

"میں سمجھتا ہوں" —— بزرگ نے کہا —— "میں اس کوٹھی کی لڑکیوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ دو تین لڑکیاں ہیں۔ ان کے حسن و جمال اور ناز و انداز میں وہ جادو صاف نظر آتا ہے جو بیٹوں کو ماؤں بہنوں کے لئے اور خاوندوں کو بیویوں کے لئے اور باپوں کو بچّوں کے لئے گُم اور لاپتہ کرسکتا ہے"۔

"اور بابا جان!" —— میجر سمیع نے کہا —— "دوسرا نقصان مالی ہے۔ ہمارا یہ دوست بڑے امیر باپ کا بیٹا ہے۔ اپنی تنخواہ تو اُڑا ہی دیتا ہے، ماں باپ سے بھی اچھی خاصی رقم لے کر کھا پی جاتا ہے"۔

"کھا پی نہیں جاتا" —— بوڑھے نے کہا —— "کھلا پلا دیتا ہے۔ میں نے ایسے بے شمار جوان دیکھے ہیں۔ ان سے کھانے پینے والے انہیں شہزادے کہتے ہیں اور اتنی ہوا دیے رکھتے ہیں کہ وہ غباروں کی طرح فضاؤں میں اُڑتے رہتے ہیں"۔

"آپ نے ٹھیک فرمایا باباجان!" —— میجر سمیع نے کہا —— "میرے دوست کی بیوی یوں ہے جیسے میری سگی بہن ہو۔ نقصان صرف یہ نہیں کہ میرا دوست اپنی اتنی اچھی ازدواجی زندگی کو تباہ کر رہا ہے، اس کے ساتھ دوسرا نقصان مالی ہو رہا ہے۔ اس شخص کے بچّوں کا مستقبل تباہ ہو رہا ہے.... اگر آپ انٹیلی جنس میں رہے ہیں تو آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ میں اپنا مقصد ذرا اور واضح کردوں۔ میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں، میں اس کوٹھی سے اپنے دوست کو رہا کرانا چاہتا ہوں"۔

"کیا تم نے اس کے ساتھ براہ راست بات نہیں کی؟" —— بزرگ نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" —— میجر سمیع نے جواب دیا —— "میں نے اور میرے کیپٹن دوست نے اس سے اشاروں اشاروں میں پوچھا ہے وہ صاف جھوٹ بول جاتا ہے"۔

"اُس کے لئے جھوٹ بولنا ضروری ہوگیا ہے" —— بوڑھے نے کہا —— "جس شخص کی پرائیویٹ زندگی اُس بیہودہ راستے پر چل پڑے وہ تو خُدا کے حضور بھی جھوٹ بولتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس نے خدا کو بھی بڑی کامیابی سے دھوکہ دے دیا ہے.... تم کہتے ہو کہ یہ لوگ مشکوک ہیں یا نہیں، اور تمہیں ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ مجھے ان لوگوں کے ساتھ یہی ایک دلچسپی ہے کہ یہ مجھے مشکوک نظر آتے ہیں اور یہ جاسوس بھی ہو سکتے ہیں۔ بہرحال میں اب انہیں اسی شک میں دیکھوں گا

اور کوشش کروں گا کہ ان کی اصلیت کا پتہ چل جائے"۔

میجر سمیع اس بزرگ سے اتنا زیادہ متاثر ہُوا کہ اس کا وہاں سے اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ معزز بوڑھا چہرے مہرے سے بات کرنے کے انداز سے، اور اس کی باتوں میں جو عقل و دانش تھی، اس سے بھی اپنے آپ میں ایسی طاقت رکھتا تھا جو دوسروں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ یہ بوڑھا تھا ہی دانشمند۔ اس نے سمیع کے ساتھ بہت باتیں کی تھیں اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس نے کتابیں نہیں پڑھیں، انسانوں کو زیادہ پڑھا ہے۔ اس نے انسانوں کو چہروں سے نہیں بلکہ ان کے ضمیر کو بے پردہ کر کے پہچانا تھا۔ یہ وہ علم تھا جو سکّہ بند عالموں کے پاس بھی نہیں ہوتا۔

میجر سمیع کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کے دو بیٹے ہیں جو کوئی پرائیویٹ کاروبار کرتے ہیں۔ بوڑھے کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اس نے میجر سمیع سے کہا کہ اس کا اپنا شغل یہی رہ گیا ہے کہ گیٹ پر کھڑا سڑک سے گزرتے لوگوں کو دیکھتا رہتا ہے۔

"شک کی نظروں سے؟" — میجر سمیع نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" — بوڑھے نے بے ساختگی سے کہا — "آج جو بات تم نے مذاق کے لہجے میں کہی ہے وہ میری عمر میں پہنچ کر تم بڑی سنجیدگی سے کہا کرو گے" — بوڑھے نے سمیع کی طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہا — "دیکھ بیٹا! اجنبی کو اور ہر اُس انسان کو جسے تو پُوری طرح نہیں جانتا، شک و شبے کی نظر سے دیکھ بلکہ جنہیں تُو جانتا ہے انہیں بھی اُس وقت تک شک کی نگاہوں سے دیکھ جب تک اس کی اصلیت تیرے آگے کھل کر نہیں آ جاتی۔ آج کا زمانہ روپ بہروپ کا زمانہ ہے، انسان باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور ہوتے ہیں۔ اپنے دوست ہی کی مثال اپنے سامنے رکھو۔ ان لوگوں نے اس پر یہ ظاہر کیا ہو گا کہ وہ بڑے ہی شریف اور باعزت لوگ ہیں لیکن نظر یہی آتا ہے کہ یہ لوگ کسی اور چکر کے لوگ ہیں۔ انٹیلی جنس اور پولیس کا بنیادی اصول یہی ہوتا ہے کہ ہر کسی کو شبے کی نگاہ سے دیکھو.... میں نے تجھے اس کوٹھی کے سامنے سے گزرتے دیکھا، تمہاری رفتار کم ہوئی، پھر تم واپس آئے تو میں سمجھ گیا کہ یہ لڑکا کچھ ڈھونڈ رہا ہے لیکن تم نہ سمجھ سکے کہ تجھے کوئی شک کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے"۔

میجر سمیع جب وہاں سے لوٹا تو اس کا ذہن خاصا صاف ہو چکا تھا اور اسے ایک ایسا جذباتی سہارا مل گیا تھا جس نے اس میں اخلاقی جرأت پیدا کر دی تھی۔

○

اگلی ہی شام میجر سمیع نے میجر عثمان کو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں فون کیا اور کہا کہ آج شام کہیں باہر گذارنی چاہیے۔

"آ جاؤ" — میجر عثمان نے کہا — "بتاؤ کون سے ہوٹل میں چلو گے؟"

"تمہارے دماغ میں ہوٹل کے سوا کچھ اور رہا ہی نہیں" — میجر سمیع نے کہا — "رات کھانا کھا کر.... ساڑھے آٹھ، نو کے درمیان لارنس گارڈن کے مال روڈ والے گیٹ پر آ جانا"۔

رات نو بجے میجر عثمان، میجر سمیع اور کیپٹن آصف لارنس گارڈن میں پتھر کے ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"آج ہم تم سے ایک خاص بات کرنا چاہتے ہیں عثمان!" — میجر سمیع نے کہا — "اگر ہمیں اپنا عزیز دوست سمجھتے ہو تو ہم بات کریں گے اور اگر تم ہمیں اتنی اہمیت نہیں دیتے تو بتا دو۔ تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا ہمیں کوئی حق نہیں"۔

"نان سینس!" — عثمان نے بے تکلفی سے کہا — "یہ کیا فضول باتیں شروع کر دی ہیں۔ کہو کیا کہنا ہے۔ میرے ذاتی معاملات صرف میرے نہیں، یہ تمہارے بھی ہیں ...کم آن سپیک اَپ"۔

"وہ ایم اے خان کون ہے؟" — سمیع نے پوچھا۔

"کس ایم اے خان کی بات کر رہے ہو؟" — عثمان نے انجان سا بن کر پوچھا۔

"جس کی کوٹھی میں تم جاتے ہو" — سمیع نے کہا۔

"اور وہاں سے ایک لڑکی کو گاڑی میں بٹھا کر باہر نکل جاتے ہو" — کیپٹن آصف نے کہا۔

"اوہ، ڈیش اِٹ!" — عثمان نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا — "یار، میں اپنی اس بیوی سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ اس نے تم دونوں کو اسی وہم میں مبتلا کر دیا جس میں وہ خود مبتلا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ایک دو مرتبہ شام کو میری غیر حاضری میں میرے گھر گئے تھے۔ وائف نے مجھے بتایا تھا.... بڑی وہمی لڑکی ہے۔ مجھے صرف اس ایک سوال سے پریشان کئے رکھتی ہے کہ تم شام کو کسی عورت کے پیچھے نکل جاتے ہو وہ عورت کون ہے"۔

"لیکن ہم دونوں اس وہم کو یقین میں بدل چکے ہیں" ـــــ میجر سمیع نے کہا۔

"ہم نے جو چیز اپنی آنکھوں دیکھ لی ہے' اسے ہم وہم کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"کیا دیکھا ہے تم نے؟" ـــــ عثمان نے پوچھا۔

سمیع اور آصف نے جو دیکھا تھا وہ عثمان کو سنا دیا۔ اسے یہ نہ بتایا کہ انہوں نے اس کا تعاقب کیا تھا بلکہ یہ کہا کہ وہ اتفاق سے اُدھر سے گزر رہے تھے۔

"بات کچھ بھی نہیں یار!" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "اس لڑکی کا منگیتر میرا دوست ہے۔ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ میں اسے ملنے جایا کرتا ہوں"۔

"یہ کون لوگ ہیں!" ـــــ میجر سمیع نے پوچھا ـــــ "کیا یہ یہیں کے رہنے والے ہیں؟ کرتے کیا ہیں؟"

"بڑی ڈیسنٹ فیملی ہے یار!" ـــــ عثمان نے بتایا ـــــ "ان کے بڑے لمبے چوڑے کاروبار ہیں"۔

عثمان کے ان دونوں دوستوں نے اس کے ساتھ بہت باتیں کیں' بہت سوال پوچھے لیکن عثمان جھوٹ بولتا چلا گیا۔ انہوں نے اسے یہ بھی یاد دلایا کہ ایک رات ان دونوں نے اسے اس لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا اور اس نے ان کے ساتھ لڑکی کا تعارف بھی کرایا تھا۔

"دیکھو عثمان!" ـــــ سمیع نے کہا ـــــ "ہم تمہارے دوست ہیں۔ تم نے خود کہا ہے کہ تمہارے ذاتی معاملات ہمارے معاملات ہیں تو ہمیں دوستی کا حق ادا کرنے دو"۔

"یہ وہم دل سے نکال دو کہ وینا بھابی نے ہمیں تمہارے رویّے کے متعلق کچھ بتایا ہے۔ ہم نے یہ ضرور محسوس کیا ہے کہ بھابی کچھ پریشان ہے" ـــــ کیپٹن آصف نے کہا ـــــ "میں تو بھابی سے پوچھنے لگا تھا کہ وہ اتنی گھبرائی گھبرائی اور اتنی نروس کیوں ہیں لیکن میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ پھر جب ہم نے تمہیں کسی اور ہی راستے پر جاتے دیکھ لیا تو ہم سمجھ گئے کہ ہماری بھابی کی پریشانی کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے معلوم ہے کہ تم کہیں اور رومان لڑا رہے ہو"۔

"اگر بھابی کو ابھی معلوم نہیں ہُوا تو چند دنوں تک معلوم ہو جائے گا" ـــــ سمیع نے کہا ـــــ "ہم تمہیں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس چکر سے نکل آؤ۔ یہ بھی تو معلوم نہیں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اتنی خوبصورت ازدواجی زندگی کو تباہ نہ کرو"۔

عثمان نے دوستوں کی بات سننے کی بجائے اپنی بیوی کے نقائص بیان کرنے شروع کر دیئے۔ ان نے سب سے بڑا جو نقص بیان کیا وہ یہ تھا کہ وہ گھریلو عورت بن گئی ہے اور سوشل نہیں ہوئی۔

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری بیوی بھی اسی سوسائٹی میں گھومے پھرے اور غیر مردوں کے ساتھ فری ہو جائے" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "کیا تم اس سوسائٹی کو نہیں جانتے؟"

"جانتا کیوں نہیں!" ـــــ کیپٹن آصف نے کہا ـــــ "یہ خود اسی سوسائٹی کا آدمی ہے' اور یہ جانتا ہے کہ اس سوسائٹی میں نوجوان بیویوں' بہنوں اور سالیوں کے تبادلے کس طرح کئے جاتے ہیں"۔

میجر سمیع نے بھی عثمان کو بڑی تیکھی اور چُبھتی ہوئی باتیں کہہ ڈالیں۔ کیپٹن آصف نے تو اور زیادہ تلخ باتیں کہیں لیکن عثمان اس قدر پتھر ہو چکا تھا کہ وہ ہنس ہنس کر دونوں دوستوں کو ٹالتا رہا۔

"اب میں تمہیں ایک نازک سی بات کہنے لگا ہوں" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "وینا بھابی نے ہمیں اس معاملے میں اور تو کچھ نہیں بتایا صرف یہ بتایا ہے کہ تم جب گھر جاتے ہو تو اکثر ہوتا یوں ہے کہ تم غنودگی کی حالت میں ہوتے ہو اور بڑی جلدی سو جاتے ہو"۔

"ہاں یار!" ـــــ میجر عثمان نے کہا ـــــ "وہ ٹھیک کہتی ہے۔ معلوم نہیں کیا بات ہے کہ مجھے بڑی جلدی نیند آ جاتی ہے"۔

"اب ہماری بات ذرا خلوص نیت سے سننے کی کوشش کرو" ـــــ سمیع نے کہا ـــــ "تم نہیں جانتے کہ تمہیں اتنی جلدی نیند کیوں آ جاتی ہے۔ یہ بتاؤ تمہاری یہ حالت ایم اے خان کی کوٹھی میں جانے سے پہلے بھی ہوا کرتی تھی؟.... میرا خیال ہے اس سے پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا"۔

"لگتا کچھ ایسا ہی ہے" ـــــ عثمان نے دبی دبی سی آواز میں کہا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ فیصلہ نہ کر سکا ہو کہ یہ اعتراف کرے یا نہ کرے۔

"دیکھ عثمان بھائی!" ـــــ سمیع نے کہا ـــــ "تم مانو نہ مانو' خود غور کرو کہ جس رات تم ایم اے خان کے ہاں جاتے ہو اور اُس لڑکی کے ہاتھ سے کچھ کھاتے پیتے ہو تو اُس

رات تمہیں گھر آتے ہی نیند آجاتی ہے اور تم عجیب سا سرور محسوس کرتے ہو"۔

"نہ یار!" ــــ عثمان نے کہا اور چپ ہو گیا۔ پھر کچھ سوچنے لگا اور بولا ــــ "کبھی تو ... نہیں نہیں.... ایسا تو نہیں ہوتا" ــــ اس کے بولنے کا انداز صاف مشکوک لگ رہا تھا۔ اچانک بیدار ہو گیا ــــ "بات صاف کرو یار! تم کہنا کیا چاہتے ہو"۔

"ہم بڑے ہی خطرناک شک کے پیشِ نظر بات کر رہے ہیں" ــــ سمیع نے کہا ــــ "تم جن کے ہاں جاتے ہو وہ مشکوک لوگ ہیں۔ میں تمہیں صاف الفاظ میں بتاتا ہوں کہ جس لڑکی کے جال میں تم آئے ہوئے ہو' اسے تمہارے ساتھ کوئی جذباتی لگاؤ نہیں۔ اسے اس عیاشی سے دلچسپی ہے جو تم اسے کراتے ہو یا اس کا مقصد کچھ اور ہے اور تم اسے عشق و محبت سمجھ رہے ہو۔ تم بریگیڈ میجر ہو۔ تم میں کوئی قابلیت دیکھ کر ہی بریگیڈ میجر بنایا گیا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ انٹیلی جنس والے، مشتبہوں اور ملزموں سے اقبال جرم کرانے اور ان کے ساتھیوں کی نشاندہی کرانے کے لئے انہیں ٹارچر نہیں کرتے بلکہ ان کے کھانے میں ٹرانکولائزر ملا دیتے ہیں۔ یہ طریقہ امریکہ کی سی آئی اے نے دریافت کیا ہے جو ہمارے ملک تک بھی پہنچ گیا ہے"۔

"آئی نو دیٹ.... بس بس!" ــــ عثمان نے کہا ــــ "مجھے معلوم ہے"۔

"سب سے زیادہ خطرناک چیز جو انٹیلی جنس والے تفتیش میں استعمال کرتے ہیں وہ ایل ایس ڈی ہے" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "یہ جس کے اندر چلی جاتی ہے وہ بڑا پیارا سرور محسوس کرنے لگتا ہے۔ ذہنی طور پر وہ سو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ بیدار ہے۔ اس کیفیت میں اس کے سامنے جو بھی بات کرو وہ اسے قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ برین واشنگ کا بہترین طریقہ ہے جسے امریکہ کی سی آئی اے نے بڑی کامیابی سے آزمایا ہے"۔

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس کوٹھی میں میری اس طریقے سے برین واشنگ ہو رہی ہے؟" ــــ میجر عثمان نے پوچھا۔

"ہاں" ــــ سمیع نے کہا ــــ "ہم یہی کہنا چاہتے ہیں اور یہی ہمارا شک ہے"۔

"اوہ' سٹوپڈ!" ــــ عثمان نے بے رُخی سے کہا ــــ "دِس از آل نان سینس!"

"اللہ نہ کرے کہ تمہارے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہو" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "لیکن ہم تمہیں خبردار کرتے ہیں کہ ٹرانکولائزر کے ذریعے جو برین واشنگ کی جاتی ہے اس کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اس آدمی یا عورت کو اپنا مخلص دوست اور غمخوار

سمجھنے لگتا ہے جو اسے یہ نشہ دیتا ہے' حالانکہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اسے نشہ پلایا جا رہا ہے"۔

"سوچ عثمان!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "بی سیریس .... یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اس عمر میں شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی کسی لڑکی کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کر لینا کوئی ایسی بات نہیں لیکن اپنا دماغ' اپنی حسیں اور اپنی ازدواجی زندگی کی مسرتیں اس لڑکی کے حوالے کر دینا بڑا ہی خطرناک فعل ہے جس کی سزا بیوی کی نسبت بچوں کو زیادہ ملتی ہے"۔

عثمان ایسے مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں مخلصانہ باتیں بہت بُری لگا کرتی ہیں اور ہر وہ انسان بُرا لگتا ہے جو اس خطرے سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے دوستوں کی اتنی زیادہ باتیں سن کر بھی عثمان پر کچھ اثر نہ ہُوا بلکہ اس کا انداز کچھ طنزیہ سا تھا جیسے ان دوستوں کو پسماندہ سمجھ رہا ہو۔

یہ دوست کسی نتیجے پر پہنچے بغیر جب وہاں سے اٹھے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔

میجر عثمان جب گھر پہنچا تو وینا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے عثمان سے رسمی طور پر بھی نہ پوچھا کہ وہ اتنی دیر کہاں رہا ہے اور کیا وہ ٹھیک تو ہے۔ وہ جانتی تھی کہ عثمان نے اپنا دل گھر سے ہٹا کر کہیں اور لگا لیا ہے۔

"تم نے مجھے میرے دوستوں میں ذلیل کرنا شروع کر دیا ہے" ــــ عثمان نے وینا سے کہا ــــ "میں یہ ذلّت برداشت نہیں کروں گا"۔

"کون سے دوستوں کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"میں زیادہ بکواس نہیں سنوں گا" ــــ عثمان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اور زیادہ بکواس سننے کی عادت مجھ میں بھی نہیں عثمان صاحب!" ــــ وینا نے دو ٹوک لہجے میں کہا ــــ "آپ نے لڑائی جھگڑے کو روزمرّہ کی روٹین بنا لیا ہے لیکن میں اس روٹین کو کسی فیصلے پر پہنچا دوں گی"۔

وینا کا لہجہ انداز کچھ ایسا دو ٹوک تھا کہ عثمان پہلی بار دبک سا گیا۔ شاید اس لئے کہ اس کے ضمیر پر جرم کا بوجھ تھا۔

"میری یہ بات غور سے سن لیں" ــــ وینا نے کہا ــــ "میں اتنی گھٹیا اور اوچھی نہیں کہ آپ کے دوستوں کے سامنے اپنے گھر کی عزت اور وقار سے پردے اٹھاتی

پھروں"۔

عثمان نے رسمی طور پر لڑائی جھگڑا کیا لیکن اس رات اُس کی باتوں میں وہ جان نہیں تھی جو ہُوا کرتی تھی۔ وینا پریشان تو تھی لیکن اس نے عثمان کی اس بک بک جھک جھک کو اہمیت دینا اور اس کا اثر قبول کرنا چھوڑ دیا تھا۔

"میری ایک بات مان لو وینا!" ___ عثمان نے نرم سے لہجے میں کہا ___ "بات کچھ بھی نہیں۔ تم ایک وہم میں مبتلا ہو۔ یہ وہم صرف اس صورت میں ختم ہو سکتا ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلا کرو پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ میں تمہارے ساتھ بے وفائی کر رہا ہوں یا نہیں۔ میرے ساتھ سوسائٹی میں گھومو پھرو، اٹھو بیٹھو۔ گھر میں بند رہ رہ کر تم نے اپنے ذہن کی وسعت کو محدود کر لیا ہے"۔

"تمہاری سوسائٹی میں؟" ___ وینا نے طنزیہ سے لہجے میں پوچھا ___ "اس سوسائٹی میں جس میں تم مجھے شادی کے فوراً بعد لے گئے تھے؟"

"نہیں" ___ عثمان نے مفاہمت کے لہجے میں کہا ___ "وہ سوسائٹی تو میں کبھی کی چھوڑ چکا ہوں۔ خدا کی قسم میں تمہیں بڑے اچھے گھرانوں میں لے جاؤں گا۔ اپر کلاس کے لوگ ہیں"۔

"میں ہر حال میں، ہر رنگ میں آپ کا ساتھ دوں گی" ___ وینا نے کہا ___ "اللہ نہ کرے کبھی مجھے آپ کے ساتھ فاقہ کشی کرنی پڑی تو بخدا بخوشی کروں گی لیکن اس سوسائٹی میں نہیں جاؤں گی جہاں جا کر انسان گم ہو جاتے ہیں.... میں گم ہو جاؤں گی عثمان صاحب!"

"وہ کیسے؟"

"جیسے آپ ہو گئے ہیں" ___ وینا نے کہا ___ "میرے لئے اور بچوں کے لئے آپ لاپتہ ہو گئے ہیں"۔

"میں نے جو کہا ہے اس پر غور کرو"۔

"سوچوں گی"۔



میجر عثمان کے دوستوں کو توقع تھی کہ وہ عثمان کو اس راستے سے ہٹا لیں گے۔ کچھ ایسی ہی توقع وینا کو تھی۔ اسے خیال تھا کہ وہ عثمان سے بے رُخی سے پیش آئے گی تو

عثمان اس کے آگے ہتھیار ڈال دے گا لیکن یہ سب لوگ خوش فہمیوں میں مبتلا تھے۔

عثمان اس مقام تک پہنچ گیا تھا بلکہ پہنچا دیا گیا تھا جہاں وہ اپنے اور پرائے، دوست اور دشمن کے فرق کو بھول گیا تھا۔ دوستوں نے اسے نادم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نادم ہونے کی بجائے فخر محسوس کر رہا تھا کہ اس کے دوست اس سے حسد کرتے ہیں کہ یہ شخص ان کی سوسائٹی میں اتنا مقبول ہو گیا ہے اور اتنی خوبصورت لڑکی اس پر فدا ہے۔

وینا نے کوشش تو کی تھی کہ اپنے والدین اور بھائیوں کو نہ بتائے کہ عثمان نے کیا رنگ اور کیا رویّہ اختیار کر لیا ہے لیکن وہ جس پریشانی اور جذباتی خلفشار میں مبتلا رہتی تھی وہ اس کے چہرے پر صاف نظر آتی تھی۔ ماں نے اس سے پوچھا تو اس نے مصنوعی سی مسکراہٹ سے ٹال دیا تھا لیکن وہ زیادہ عرصہ اپنی پریشانی کو چھپا نہ سکی۔ اس نے ماں کو اصل احوال سنایا اور سناتے سناتے اس کے آنسو نکل آئے۔ ماں نے اس کے باپ کو بتایا پھر وینا کے دونوں بھائیوں کو پتہ چلا۔ اس کے بھائی ایک تو اچھے عہدوں پر لگے ہوئے تھے دوسرے وہ خوددار اور لٹھ باز قسم کے آدمی بھی تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ عثمان کے ساتھ براہِ راست بات کریں گے۔ وہ باز نہ آیا تو کوئی اور کارروائی کریں گے لیکن وینا نے انہیں روک دیا۔

"آپ بھی خاموش رہیں" ___ وینا نے بھائیوں سے کہا ___ "وہ خود سر اور فضول قسم کا دلیر آدمی ہے۔ بات بنے گی نہیں بگڑ جائے گی"۔

"یہ سوچ لو" ___ بڑے بھائی نے وینا سے کہا ___ "ہم زیادہ دیر یہ سلسلہ برداشت نہیں کر سکیں گے"۔

یہ چند مہینے پہلے بہن کی اپنے بھائیوں، باپ اور ماں سے باتیں ہوئی تھیں۔ اس کے بعد بھائی اس کے گھر آ کر اس سے پوچھتے رہے کہ عثمان کا رویّہ کیسا ہے۔ وینا انہیں اس طرح بتاتی رہی جیسے یہ معاملہ اتنا سنگین نہیں اور وہ خود سنبھال لے گی۔ اب میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے یہ مہم اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور وہ وینا کو اپنی رپورٹ دے رہے تھے۔ انہی دنوں وہ اپنے گھر گئی تو بھائیوں نے اس سے پوچھا کہ اب عثمان کا کیا حال ہے۔ بڑے بھائی نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی ڈگر سے ہٹا نہیں تو اسے ہٹانے کا بندوبست کیا جائے۔

"نہیں بھائی جان!" ___ وینا نے کہا ___ "اب تو معاملہ کچھ ایسا رنگ اختیار کر گیا ہے کہ میں آپ کو آگے نہیں ہونے دوں گی۔ عثمان کے دو دوست ہیں۔ ایک میجر ہے

اور دوسرا کیپٹن۔ میرے ساتھ وہ ایسے ہی ہیں جیسے آپ دونوں میرے بھائی ہیں۔ انہوں نے وہ کوٹھی بھی دیکھ لی ہے جہاں عثمان جاتا ہے اور ایک لڑکی کو گاڑی میں بٹھا کر کبھی کسی ہوٹل میں اور کبھی کہیں اور لے جاتا ہے۔ عثمان کے دونوں دوستوں نے معلوم کر لیا ہے کہ اس کوٹھی میں رہنے والے مشکوک سے لوگ ہیں۔ سمگلر بھی ہو سکتے ہیں لیکن زیادہ شک یہ ہوتا ہے کہ یہ جاسوسوں کا کوئی گروہ ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سمگلر بھی نہ ہوں اور جاسوس بھی نہ ہوں اور وہ انہی بے غیرت لوگوں میں سے ہوں جو اپنی بہو بیٹیوں پر سوشل کا لیبل لگا کر عثمان جیسے امیر کبیر شہزادوں کو پھانس لیتے ہیں اور عیش و عشرت کرتے ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں۔ بظاہر معزز اور باوقار لگتے ہیں لیکن عصمت فروشی کو وہ کلچر کا نام دے کر موج میلہ کرتے ہیں"۔

"پھر ان دوستوں سے مجھے ملواؤ" ___ وینا کے بڑے بھائی نے کہا ___ "میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہوں"۔

"میں ان دونوں سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گی" ___ وینا نے کہا ___ "وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے اور آپ کو خود ہی بتا دیں گے کہ آپ کا ان کے مشن میں شامل ہونا مناسب ہے یا نہیں، یقین جانیں بھائی جان بڑے ہی مخلص آدمی ہیں"۔



عثمان نے لُوسی کے منگیتر کے ساتھ بھی دوستانہ گانٹھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی چند ایک ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ عثمان حیران ہوتا تھا کہ لُوسی کا یہ منگیتر پرکشش آدمی ہے اور اس کی زبان میں ایسی مٹھاس ہے جو دکھی دلوں کو بھی سہلا لیتی ہے اور اُس کی طبیعت اتنی خوشگوار ہے کہ کوئی اُس کے پاس روتا ہوا آئے تو ہنستا ہوا جائے۔ عثمان سوچتا تھا کہ لُوسی اسے کیوں پسند نہیں کرتی۔ یہ سوچ کر عثمان کا اپنا سینہ فخر سے پھیل جاتا تھا کہ وہ اتنا زیادہ خوبرو ہے کہ لوسی جیسی حسین لڑکی نے اس کے مقابلے میں اس خوبرو اور خوشگوار منگیتر کو دل سے اتار دیا ہے اور لوسی کے ماں باپ جیسے امیر اور ایڈوانس لوگوں نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔

عثمان اسے اکیلے بھی ملتا رہا تھا اور اس وقت بھی جب لُوسی منگیتر کے ساتھ ہوتی تھی۔ عثمان کبھی کبھی اپنے آپ میں حیران ہوتا تھا کہ لُوسی کے منگیتر کو اچھی طرح معلوم ہے کہ لُوسی اس سے ملتی جلتی ہے اور اُس کے ساتھ لُوسی کی دلچسپی بھی ہے، پھر بھی منگیتر

بُرا نہیں مانتا اور اس نے کبھی ایسا اشارہ بھی نہیں کیا کہ وہ لُوسی اور عثمان کا میل جول پسند نہیں کرتا۔

ایک روز لُوسی نے عثمان کو بتایا کہ اس کے منگیتر کے ساتھ ایک ٹریجیڈی ہو گئی ہے۔ منگیتر کا جوان بھائی ایک بس میں لاری اڈے پر مارا گیا تھا۔ یہ بسوں کی ٹکر نہیں تھی بلکہ ایک بس میں ایک بم پھٹا تھا جس میں ابھی تھوڑے سے مسافر بیٹھے تھے۔ ان میں سے دو تو وہیں ہلاک ہو گئے اور باقی سب بُری طرح زخمی ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں ایک جوان آدمی لوسی کے منگیتر کا سگا بھائی تھا اور منگیتر گھر چلا گیا تھا۔ وہ اس شہر کا رہنے والا نہیں تھا۔

"یہ کل والی خبر تو نہیں؟" ___ عثمان نے کہا ___ "کل اخباروں میں چھپی تھی"۔

"وہی خبر ہے" ___ لوسی نے کہا۔

"یہ ہماری حکومت کی کمزوری ہے" ___ عثمان نے کہا ___ "حکومت جو بھی آتی ہے وہ اپنے اقتدار کا تحفّظ کرتی ہے اور وہ اس کام میں اس قدر محو ہو جاتی ہے کہ پورے کا پورا ملک اور ساری کی ساری قوم کے تحفظ اور دفاع کا اسے خیال ہی نہیں رہتا"۔

"تمہارا کیا خیال ہے!" ___ لوسی نے پوچھا ___ "یہ دھماکے کون کرتا ہے؟"

"انڈیا!" ___ عثمان نے جواب دیا ___ "یہ اپنے اندر کی سیاسی تخریب کاری بھی ہو سکتی ہے۔ اپوزیشن والے حکومت کے لئے مسئلے پیدا کرنے کی خاطر اس قسم کے دھماکے بھی کیا کرتے ہیں تاکہ ملک میں خوف و ہراس اور بدامنی کی صورتِ حال پیدا ہو جائے لیکن زیادہ تر دھماکے انڈیا کروا رہا ہے اور اس کا مقصد بھی یہی ہے"۔

"نہیں عثمان!" ___ لوسی نے کہا ___ "انڈیا کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ انڈیا کو کیا پڑی ہے کہ وہ اس طرح چھوٹے موٹے دھماکے کراتا پھرے۔ انڈیا کو اس لئے بدنام کیا جاتا ہے کہ ہماری حکومت کے پاس اس تخریب کاری کا کوئی علاج نہیں اور نہ حکومت کوئی علاج کرنا چاہتی ہے۔ اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ جہاں کہیں تخریب کاری کی کوئی واردات ہو جائے وہ انڈیا کے کھاتے میں ڈال دے"۔

"مجھے تمہاری یہ بات اچھی نہیں لگتی لُوسی!" ___ عثمان نے ہنستے مسکراتے کہا ___ "میں نے تمہیں اکثر انڈیا کی حمایت کرتے ہی دیکھا ہے"۔

"او شٹ اپ!" ___ لوسی نے کہا ___ "آئی ٹاک فیکٹس.... میں پاکستانی ہوں۔

حقیقت کا سامنا کرو، بہرحال میرے منگیتر کو بہت بری چوٹ پڑی ہے"۔

○

چار پانچ دنوں بعد لوسی کا منگیتر واپس آیا اور سیدھا لوسی کے گھر گیا۔ لوسی اور اس کے خاندان کے ہر فرد نے اسے اپنے درمیان بٹھالیا اور ایسے انداز سے اظہارِ افسوس کرنے لگے جیسے مرنے والا بھائی ان سب کا سگا بھائی تھا۔ سب نے نوٹ کیا کہ منگیتر کی آنکھیں خشک تھیں جیسے اسے بھائی کے مرنے کا کوئی افسوس نہ ہو، البتہ اس کے چہرے کے تاثر اُڑے اُڑے سے تھے اور ان سے اندرونی بے چینی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

"میں ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں" ــــ منگیتر نے لوسی کے باپ سے کہا ــــ "صرف آپ سے!"

باپ کے اشارے پر باقی سب اٹھ کر چلے گئے۔

"کہو صغیر!" ــــ لوسی کے باپ نے کہا ــــ "کوئی خاص بات؟ پیسوں کی ضرورت ہے؟"

"نہیں محترم" ــــ صغیر نے جواب دیا ــــ "مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ میں آپ کا ساتھ چھوڑ رہا ہوں.... ہمیشہ کے لئے!"

"کیوں؟" ــــ لوسی کے باپ نے پوچھا ــــ "یہ فیصلہ کیوں کیا؟.... اگر ہم تمہیں نہ چھوڑنا چاہیں تو کیا کرو گے؟"

"میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے" ــــ صغیر نے کہا ــــ "میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا راز کسی قیمت پر فاش نہیں ہو گا۔ آپ کے ساتھ جو وقت گزرا ہے بہت اچھا گزرا ہے اور آپ نے میرے ساتھ جو مہربانیاں کی ہیں وہ میں ساری عمر نہیں بھول سکوں گا۔ مجھے صرف ایک افسوس ہے کہ میں آپ کا ایک کام پورا نہیں کر سکا لیکن یہ کام لوسی کرے گی"۔

"کون سا کام؟"

"آپ نے مجھے یہ کام سونپا تھا کہ میجر عثمان کو آپ کی جھولی میں ڈالنا ہے۔ میں یہ کام کر رہا تھا لیکن یہ حادثہ ہو گیا اور میرا دل اس کام سے اکھڑ گیا لیکن مجھے پوری اُمید ہے کہ لوسی یہ کام آسانی سے کر لے گی۔ وہ بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔ عثمان خاصا کمزور آدمی ہے، ہمارے راستے پر آجائے گا"۔

"دیکھو صغیر!" ــــ لوسی کے باپ نے کہا ــــ "تم نے بھائی کی موت کا بہت زیادہ صدمہ لیا ہے۔ یہ وقتی اثر ہے۔ اس صدمے کو برداشت کرو اور اتنا اچھا کیریئر تباہ نہ کرو جو تمہیں دولت بھی دے رہا ہے اور ہر طرح کا عیش و آرام بھی"۔

"اس صدمے نے میرا دماغ روشن کر دیا ہے" ــــ صغیر نے کہا ــــ "میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ آپ نے ایسے دو دھماکے کروائے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے کس دلیری سے یہ دونوں بم کہاں کہاں رکھے تھے۔ ایک میں چھ آدمی ہلاک اور تیرہ زخمی ہوئے تھے اور دوسرے میں سات آدمی ہلاک اور زخمیوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی"۔

"اور اس کا معاوضہ دیکھو ہم نے تمہیں کتنا زیادہ دیا تھا" ــــ لوسی کے باپ نے کہا ــــ "اگر تمہیں یہ کام پسند نہیں تو ہم تمہیں کسی اور کام پر لگا دیتے ہیں۔ ابھی تو ہم نے تمہیں انڈیا بھیجنا ہے۔ خدا کی قسم وہاں جتنے دن رہو گے اپنے آپ کو راجہ اِندر سمجھو گے۔ اس کے ساتھ ہی وہاں تمہاری کچھ اور ٹریننگ ہو جائے گی"۔

"میں معافی چاہتا ہوں جناب" ــــ صغیر نے کہا ــــ "لمبی چوڑی باتوں کو چھوڑیں۔ میں مختصر سی بات کر کے آپ کو بتا دیتا ہوں کہ اس کام سے میرا دل کیوں اُچاٹ ہو گیا ہے۔ میں نے دھماکے کئے تھے اور جب خود ہی وہاں جا کر تباہی کا منظر دیکھا تو اپنی کامیابی پر میں بے حد خوش ہُوا تھا۔ اگلے روز اخبار دیکھے۔ پہلے صفحے صرف میری کامیابی کی تصویروں اور خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ میں فاتحانہ انداز سے پاکستان کی اس مخلوق میں گھوم پھر رہا تھا جس پر ان دھماکوں نے خوف و ہراس طاری کر رکھا تھا لیکن جناب جب ایسے ہی ایک دھماکے نے بس کے ساتھ میرے چھوٹے بھائی کے جسم کے بھی پرخچے اُڑا دیئے تو مجھے یوں لگا جیسے خدا نے مجھے کہا ہو کہ یہ ہے تیری سزا جو اس دنیا میں تجھے ملی ہے باقی اگلے جہان میں ملے گی.... مجھے اس بھائی سے بہت پیار تھا۔ میں نے ماں کو بیہوش ہوتے دیکھا۔ اپنے بوڑھے باپ کو اپنے کپڑے پھاڑتے دیکھا۔ اپنی بہنوں کو اپنے بال نوچتے دیکھا۔ سب کہہ رہے تھے کہ یہ دھماکے انڈیا کے تخریب کار کرتے ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے بھائی کی میّت پر یہ سب عورتیں اور تمام آدمی میری طرف انگلیاں کر کر کے کہہ رہے ہوں کہ یہ ہے انڈیا کا تخریب کار جس نے اپنے بھائی کو بھی نہیں بخشا"۔

"لیکن یہ دھماکہ تم نے تو نہیں کیا" — لُوسی کے باپ نے کہا۔

"میں جانتا ہوں آپ نے یہ دھماکہ کس سے کروایا ہے" — صغیر نے کہا — "وہ میرا ہی ساتھی ہے۔ اپنا انعام لے چکا ہے لیکن جناب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ انڈیا سے ملے ہوئے معاوضے پر میں نے دو دھماکوں میں جن پاکستانیوں کو ہلاک کیا ہے وہ بھی ماؤں کے بیٹے تھے۔ وہ مائیں بھی پاگل ہو گئی ہوں گی۔ ان کی بہنیں بھی اپنے بال نوچتی ہوں گی اور ان کے باپ بھی پاگلوں کی طرح اپنے کپڑے پھاڑتے ہوں گے اور معلوم نہیں کتنے بچے یتیم ہو گئے ہوں گے۔ ان سب کا قاتل میں ہوں۔ میں کرائے کا قاتل ہوں۔ میں اب باقی عمر گناہوں کی معافی مانگتے گزاروں گا خواہ میں درویش اور ملنگ ہی بن جاؤں"۔

"ہوش میں آؤ صغیر!" — لوسی کے باپ نے کہا — "اس صدمے کی حالت میں نہ سوچو۔ تم دیکھو گے کہ کچھ دنوں بعد جب اس صدمے کا اثر ذرا کم ہو جائے گا تو تم صحیح فیصلہ کر سکو گے"۔

"صدمہ گزر گیا یا اس کا اثر کم ہو گیا تو میرا فیصلہ غلط ہو گا" — صغیر نے کہا — "میں پھر انڈیا کا ہی آدمی رہوں گا۔ میں آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا اور میں قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا راز فاش نہیں کروں گا۔ عثمان کو پتہ ہی نہیں چلنے دوں گا کہ آپ لوسی کے باپ نہیں اور جو آپ کی بیوی بنی ہوئی ہے وہ لوسی کی ماں نہیں نہ میں لوسی کا منگیتر ہوں اور اس کوٹھی میں جو لوگ رہتے ہیں ان کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہیں اور یہ سب ایک گروہ کے آدمی ہیں اور یہ گروہ انڈیا کا ہے"۔

"سوچ لو صغیر!" — اس شخص نے کہا جو لوسی کا باپ بنا ہُوا تھا — "کل تک سوچ لو"۔

صغیر اس کمرے سے نکلا تو لوسی نے اسے روک لیا لیکن وہ نہ رکا۔ لُوسی کو اس کے فرضی باپ نے بتایا کہ صغیر کیا فیصلہ سنا گیا ہے۔

"یہ تو بڑا خطرناک فیصلہ ہے" — لوسی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں" — اس شخص نے کہا — "بندوبست کر لیں گے"۔



صغیر نے اپنی پردہ پوشی کے لئے چھوٹا سا ایک دفتر بنا رکھا تھا جس پر لگے بورڈ سے پتہ چلتا تھا کہ یہ ایک پراپرٹی ڈیلر کا دفتر ہے۔ صغیر نے نہ کبھی کوئی پراپرٹی کسی کو خرید کر

دی تھی نہ یہ اُس کا کام تھا۔ یہ محض ایک پردہ پوشی تھی۔ اس دفتر کے ساتھ ہی رہائش کا بندوبست تھا۔

شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ صغیر ابھی ابھی اپنے گھر آ کر بیٹھا ہی تھا۔ اس کا بھائی فوت ہو گیا تھا اور اسے واپس اپنے شہر جانا تھا۔ گاڑی اس کے پاس تھی۔ اس کا ارادہ کچھ دیر بعد چلے جانے کا تھا۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ صغیر باہر نکلا۔ دو آدمی کھڑے تھے جو اس کے لئے اجنبی تھے۔ قریب ہی ایک کار کھڑی تھی جس کے سٹیئرنگ پر ایک آدمی بیٹھا تھا اور ایک آدمی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہُوا تھا۔

"آپ پراپرٹی ڈیلر ہیں" — ایک آدمی نے کہا — "ہمیں ایک کوٹھی چاہئے"۔

"آپ ذرا گاڑی تک آ جائیں" — دوسرا آدمی بولا — "اصل صاحب ذرا چلنے سے معذور ہیں۔ گاڑی میں ہی ان کی درخواست سن لیں"۔

صغیر ان کے ساتھ گاڑی تک گیا۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا۔ پیچھے سے دونوں آدمیوں نے اسے بڑی زور سے دھکیلا اور اس کا سر دبا کر نیچے کیا۔ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اندر کو کھینچا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی ناک پر رومال رکھا پھر صغیر کو کوئی ہوش نہ رہی۔ وہ لاش کی طرح گاڑی کے اندر پڑا تھا۔ دونوں آدمی پیچھے بیٹھ گئے اور گاڑی چلی گئی۔

وہ جب ہوش میں آیا تو ایک کمرے میں پلنگ پر پڑا ہُوا تھا۔ دو آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اُن میں ایک وہی شخص تھا جو لوسی کا باپ بنا ہوا تھا۔

"ہوش ٹھکانے آئے صغیر!" — اُس شخص نے کہا — "اب کہو کیا فیصلہ ہے تمہارا!"

"میں اپنے فیصلے سے نہیں ہٹوں گا" — صغیر نے کہا۔

"ہٹ جاؤ گے" — لُوسی کے فرضی باپ نے کہا اور دوسرے آدمی کو حکم کے لہجے میں کہا — "اسے اُس کمرے میں پہنچا دو"۔

صغیر کو "اُسی" کمرے میں پہنچا دیا گیا جو لوسی کے فرضی باپ نے بتایا تھا۔

لوسی کا فرضی باپ انڈیا کے اس جاسوسی گروپ کا لیڈر تھا۔ اس کا نام مہندر آہوجا تھا۔ اس نے اپنی کوٹھی کے باہر اسی نام کے مطابق "ایم اے خان" کی تختی لگا رکھی تھی۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی لیکن لگتا چالیس سال سے کم عمر کا تھا۔ وہ انڈیا کی انٹیلی جنس کا غیر معمولی طور پر ذہین اور منجھا ہُوا آدمی تھا۔ وہ امریکہ کی سی آئی اے کا ایجنٹ ہُوا کرتا تھا۔ اس نے زیادہ تر تجربہ سی آئی اے میں ہی حاصل کیا تھا۔ سی آئی اے نے اسے کروڑ پتی بنا دیا تھا لیکن ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس سے اس نے سی آئی اے سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔

علیٰحدگی کی وجہ یہ تھی کہ شروع شروع میں تو اس سے سی آئی اے معمولی معمولی سے کام لیتی رہی جو زیادہ تر مخبری تک ہی محدود تھے۔ آگے چل کر اسے ایک ایسا کام بتایا گیا جو اس کے ملک کے خلاف جاتا تھا۔ وہ کٹر ہندو تھا اس لئے اپنے ملک کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے لئے اس کا دل آمادہ نہ ہو سکا۔ وہ برہمن تھا اور اس کا عقیدہ تھا کہ انڈیا برہمنوں کا دیس ہے جسے انڈونیشیا سے لے کر دجلہ اور فرات تک وسعت دے کر مہابھارت بنانا تھا۔ پاکستان اور افغانستان کو تو مہابھارت میں شامل کرنا ہی تھا' مہندر انڈیا میں کسی مسلمان کا وجود تک برداشت نہیں کرتا تھا۔

سی آئی اے نے اسے جو کام بتایا تھا وہ ایک تو اس کے ملک کے لئے نقصان دہ تھا اور دوسرا نقصان اس کے ملک کی حکومت کو پہنچنا تھا جو خالصتاً" برہمن حکومت تھی۔ امریکی سی آئی اے نے اسے صرف اس کام کے لئے لاکھوں روپیہ پیش کیا تھا لیکن اس نے نہ

صرف یہ کہ اتنی کثیر رقم لینے سے انکار کر دیا بلکہ سی آئی اے سے علیٰحدگی اختیار کر کے اپنے ملک کے وزیراعظم کو جا بتایا کہ سی آئی اے یہاں کیا کر رہی ہے۔ وزیراعظم نے اپنی انٹیلی جنس کے چیف کو بلایا اور اسے امریکہ کی خفیہ سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ انڈین انٹیلی جنس نے مہندر کی اطلاع پر اور دیگر تفصیلات پر جو مہندر نے بتائی تھیں' پیش بندی کر لی اور انعام کے طور پر یا مہندر کا جذبہ دیکھ کر اور ساتھ ہی اس کا تجربہ دیکھ کر اسے انٹیلی جنس میں شامل کر لیا۔

مہندر جب اپنے ملک کی انٹیلی جنس میں آیا تو اس کے جوہر بڑی تیزی سے کھلنے لگے۔ ان کی بدولت اسے اپنی انٹیلی جنس میں بڑی جلدی ذمہ دار پوسٹ مل گئی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میں اپنی زندگی میں مہابھارت کا خواب عملی تعبیر کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کام کے لئے میں راتوں کو سووؤں گا بھی نہیں۔ یہ الفاظ تو تکیۂ کلام کی طرح اس کی زبان پر رہتے تھے کہ میں مہابھارت میں کسی مسلمان ملک کو کیسے برداشت کروں گا جبکہ میں کسی ایک مسلمان کی صورت بھی دیکھنا گوارہ نہیں کرتا۔

یہ اس کی ٹریننگ نہیں بلکہ اس کی فطرت تھی۔ اس نے مسلمانوں کی طرح لاکھوں روپیہ قبول کر کے اپنے ملک کے خلاف غداری نہیں کی تھی بلکہ اتنی زیادہ دولت جو اسے پیش کی گئی تھی اور آئندہ جو ملنے والی تھی' ٹھکرا دی تھی۔ اب یہ مہندر پاکستان کے دل میں ایم اے خان بن کر اُترا ہُوا تھا اور پاکستان میں اس نے اپنے جو ایجنٹ پیدا کر کے پھیلا دیئے تھے ان میں اکثریت پاکستانی مسلمانوں کی تھی۔

صغیر ان ہی پاکستانیوں میں سے تھا لیکن بھائی کی موت نے اس کا دماغ روشن کر دیا تھا۔ انڈیا کے ایجنٹوں کے رکھے ہوئے بم کے دھماکے نے صغیر کے دل و دماغ سے سیاہ پردے اٹھا دیئے لیکن مہندر اتنا کچا آدمی نہیں تھا کہ اسے اس کی خواہش کے مطابق چھوڑ دیتا۔ مہندر نے صغیر کو اُس کمرے میں پہنچا دیا تھا جو تھا تو زمین پر ہی لیکن ایسے تھا جیسے زمین کی سات تہوں کے نیچے ہو۔ وہاں سے اس کی چیخ و پکار کوئی نہیں سن سکتا تھا۔



تین چار دن بعد کی ایک رات میجر عثمان اپنے گھر میں داخل ہُوا۔ دروازہ وینا نے کھولا تھا۔ وینا نے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ رات ساڑھے بارہ بجے تک وہ کہاں رہا ہے۔ اسے معلوم تھا وہ کہاں تھا۔ وینا اور عثمان اب ایک دوسرے

کے ساتھ کم ہی بولتے چالتے تھے۔ کوئی ضروری بات ہوتی تو وہ انتہائی مختصر الفاظ میں کر لیتے تھے۔ ان دونوں میں میاں بیوی والی بے تکلفی ختم ہو چکی تھی۔ میجر عثمان گھر آتا اور باہر نکل جاتا تھا پھر رات گئے واپس آتا اور سو جاتا تھا۔ وینا نے عثمان کے دوستوں، میجر سمیع اور کیپٹن آصف سے کہا تھا کہ عثمان کا انداز ایسا ہو گیا ہے جیسے یہ اس کا گھر نہیں بلکہ ہوٹل ہے جہاں وہ کسی مجبوری کے تحت رہائش پذیر ہے۔ اس گھر، کسی فرد، بیوی یا بچے کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا نہ ان میں کوئی رسمی سی دلچسپی تھی۔ کئی کئی دن وہ گھر میں کھانا بھی نہیں کھاتا تھا۔

اُس رات عثمان حسب معمول رات ساڑھے بارہ بجے گھر آیا تو وینا نے رسمی طور پر پوچھا کہ کھانا کھائیں گے؟

"تم کیا سمجھتی ہو میں اس وقت تک بھوکا ہی پھر رہا ہوں؟" —— عثمان نے بے رخی اور طنز کے لہجے میں کہا۔

"بہرحال میرا پوچھنا فرض ہے" —— وینا نے کہا۔

"تم جو فرض ادا کر رہی ہو وہ میں جانتا ہوں" —— عثمان نے کہا۔

"کیا جانتے ہیں آپ؟" —— وینا نے اکتائے ہوئے سے لہجے میں پوچھا۔

"یہ کہ تم نے مجھے ہر جگہ رسوا اور بدنام کرنے کی باقاعدہ مہم چلا رکھی ہے" —— عثمان نے غصیلی آواز میں کہا۔

"آپ اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں" —— وِینا نے بڑے آرام سے کہا —— "سو جائیں"۔

"میں ہوش میں ہوں" —— عثمان نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا —— "اب یہ دعا کیا کرو کہ میں ہوش میں نہ رہوں"۔

"آہستہ بولیں" —— وینا نے کہا تو نرم سے لہجے میں لیکن اس لہجے میں طنز نمایاں تھی —— "بچے ڈر کر جاگ اٹھیں گے"۔

"مجھ پر حکم چلانے کی کوشش نہ کرو" —— عثمان نے اور زیادہ بلند آواز میں کہا۔

وینا نے بہت کوشش کی کہ بات آگے نہ بڑھے۔ وہ جانتی تھی کہ عثمان سمجھ بُوجھ کی حد سے نکل گیا ہے۔ اس پر اب کوئی دلیل اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تو ایسے ہی تھا جیسے آسمان کی طرف منہ کر کے تھوکو تو تھوک اپنے ہی منہ پر آ پڑتا ہے لیکن عثمان بات کو بگاڑتا چلا گیا اور خود ہی بات سے بات نکال کر جھگڑے کو طول دیتا رہا۔

"خدا کے لئے چپ ہو جاؤ" —— وینا نے ہاتھ جوڑ کر کہا —— "آپ اپنے آپ میں نہیں۔ آپ کی زبان لڑکھڑا رہی ہے۔ کپڑے بدلیں اور سو جائیں"۔

"اب یہ مشہور کر دو" —— عثمان نے کہا —— "یہ بھی مشہور کر دو کہ میرا خاوند ہیروئن کا نشئی ہو گیا ہے.... میں اس گھر پر لعنت بھیجتا ہوں۔ باہر سے اچھا بھلا آتا ہوں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی مجھ پر ڈیپریشن طاری ہو جاتی ہے۔ میں تمہاری صورت سے بیزار ہو گیا ہوں"۔

وِینا نے صبر اور برداشت کی قوت پیدا کر لی تھی لیکن انسان پتھر تو نہیں ہوتا کہ وہ سنتا ہی چلا جائے۔ وہ آخر بیوی تھی اور اس آدمی کے بچوں کی ماں تھی جو اب اس سے بیگانہ ہی نہیں ہوا بلکہ اس کا دشمن ہو گیا تھا۔ اس کے آنسو نکل آئے۔

عثمان کی آواز میں ایسا لُرزہ تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔ وہ تھا ہی نشے میں۔ نشے میں غصہ شامل ہُوا تو آواز میں اور زیادہ لرزہ پیدا ہو گیا۔ اس نے واہی تباہی بکنی شروع کر دی۔ وینا نے اپنے ہونٹ سی لئے اور عثمان واہی تباہی بکتا سو گیا۔

وہ تو گھر میں داخل ہُوا تو سویا ہُوا ہی تھا۔ اسے نیم خفتہ یا نیم بیدار بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ لُوسی سے مل کر آیا تھا۔ ان کی یہ ملاقات "ایم اے خان" کی کوٹھی میں ہوئی تھی۔ وہ دونوں الگ کمرے میں بیٹھے رہے تھے جس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ انہوں نے کھانا اسی کمرے میں کھایا تھا۔ کھانا نوکر نہیں لایا تھا بلکہ لوسی خود جا کر کھانے کی ٹرے اٹھا کر لائی تھی۔ کھانے کے ساتھ کوکا کولا اور سیون اپ کی بوتلیں بھی تھیں جو لُوسی دو گلاسوں میں ڈال کر لائی تھی۔ کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد عثمان نے خمار سا محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ لُوسی نے کوکا کولا کا جو گلاس اس کے آگے رکھا تھا اس میں ٹرانکولائزر گولیاں ملا رکھی تھیں۔ یہ خمار ان گولیوں کا تھا جسے وہ لوسی کی محبت کا خمار سمجھ رہا تھا۔ اس نشے کی کیفیت میں اس کی ساری دنیا لوسی کے دلکش وجود میں سمٹ آئی تھی۔

میجر عثمان کو میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے بتایا تھا کہ یہ لڑکی اسے دھوکے میں ٹرانکولائزر پلا رہی ہے لیکن لُوسی کو اس نے اپنے آپ پر، اپنی عقل و ہوش پر اور اپنے خواب و خیال پر اس قدر غالب کر رکھا تھا کہ وہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا کہ لوسی

اسے کسی قسم کا دھوکہ بھی دے سکتی ہے۔

لُوسی سر تاپا ایک طلسماتی دھوکہ تھی۔ وہ انٹیلی جنس کی تربیت یافتہ لڑکی تھی، جسے اپنے جال میں لیتی تھی وہ یقین کی حد تک محسوس کرتا تھا کہ لوسی اس پر مرمٹی ہے اور اس کے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہ اس کی ایکٹنگ اور ناز و انداز کا کمال تھا۔ اپنے آنسو نکال لینا، بلک بلک کر ایسا رونا کہ دیکھنے والا تڑپ اٹھے، اس کے خصوصی کمالات میں شامل تھا۔ اس کے پاس مسکراہٹوں کی کئی قسمیں تھیں جن میں ایک مسکراہٹ ایسی تھی کہ زاہد بھی زہد و تقویٰ کو الگ رکھ دیں۔

اس کا سب سے بڑا کمال تو یہ تھا کہ وہ اپنے شکار کو کھلونا بلکہ چابی والا کھلونا بنا لیتی تھی مگر خود اس کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بنتی تھی۔ وہ اپنے شکار کو مشینی انسان جسے روبوٹ کہتے ہیں، بنا لیتی تھی۔ مرد عورت سے کیا چاہتا ہے؟ —— حیوانی جذبات کی تسکین —— لُوسی مرد کے فطری مطالبے کو خوب سمجھتی تھی۔ وہ اپنے شکار کے ان جذبات کو بھڑکا دیتی اور خود اس کے لئے ایک سراب بن جاتی تھی پھر اس کا شکار پیاسے صحرا نورد کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا تھا اور سراب یہ دو ہاتھ دُور نظر آتا مگر دو ہاتھ کا فاصلہ طے ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔

اونچے درجے کی پیشہ ور عصمت فروش عورت میں جو کشش ہوتی ہے وہ اس کی خوبصورتی کی اتنی نہیں ہوتی جتنی اس کی ایکٹنگ میں ہوتی ہے۔ ہر عصمت فروش عورت میں کشش یہ ہوتی ہے کہ لذّت اور ذہنی فرار مہیا کرتی ہے۔ وہ اپنے گاہک سے یہ نہیں کہتی کہ آٹا ختم ہو گیا ہے، دو بچوں کی فیسیں جانی ہیں، گھر میں مہمان آ رہے ہیں اور طوائف گھریلو مسائل اور جھگڑے پیش نہیں کرتی بلکہ اپنے گاہک کو ان بکھیڑوں سے دُور بھگا کر پناہ دیتی ہے۔ وہ اپنے گاہک کو الفاظ میں اتنا اونچا چڑھا دیتی ہے کہ گاہک گلفام بن کر فضا میں اُڑنے لگتا ہے۔

لذت، فرار اور احساسِ برتری کے احساس کا وہ پورا سامان لُوسی کے پاس موجود تھا جو ایک عصمت فروش عورت کے پاس ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ لُوسی ایک حسین خواب بنی رہتی تھی اور اس خواب کی تعبیر کبھی کبھار بنتی تھی۔ ایک نشہ تو اس کا اپنا تھا جو وہ اپنے شکار پر طاری کر دیتی تھی، دوسرا نشہ ٹرانکولائزر گولیوں کا ہوتا تھا جو اس کے اپنے حسن و جوانی کے نشے میں سرور کی طلسماتی کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔

پھر میجر عثمان جب اس کے گھر سے نکلنے لگا تھا تو اس نے رک کر لوسی سے کہا تھا کہ گھر جانے کو ذرا سا بھی جی نہیں چاہتا۔

"کچھ دن اور صبر کر لو" —— لوسی نے اسے دروازے سے اندر کر کے اور اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اور اپنے ریشم جیسے بال اس کے گالوں سے لگا کر کہا تھا —— "صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے"۔

"وہ کب آ رہا ہے؟" —— عثمان نے صغیر کے متعلق پوچھا۔

"آ گیا تو کیا!" —— لُوسی نے ایسے پیارے انداز سے کہا جیسے بچے کو بہلایا جاتا ہے —— "میں اس سے جان چُھڑا لوں گی"۔

"نہ ہی آئے تو اچھا ہے" —— عثمان نے کہا تھا اور ایک بار پھر لوسی کو اپنے ساتھ لگا کر اور بادلِ نخواستہ اسے چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا تھا۔ وہ جب گھر میں داخل ہُوا تو نشے کی اس کیفیت میں وینا کو دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے قید خانے سے اسے رہائی مل گئی تھی اور اسے زبردستی پھر اسی قید خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ وینا کو اس نے یوں دیکھا جیسے قیدی جیل کے داروغے کو دیکھا کرتے ہیں۔

عثمان جیسے خاوندوں کی بیویاں جن میں اکثر غیر معمولی طور پر خوبصورت ہوتی ہیں، گھر بیٹھی سوچتی اور روتی رہتی ہیں کہ ان میں کیا کمی رہ گئی ہے کہ خاوند ان سے بیزار ہو کر باہر کی عورتوں سے دل بہلا رہے ہیں۔ گھریلو عورت نہیں سمجھتی کہ وہ ایک حقیقت ہے جو حسین تو ہے لیکن اس میں ازدواجی مسائل کی تلخیاں بھی ہیں۔ اس کے برعکس فاحشہ اور عصمت فروش عورت کے پاس ایسی حقیقت ہوتی ہے جس میں کوئی تلخی اور کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ فاحشہ عورت اس کے بچے پیدا نہیں کرتی۔ حقائق سے بھاگے ہوئے خاوند بچوں کی پیدائش کو مسائل اور مصائب کی پیدائش سمجھتے ہیں جیسے بچہ اپنے ساتھ اپنے مسائل لے کر ہی اس گھر میں پیدا ہُوا ہو۔

میجر عثمان اُن خاوندوں میں سے تھا جو اس حقیقت کو قبول کرتے ہی نہیں کہ بچے اور ان کے مسائل ہی زندگی کی اصل مسرّت کے حامل ہوتے ہیں۔

○

لُوسی کے جعلی منگیتر صغیر کو ایک خاص کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ دو آدمیوں نے اسے فرش پر پیٹھ کے بل گرا دیا اور اس کے بازو پیچھے کو لمبے کر کے اس کے ہاتھ اُلٹے کر

دیئے تھے۔ ایک کرسی کا ایک پایہ اس کے ایک ہاتھ پر اور دوسرا دوسرے ہاتھ پر رکھ دیا گیا اور کرسی پر ایک بھاری بھر کم آدمی بیٹھ گیا۔ صغیر کے ہاتھوں کی ہڈیاں ٹوٹنے لگیں اور وہ ذبح ہوتے بکرے کی طرح تڑپنے لگا۔ ایک آدمی نے اس کی ٹانگیں پھیلا کر پاؤں ٹیڑھے کر کے فرش کے ساتھ لگا دیئے اور اپنا ایک پاؤں اس کے ایک ٹخنے پر اور دوسرا دوسرے ٹخنے پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ صغیر کا پسینہ نکل آیا لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز، چیخ یا فریاد نہ نکلی۔

"ہڈیاں توڑ دو" ــــ صغیر نے کربناک آواز میں کہا ــــ "پاؤں کی طرف سے میرے جسم کو کاٹنا شروع کر دو، میری زبان سے یہ الفاظ نہیں سنو گے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا"۔

"تمہاری زبان سے اپنے آپ یہ الفاظ نکلیں گے جو تم ابھی نہیں کہنا چاہتے" ــــ مہندر نے کہا ــــ "ابھی تو تمہاری خاطر تواضع شروع ہوئی ہے.... آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"۔

کمرے میں مہندر کے جو آدمی موجود تھے وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"تم مسلمان ہو" ــــ مہندر نے صغیر کے پیٹ پر اپنا پاؤں رکھ کر اور اپنے جسم کا وزن ڈال کر کہا ــــ "اور مسلمان کی یہ شان ہے کہ وہ چند ٹکوں پر اپنا ایمان ہم جیسوں کے حوالے کر دیا کرتا ہے۔ میں جانتا ہوں تم کتنے کچھ مردِ مومن ہو"۔

"اللہ نے مجھے صراطِ مستقیم دکھا دیا ہے" ــــ صغیر نے اتنی بلند آواز سے کہا جیسے اس نے پُرجوش نعرہ لگایا ہو۔

اس نے "پاکستان زندہ باد" کا پُرجوش نعرہ لگا دیا۔

اتنی زور سے بولنے اور نعرہ لگانے کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ درد کی شدت کو دبا رہا تھا۔ بعض قاتل دیکھے گئے ہیں کہ پھانسی کے تختے کی طرف یا علی اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتے جاتے ہیں۔ انہیں علی اور اللہ کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، وہ دراصل اُس خوف کو لاشعوری طور پر دبا رہے ہوتے ہیں جو ان کے دلوں اور اعصاب کو اپنی گرفت میں لئے ہوتے ہوتا ہے۔ وہ موت کے خوف کو دبانے کے لئے نعرے لگاتے ہیں اور یہی کیفیت صغیر پر طاری تھی۔

"تم اب یہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے" ــــ مہندر نے صغیر سے کہا ــــ "میں

تمہیں ایک موقع اور دینا چاہتا ہوں اور وہ اس لئے کہ تم نے انڈیا کی جو خدمت کی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ ہم یہ نہیں کہلوانا چاہتے کہ ہم نے اتنی زیادہ خدمت کرنے والے آدمی کو کچھ نہیں دیا"۔

"میں جواب دے چکا ہوں" ــــ صغیر نے کہا ــــ "اس جواب سے نہیں ہٹوں گا"۔

"صرف تم ہی نہیں مرو گے" ــــ مہندر نے کہا ــــ "تم اُس بھیانک انجام کو تصور میں بھی نہیں لا سکتے جس تک ہم تمہارے خاندان کو پہنچائیں گے۔ تمہارا ایک بھائی مر چکا ہے۔ تمہاری ایک بہن جوان ہے جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی اور تمہاری بیوی بھی جوان ہے۔ ہم تمہیں انڈیا لے جا کر ماریں گے لیکن اس سے پہلے تمہیں انڈیا کے ایک چکلے میں تمہاری بہن اور تمہاری بیوی کو بیٹھا ہُوا دکھائیں گے"۔

"بکواس بند کر ہندو کُتے!" ــــ صغیر نے درد سے کراہتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "اب میری اور تیری ٹکر نہیں بلکہ اسے اب اللہ اور اپنے بھگوان کی ٹکر سمجھ پھر دیکھنا کون سچا ہے"۔

مہندر نے اس کے پیٹ سے اپنا پاؤں اٹھا لیا۔ وہ اس طرح ہنس رہا تھا جیسے کوئی نوعمر لڑکا بلّی یا کُتے کے ساتھ کھیل رہا ہو۔ صغیر کے پاؤں پر جو آدمی کھڑا تھا، اُسے مہندر نے کہا کہ وہ اُتر جائے اور صغیر کے پاؤں رسّی سے کس کر باندھ دے۔ کرسی پر جو آدمی بیٹھا تھا اسے مہندر نے کہا کہ وہ بیٹھا رہے اور مہندر خود صغیر سے یہ کہہ کر کہ وہ سوچ کر جواب دے، کمرے سے نکل گیا۔

یہ کمرہ کسی جنگل میں نہیں تھا، کہیں پہاڑیوں کے اندر غیر آباد علاقے میں نہیں تھا، یہ پولیس کا، اینٹی سی آئی اے کا یا آئی ایس آئی کا ٹارچر سیل نہیں تھا بلکہ یہ کمرہ کوٹھیوں کے گنجان آباد علاقے میں ایک خوبصورت کوٹھی میں تھا جس کے اردگرد لوگ آباد تھے، ٹریفک رواں دواں تھی اور اس مہذب بستی میں زندگی کی گہما گہمی تھی۔ کسی نے کبھی یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی کہ اس کوٹھی میں کون رہتا ہے اور یہاں کیا ہوتا ہے۔ پھر کیسے پتہ چلتا کہ اس کوٹھی کے ایک کمرے میں اسی ملک کے ایک آدمی کو دشمن ملک کے آدمی ایذا رسانی سے قتل کر رہے ہیں۔

یہ آدمی صغیر کو نہیں، بلکہ پاکستان کو فرش پر لٹا کر اور ہاتھوں پر کرسی رکھ کر اس پر

بیٹھ گئے تھے۔ اُس دن کے اخباروں میں بھی برسرِاقتدار اور حزبِ اختلاف کی لڑائیوں، الزام اور بہتان تراشیاں اور ایک دوسرے کو ذلیل و رسوا کرنے کی خبریں نمایاں طور پر چھپی تھیں۔ اس روز بھی پاکستان کے وزیر تقریریں کر رہے تھے اور یوں بازو لہرا رہے تھے جیسے وہ پاکستان کو دنیا کا سب سے زیادہ خوشحال اور طاقتور ملک بنا رہے ہوں۔

اُس روز بھی لوگ گھروں میں بیٹھے ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹ رہے تھے اور پولیس اس کوشش میں تھی کہ کسی ایک بھی واردات کی رپورٹ درج نہ کرے۔

اس روز بھی پاکستانی وی سی آر سے بھارتی فلمیں دیکھ رہے تھے اور ہماری نوجوان نسل سوچ رہی تھی کہ ہندو کتنی پیاری قوم ہے، کتنی پیاری فلمیں بناتی اور پاکستان بھیجتی ہے۔

اُس روز بھی پاکستان میں سیاسی دھینگامشتی اور قومی انتشار کے مظاہرے ہو رہے تھے۔

اور صغیر کے ہاتھوں میں کرسی کے پائے اُترتے جا رہے تھے۔ ابھی تک اس کے منہ سے ہلکی سی سی کی آواز بھی نہیں نکلی تھی۔



میجر عثمان اپنی ڈیوٹی پر بریگیڈ ہیڈ کوارٹر چلا گیا تھا۔ گھر کے فون کی گھنٹی بجی۔ وینا نے ریسیور اٹھایا۔ میجر سمیع بول رہا تھا۔

"کوئی تازہ خبر بھابی!" —— میجر سمیع نے پوچھا۔

"نہیں بھائی جان!" —— وینا نے جواب دیا —— "وہی پرانی خبر ہے جو ہر روز بلکہ ہر رات تازہ ہوتی ہے۔ میں تو اب تنگ آ گئی ہوں بھائی جان! ایک دن بھی اس گھر میں ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا۔ عثمان کا رویّہ تو ایسا ہو گیا ہے جیسے اس نے اپنی زندگی کا مشن بنا لیا ہے کہ مجھے اپنے گھر میں ٹھہرنے نہ دے"۔

"میں پھر وہی بات کہوں گا بھابی!" —— میجر سمیع نے کہا —— "صبر اور اپنے اوپر جبر کریں۔ مجھے امید ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ صورتِ حال آپ کے جذبات کو کیسی بے دردی سے مجروح کر رہی ہے لیکن میں سوچتا ہوں کہ آپ اپنی ازدواجی زندگی کو اس موڑ پر آ کر کیوں ختم کر دیں۔ میں اور کیپٹن آصف عہد کر چکے ہیں کہ عثمان کو واپس لائیں گے"۔

"صبر اور برداشت تو مجھ میں بہت ہے بھائی جان!" —— وینا نے کہا —— "لیکن عثمان مجھ سے بڑا ہی سخت امتحان لے رہا ہے۔ اس نے ابھی تک ایسی بات کہی تو نہیں لیکن اس کا انداز اور رویّہ ایسا ہے جیسے وہ بڑی اونچی آواز میں مجھے کہہ رہا ہو کہ تم یہاں سے نکلو، میں اسے یہاں لاؤں گا۔ میں اس لئے اس گھر میں رُکی ہوئی نہیں کہ میرا اور میرے بچوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا بلکہ اس لئے کہ آپ نے بتایا تھا کہ عثمان جس لڑکی کے قبضے میں آیا ہُوا ہے وہ لڑکی شاید انڈیا کے جاسوسوں کے گروہ کی ہے۔ میں ہر وقت سوچتی رہتی ہوں کہ میں اس لڑکی تک کس طرح پہنچوں اور کس طرح اسے سڑکوں پر گھسیٹوں"۔

"یہ کام ہم نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے" —— میجر سمیع نے کہا —— "بھابی! آپ اس جھنجٹ میں نہ پڑیں۔ خوار ہونے کے سوا آپ کچھ نہیں کر سکیں گی"۔

"میں کچھ نہ کچھ تو ضرور کروں گی بھائی جان!" —— وینا نے کہا —— "پہلے میں رویا کرتی تھی، دن بھر غصہ چڑھا کر اپنا خون پیتی اور کُڑھتی رہتی تھی مگر اب میرا دل مضبوط ہو گیا ہے، شاید اس لئے کہ میں نے اپنے آپ کو یقین دلا لیا ہے کہ میں ایک جنگ لڑ رہی ہوں اور مجھے یہ جنگ جیتنی ہے.... اچھا ہُوا آپ نے فون کر دیا۔ آپ نہ کرتے تو میں آج آپ کو فون کرتی۔ آج شام آپ میرے بھائیوں سے ملنے کے لئے آ سکتے ہیں؟.... میں نے آج عثمان کو بتا دیا تھا کہ میں تین چار بجے اپنے گھر جاؤں گی اور رات کو دس بجے تک واپس آ جاؤں گی۔ گھر میں نوکر ہے۔ وہ عثمان کو کھانا وانا دے دے گا۔ میرے بھائی کئی بار کہہ چکے ہیں کہ وہ آپ سے اور آصف بھائی سے ملنا چاہتے ہیں"۔

"آ جائیں گے بھابی!" —— میجر سمیع نے کہا —— "کہاں آئیں؟.... ایڈریس بتا دیں"۔

وینا نے اسے اپنے والدین کی کوٹھی کا نمبر راستہ اور محل وقوع سمجھا دیا۔

"آپ کیپٹن آصف بھائی کو ساتھ لے کر چار بجے وہاں آ جائیں" —— وینا نے کہا۔



میجر سمیع اور کیپٹن آصف شام چار بجے پہنچ گئے۔ وینا اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ ان کے استقبال کے لئے باہر آ گئی۔ اس کے بھائی بڑے تپاک اور پیار سے سمیع اور آصف سے ملے اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد عثمان کا

موضوع چل پڑا۔ وِینا نے بتایا کہ عثمان رات کو صرف سونے کے لئے گھر آتا ہے اور اس کا رویّہ ایسا ہوتا ہے جیسے وہ مجبوراً "اس گھر میں آتا ہے۔

"اسے تو اپنے بچوں کے ساتھ بھی دلچسپی نہیں رہی" —— وینا نے کہا —— "اب تو صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ مجھ سے اور بچوں سے نفرت کرتا ہے لیکن میں برداشت کر رہی ہوں"۔

"میجر سمیع صاحب!" —— وینا کے بڑے بھائی اختر نے کہا —— "وینا برداشت کرتی رہے، ہمارے لئے عثمان کا یہ رویّہ ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے وہ ہمیں کچھ بھی نہیں سمجھتا اور جیسے ہم اس کا دیا کھاتے ہیں اور اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اب ہم اسے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اس کا جینا حرام کر سکتے ہیں"۔

"اختر صاحب!" —— میجر سمیع نے کہا —— "میں اور کیپٹن آصف اس معاملے کو کسی اور نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے ایم اے خان کی کوٹھی میں رہنے والے لوگ جاسوس یا سمگلر لگتے ہیں۔ یہ بات تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اب اسے کنفرم سمجھیں"۔

"یہ کنفرمیشن کہاں سے ملی ہے؟" —— وینا کے چھوٹے بھائی امجد نے پوچھا۔

"ہم دونوں ساتھ والی کوٹھی میں گئے تھے" —— میجر سمیع نے کہا —— "وہاں ایک پرانا ریٹائرڈ صوبیدار میجر رہتا ہے۔ اس کے ساتھ میری یہ ملاقات دوسری تھی۔ پہلی ملاقات میں جو محض اتفاقیہ تھی، اس صوبیدار میجر نے شک کا اظہار کیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ دوسری ملاقات میں اس نے بتایا ہے کہ یہ لوگ مشکوک ہیں اور یہاں کوئی بہت بڑا جرم ہو رہا ہے لیکن ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ انڈیا کے جاسوس ہیں یا مہذب قسم کی عصمت فروشی کرتے ہیں"۔

"وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں میجر صاحب!" —— اختر نے کہا —— "میں نے ایک طریقہ سوچا ہے۔ اس لڑکی کو اغوا کر لیا جائے اور ایک جگہ بند کر کے معلوم کیا جائے کہ یہ کون ہے اور کرتی کیا ہے"۔

"پھر آپ اس لڑکی کا کیا بنائیں گے؟" —— کیپٹن آصف نے پوچھا۔

"اگر آپ مجھ سے متفق ہوں تو پھر سوچیں گے کہ اس لڑکی کا ہم کیا بنائیں گے" —— اختر نے کہا —— "ضرورت محسوس ہوئی تو ہم اس لڑکی کو بالکل ہی غائب کر دیں

گے"۔

ان کے درمیان اغوا کی سکیم پر بحث مباحثہ ہوتا رہا اور چاروں متفق ہو گئے۔ میجر سمیع نے پوچھا کہ لڑکی کو رکھا کہاں جائے گا۔ وینا کے دونوں بھائیوں نے کہا کہ ان کے پاس بڑی اچھی ایک جگہ ہے۔

یہ لوگ اچھی خاصی جائداد والے تھے۔ شہر کے قریبی مضافات میں ان کا کچا سا ایک مکان بھی تھا جو آبادی سے کچھ الگ تھلگ تھا۔ کسی وقت ان کی وہاں کچھ زمین تھی جہاں انہوں نے سبزیوں کا باغ بنا رکھا تھا اور سبزیاں منڈی میں جاتی تھیں۔ پھر انہوں نے وہاں فصل اگانی شروع کر دی اور چھوٹا سا یہ کچا مکان جو باغ کی دیکھ بھال کرنے والوں کے لئے بنایا تھا خالی پڑا تھا۔

ان چاروں نے اغوا کا طریقہ طے کر لیا۔ ضروری نہیں تھا کہ یہ طریقہ کامیاب ہو جاتا لیکن کوشش کرنی تھی۔

"یہ سوچ لیں اختر صاحب!" —— میجر سمیع نے کہا —— "ہم دونوں ہر حال میں آپ کا ساتھ دیں گے لیکن طریقہ کچھ کچا سا لگتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ہم کامیاب ہو جائیں"۔

"آپ ڈر تو نہیں رہے میجر صاحب؟" —— وینا کے چھوٹے بھائی نے پوچھا۔

"میں کمانڈو ہوں" —— میجر سمیع نے کہا —— "اگر میں ڈرپوک ہوتا تو کمانڈو ٹریننگ کے لئے جانے سے انکار کر دیتا.... اگر آپ کو یہ شک ہے کہ میں ڈر رہا ہوں تو میں اب کچھ بھی نہیں کہوں گا اور جو ڈیوٹی آپ نے مجھے سونپی ہے وہ پوری کر کے دکھاؤں گا"۔



اگلی شام سٹیڈیم کے قریب میجر سمیع کی گاڑی کھڑی تھی۔ کیپٹن آصف اس کے ساتھ تھا۔ میجر سمیع نے گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی تھی جہاں سے وہ اس چھوٹی سی ریسٹورنٹ "لورز اِن" کو دیکھ سکتے تھے لیکن وہ وہاں سے کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ عثمان لوسی کے ساتھ اس ریسٹورنٹ کے اندر تھا۔ میجر سمیع نے انہیں اس ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔

میجر سمیع اور آصف انتظار کرتے رہے۔ وہیں قریب ہی ایک اور کار کھڑی تھی جس

میں وینا کے دونوں بھائی، اختر اور امجد، بیٹھے ہوئے تھے۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد عثمان اور لوسی ریسٹورنٹ سے باہر آئے۔ اب سمیع اور آصف کی ڈیوٹی تھی کہ عثمان اور لوسی کے پاس جانا تھا اور اغوا کی سکیم کی پہلی کارروائی کرنی تھی لیکن عثمان اور لوسی بڑی تیزی سے گاڑی میں بیٹھے اور اسی تیزی سے گاڑی سمیت غائب ہو گئے۔ سمیع اور آصف کو ان تک پہنچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔

اگلی شام انہوں نے پھر میجر عثمان کا تعاقب کیا۔ اُس شام وہ ایم اے خان کی کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ سمیع اور آصف کوٹھی سے تھوڑی ہی دُور گاڑی کھڑی کر کے گاڑی میں ہی انتظار کرتے رہے۔ کچھ دور اختر اور امجد اپنی کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

انہیں معلوم نہیں تھا کہ عثمان اور لوسی کوٹھی میں ہی رہیں گے یا کہیں باہر جائیں گے۔ وہ اپنی اپنی جگہ انتظار کرتے رہے۔ یہ انتظار بڑا ہی صبر آزما تھا۔ انہیں پریشانی یہ تھی کہ ایسا نہ ہو عثمان کوٹھی میں ہی وقت گذار کر اکیلا نکلے اور لوسی باہر نہ آئے۔ اس صورت میں وہ اپنی سکیم میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ عثمان کی گاڑی کوٹھی سے نکلی۔ سمیع اور آصف نے دیکھا کہ لُوسی بھی اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر موجود تھی۔ وقت رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ تھا۔ خوش قسمتی سے عثمان نے گاڑی اُس طرف موڑی جدھر میجر سمیع اور کیپٹن آصف گاڑی روک کر باہر کھڑے تھے۔

عثمان کی گاڑی قریب آئی تو میجر سمیع نے آگے ہو کر اسے روک لیا۔ میجر عثمان کو تو ذرا سا بھی شک نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ڈرامہ کھیلا جانے والا ہے۔ اس نے گاڑی سڑک کی سائیڈ پر کر کے روک لی اور اپنے دوستوں کو دیکھ کر بڑی تیزی سے باہر نکلا۔

"تمہارے انتظار میں کھڑے ہیں یار!" —— میجر سمیع نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ بہت پریشان ہو۔ اس کی آواز میں ذرا سا بھی جوش و خروش نہیں تھا۔

"کیا بات ہے یار؟" —— میجر عثمان نے چونک کر پوچھا —— "یُو لُک سو ڈیپریسڈ وَٹ اِز رانگ!"

"کیا بتاؤں بھائی!" —— میجر سمیع نے کہا۔

"کم آن سپیک اَپ یار!" —— میجر عثمان نے کہا۔

"ذرا ادھر آ جاؤ" —— میجر سمیع نے میجر عثمان کو بازو سے پکڑا اور جدھر عثمان کی

گاڑی کھڑی تھی اس کی اُلٹی طرف لے گیا۔ کہنے لگا —— "ذرا دور آ کر بات سنو، اب تو صرف بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میری مدد کر سکتا ہے۔ یہ کام تم کروا سکتے ہو"۔

میجر سمیع نے ایک قصہ گھڑ رکھا تھا جو اس نے عثمان کو سنانا شروع کر دیا۔ اس نے اپنی ایک مشکل بیان کی اور کہا کہ اس کی مدد نہ کی گئی تو اس کا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔ میجر عثمان کو میجر سمیع نے بڑے ہی پُراسرار طریقے سے اپنی بات میں اُلجھا لیا اور آہستہ آہستہ اس کی کار سے خاصا دُور لے گیا۔

اختر اور امجد نے گاڑی سٹارٹ کی اور اُس طرف چلے گئے جہاں لوسی اکیلی عثمان کی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ پھر انہوں نے گاڑی عثمان کی گاڑی کے قریب جا روکی۔ اختر گاڑی سے نکلا اور عثمان کی گاڑی کے اُس طرف ہو گیا جس طرف لُوسی بیٹھی تھی۔

"ایکس کیوزمی مِس" —— اختر نے بڑے ہی مہذب لہجے میں کہا —— "میرے ساتھ ایک صاحب لِفٹ لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ یہ ایک پرائیویٹ کلینک کا ایڈریس معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی اور میں انہیں مایوس بھی نہیں کرنا چاہتا لیکن کچھ پتہ بھی نہیں چل رہا کہ یہ کون سا کلینک پوچھ رہے ہیں۔ اگر آپ خود ہی ان سے پوچھیں تو شاید آپ کچھ مدد کر سکیں"۔

کسی جوان لڑکی کو اُس کی گاڑی سے نکالنے کے لئے اتنی سی بات کافی نہیں تھی جو اختر نے کی تھی لیکن لُوسی عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی اور ویسے بھی تیز طرار تھی۔ وہ گاڑی سے نکل آئی۔ اختر نے ایک بار پھر اُس سے معذرت کی کہ وہ اُسے زحمت دے رہا ہے۔ لڑکی کو یہ تاثر ملا کہ یہ کوئی شریف اور مہذب آدمی ہے۔ وہ اختر کی گاڑی کے قریب جا پہنچی۔ امجد جو اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا گاڑی سے نکل آیا۔ اس نے پچھلے دروازے کا لاک کھول رکھا تھا۔

میجر عثمان میجر سمیع کی بات سن رہا تھا اور اُسے تسلی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کی طرف دیکھا۔

"وہ کون ہیں!" —— اس نے کہا —— "کیا کر رہے ہیں"۔

اتنی دور سے اختر اور امجد کو پہچاننا مشکل تھا۔

"کوئی نہیں یار!" —— میجر سمیع نے کہا —— "تمہاری فرینڈ کے کوئی جاننے والے

ہوں گے"۔

کیپٹن آصف نے بھی کوئی بات کہہ کر عثمان کی توجہ اس کی گاڑی کی طرف سے ہٹا لی۔

لوسی جب اختر کی گاڑی کے قریب پہنچی تو امجد نے آہستہ سے پچھلا دروازہ کھولا پھر دونوں بھائیوں نے بڑے آرام سے لوسی کو اندر پھینک دیا۔ امجد بڑی تیزی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا اور سیٹ پر گری ہوئی لوسی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اختر اتنی دیر میں سٹیئرنگ پر بیٹھ چکا تھا اور گاڑی چل پڑی۔

میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے ادھر دیکھا کہ اختر اور امجد جا چکے ہیں تو وہ آہستہ آہستہ واپس ہوئے۔ جب عثمان کی گاڑی تک پہنچے تو لُوسی لاپتہ تھی۔

"کہاں گئی؟" ــــ میجر عثمان نے گھبرا کر پوچھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا' پھر بولا ــــ "گھر نہ چلی گئی ہو لیکن وہ جاتی تو ہمارے قریب سے گزرتی"۔

"اب بھی کچھ سنبھلو عثمان یار!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "اسے کوئی اور بوائے فرینڈ مل گیا اور اس کے ساتھ چلی گئی"۔

"نو" ــــ میجر عثمان نے سخت غصیلی آواز میں کہا ــــ "آئی ڈونٹ بی لیو اِٹ۔ وہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتی"۔

میجر عثمان باؤلا ہُوا جا رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ کیا کرے۔

"میں تھانے میں رپورٹ لکھواؤں گا" ــــ میجر عثمان نے کہا۔

"تمہارا مینٹل بیلنس تو بالکل ہی اُلٹ گیا ہے یار!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "کیا لکھواؤ گے کہ وہ تمہاری کیا لگتی ہے؟ تم تو یوں باتیں کرتے ہو جیسے وہ اغوا ہو گئی ہو۔ ہم تمہیں اتنے عرصے سے کیا سمجھا رہے ہیں۔ یہ لڑکی اُڑتا پنچھی ہے۔ اپنے اُس فرینڈ کے ساتھ چلی گئی ہو گی جو اسے تم سے زیادہ مال کھلاتا ہو گا"۔

عثمان کا غصہ تو ٹھنڈا نہ ہُوا' البتہ وہ پاگلانہ سی جو حرکتیں کر رہا تھا وہ رک گئیں۔

"ہوش میں آؤ عثمان بھائی!" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "ہم اس لڑکی کے متعلق بہت کچھ معلوم کر چکے ہیں۔ سمیع بھائی نے ٹھیک کہا ہے کہ یہ اُڑتا پنچھی ہے اور اس کی دلچسپی جسے تم محبت کہتے ہو' اس عیش موج سے ہے جو تم اسے کرواتے ہو' تمہاری ذات کے ساتھ اسے ذرا سا بھی لگاؤ نہیں"۔

"شٹ اَپ یُو ایڈیٹ!" ــــ میجر عثمان نے زمین پر زور سے پاؤں مارتے ہوئے کہا ــــ "شی لوز می"۔

"کُول ڈاؤن بوائے' کُول ڈاؤن" ــــ میجر سمیع نے عثمان کو اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے بڑے پیار سے کہا ــــ "چلو آؤ ہمارے ساتھ۔ تمہیں اسی ہوٹل میں کافی پلائیں گے"۔

میجر عثمان کی ذہنی حالت بگڑتی چلی گئی اور بگڑی بھی اس حد تک کہ انگریزی بولتے بولتے اس نے پنجابی میں واہی تباہی بکنی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اپنے ان دونوں دوستوں کو بھی خالص پنجابی میں بُرا بھلا کہہ ڈالا لیکن دوست چونکہ اس ڈرامے کے کردار تھے اس لئے وہ ہنستے مسکراتے رہے اور اسے یہی تاثر دیتے رہے کہ جس پر اس نے اپنے اتنے پیارے گھر کی خوشیاں قربان کر دی ہیں وہ کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہے۔ میجر عثمان اس تاثر کو تسلیم نہیں کر رہا تھا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ دل سے اس نے اس صورتِ حال کو قبول کر لیا ہے۔

کچھ دیر بعد عثمان کا غصہ سمٹ سمٹا کر لُوسی پر مرکوز ہو گیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ تسلیم کر رہا ہے کہ لُوسی اسے جُل دے گئی ہے۔ اب وہ مرد کی فطرت کے ایک مخصوص پہلو کو اجاگر کر رہا تھا۔ یہ رقابت کا پہلو تھا اور یہ انا کا مسئلہ تھا۔ کسی مرد کی محبت یا چاہت کسی معمولی سی شکل و صورت کی عورت کے ساتھ ہو جائے اور وہ عورت اس کے ہاتھ سے نکل جائے تو اس مرد کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسی دنیا کی حسین ترین عورت اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہو۔ یہ حالت اب عثمان کی ہو رہی تھی۔

"دیکھو عثمان!" ــــ میجر سمیع نے اسے سنجیدگی سے کہا ــــ "ہمارے ساتھ نہیں چلتے تو اپنے گھر جاؤ اور ٹھنڈے دل سے سوچو۔ تم تو اس قسم کی حرکتوں اور باتوں پر اتر آئے ہو جو پنجابی فلموں کے ہیرو سے کرائی جاتی ہیں۔ تم میجر ہو اور تم ہائی کلاس سوسائٹی کے معزز خاندان کے فرد ہو۔ اپنی سطح سے نہ گرو۔ تمہاری فرینڈ کو کسی نے اغوا نہیں کیا اور نہ کوئی ایسی جرأت کر سکتا ہے کہ سب کے سامنے کوئی کسی لڑکی کو زبردستی گاڑی میں ڈال کر لے جائے"۔

کیپٹن آصف نے بھی اسے بڑی سنجیدگی اور بڑے پیار سے سمجھایا۔ کیپٹن آصف کوئی نوجوان آرمی آفیسر نہیں بلکہ سینئر کیپٹن تھا اور میجر ہونے والا تھا۔ وہ آخر عثمان کے

مخلص دوست تھے۔ ان کی باتوں کو اس نے قبول کرنا شروع کر دیا اور ان کے کہنے پر اپنے گھر چلا گیا۔

○

میجر سمیع اور کیپٹن آصف گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔ ان کا رخ اختر اور امجد کی کوٹھی کی طرف تھا۔ انہوں نے وینا کے ان دونوں بھائیوں سے مل کر اس ڈرامے کا اگلا پارٹ کھیلنا تھا۔

اختر اور امجد لُوسی کو اپنی کوٹھی میں لے گئے۔ چار کنال کی کوٹھی تھی جس کے بے شمار کمرے تھے۔ امجد نے راستے میں لوسی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ پٹی باندھنے سے پہلے اس نے لوسی کو ریوالور دکھایا اور کہا تھا کہ اس نے اونچی آواز نکالی یا کوئی اور حرکت کی تو اسے گولی مار کر لاش غائب کر دی جائے گی۔ لوسی چپ ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پاکستان میں قتل ایک عام سی واردات سمجھا جاتا ہے جہاں سڑکوں پر آدمی قتل ہو جاتا ہے اور قاتل ہوائی فائر کرتے ہوئے لوگوں کے سامنے غائب ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی پکڑے نہیں جاتے۔

ان دونوں بھائیوں کی گاڑی اپنی کوٹھی کے پہلو کی طرف جا رکی۔ انہوں نے لوسی کو نکالا اور اس طرف کے دروازے سے اندر چلے گئے جو وہ اندر سے پہلے ہی کھول کر گئے تھے۔ ان کے والدین کوٹھی کے کسی دوسرے کونے کے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔

لوسی کو انہوں نے صوفے پر بٹھا دیا اور آنکھوں پر کپڑا بندھا رہنے دیا۔

"مجھے ایک بات بتا دو" ــــ لوسی نے پوچھا ــــ "کیا تم مجھے اپنے لئے لائے ہو یا میرے گھر والوں سے تاوان مانگ کر مجھے چھوڑ دو گے؟"

"دونوں باتیں غلط ہیں" ــــ اختر نے کہا ــــ "تمہارے جسم کے ساتھ ہمیں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں"۔

"تمہارے جسم سے ہمیں نفرت ہے" ــــ چھوٹا بھائی امجد بولا ــــ "یہ ایک ناپاک جسم ہے جسے اس گھر میں زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکیں گے"۔

باہر ایک گاڑی کا ہارن دو بار بجا۔ اختر نے امجد کی طرف دیکھا۔ امجد باہر نکل گیا۔ میجر سمیع کی گاڑی گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ امجد نے گاڑی اندر لانے کا اشارہ کیا اور گاڑی اندر آ گئی۔ میجر سمیع اور کیپٹن آصف اُترے اور امجد انہیں کمرے میں لے گیا۔

اب اس کمرے میں چار آدمی ہو گئے۔ چاروں کمرے کے ایک کونے میں جا کھڑے ہوئے۔ اختر کے پوچھنے پر سمیع اور آصف نے بتایا کہ میجر عثمان کا ردِّ عمل کیا تھا اور پھر یہ بتایا کہ وہ اپنے گھر چلا گیا ہے۔

"پہلے ٹیلی فون کرواتے ہیں" ــــ اختر نے سرگوشی میں میجر سمیع سے کہا۔

"ابھی نہیں" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "فون تو کروانا ہی ہے لیکن اس سے کچھ باتیں کر لی جائیں"۔

وینا اپنے گھر آئی تھی اور رات دس بجے کے لگ بھگ واپس چلی گئی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" ــــ میجر سمیع نے لوسی سے پوچھا۔

"لبنیٰ سعید!" ــــ لڑکی نے جواب دیا ــــ "نِک نیم لُوسی ہے"۔

"تمہارے فادر کون ہیں؟"

"ایم اے خان" ــــ لوسی نے جواب دیا۔

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"ریٹائرڈ لائف گذار رہے ہیں" ــــ لُوسی نے جواب دیا ــــ "پہلے زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اب یہیں رہتے ہیں"۔

"بھائی ہیں؟"

"تین بھائی ہیں" ــــ لُوسی نے جواب دیا۔

"کیا کرتے ہیں؟"

"آپ لوگوں کا مطلب کیا ہے؟" ــــ لوسی نے رندھی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

"ہمارا مطلب وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "ہم تمہارے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ تم جو کچھ بتاؤ گی' اس کی ہم تصدیق کریں گے۔ اگر تمہارا جواب غلط نکلا تو پھر میں بتا نہیں سکتا تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا"۔

"میری ایک بات مانو" ــــ لُوسی نے کہا ــــ "میں تمہارے قبضے میں ہوں اور دیکھو میں کتنی خوبصورت لڑکی ہوں۔ جتنے دن چاہو مجھے اپنے پاس رکھ لو اور اگر تمہیں پیسے چاہئیں تو کسی آدمی کو میرے گھر بھیج دو۔ جتنی رقم مانگو گے تمہیں وہاں سے مل جائے گی"۔

"میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں" ــــ اختر نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا ــــ "ہمیں

نہ تمہاری خوبصورتی کے ساتھ کوئی دلچسپی ہے نہ روپے پیسے کے ساتھ"۔

"پھر اور کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" ـــ لوسی نے بڑی پختہ آواز میں پوچھا۔ پھر کہنے لگی ـــ "میری آنکھیں تو کھول دو"۔

"تمہاری آنکھیں خود بخود کھل جائیں گی" ـــ میجر سمیع نے کہا ـــ "میجر عثمان کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟"

"وہ میرا فرینڈ ہے، تم لوگ جانتے ہو فرینڈ سے تعلقات کیسے ہوتے ہیں"۔

"ناجائز" ـــ اختر بولا ـــ "پوری بات بتاؤ۔ کیا تم اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"میں نہیں" ـــ لوسی نے جواب دیا ـــ "وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے"۔

"دیکھ لڑکی!" ـــ میجر سمیع نے کہا ـــ "ہم سیدھی سیدھی بات کرتے ہیں۔ تم لوگ مہذب قسم کی عصمت فروشی کر رہے ہو اور تم عثمان کا مال دونوں ہاتھوں سے کھا رہی ہو۔ فوراً" مان جاؤ اور عثمان کا ساتھ چھوڑ دو"۔

یہ لڑکی اگر عصمت فروش تھی بھی تو وہ اپنی زبان سے یہ تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ وہ ایک معزز خاندان کی لڑکی ہے اور اس خاندان میں روشن خیالی اور عورتوں کی آزادی کچھ زیادہ ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ عثمان سے نہیں کھاتی بلکہ اسے کھلاتی پلاتی ہے۔

"چلو ہم مان لیتے ہیں" ـــ میجر سمیع نے کہا ـــ "لیکن تم کچھ اور بھی ہو۔ جب تک وہ نہیں بتاؤ گی، ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے"۔

لڑکی اتنی کچی نہیں تھی کہ وہ فوراً" ہی بتا دیتی۔ وہ انڈین انٹیلی جنس کی تربیت یافتہ لڑکی تھی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر سے اس کی ٹریننگ شروع ہوئی تھی اور نہ جانے کب سے اس میدان میں عملی کام کر رہی تھی۔

میجر سمیع، اختر، کیپٹن آصف اور امجد نے سوال و جواب کے ذریعے پورا زور لگا لیا کہ یہ لڑکی کچھ بتا دے لیکن وہ تو قلعے کی طرح مضبوط تھی۔ اختر اور امجد کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ لڑکی عثمان کے ساتھ تعلقات توڑ لے لیکن میجر سمیع اور کیپٹن آصف کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ یہ دونوں آرمی آفیسر اس لڑکی کی کوٹھی کے پڑوس میں رہنے والے ریٹائرڈ صوبیدار میجر سے دو دفعہ مل چکے تھے۔ اس صوبیدار میجر نے چوری

چھپے اس کوٹھی کی اندر کی دنیا کو دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے اس کے سوا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ یہ لوگ مشکوک ہیں اور یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ ایک سنگین جرم ہے۔

صوبیدار میجر جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس نے میجر سمیع کو پہلی ملاقات میں بتایا تھا کہ وہ انگریزوں کے دور میں ملٹری انٹیلی جنس میں رہ چکا ہے اور اس نے انگریز افسروں کے ساتھ کام کیا ہے۔ اس نے بعد کی ملاقاتوں میں میجر سمیع اور کیپٹن آصف کو بتایا تھا کہ یہ لوگ سمگلر نہیں ہو سکتے کیونکہ یہاں کبھی کوئی ٹرک، پک اپ یا جیپ نہیں آئی۔ یہ تین قسم کی گاڑیاں سمگلروں کے پاس لازمی طور پر ہوتی ہیں۔

صوبیدار میجر نے اُن افراد کو دیکھا تھا جو اس کوٹھی میں آتے جاتے تھے اور اس نے مندر آہوجا کو بھی دیکھا تھا جو ایم اے خان بنا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا بظاہر کوئی کاروبار نہیں تھا۔ صوبیدار میجر نے میجر سمیع اور کیپٹن آصف کو اپنی آخری رائے یہ دی تھی کہ یہ کوٹھی انڈین انٹیلی جنس کا خفیہ اڈہ معلوم ہوتی ہے۔

سیدھی سی بات تھی کہ یہ دونوں آرمی آفیسر پاکستان کے ملٹری انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) کو بتا دیتے کہ اس کوٹھی پر چھاپہ ماریں یا نظر رکھیں لیکن نہ بتانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ یقین کر لینا چاہتے تھے کہ یہ بھارتی جاسوسوں کا اڈہ ہے اور دوسری وجہ یہ کہ انٹیلی جنس والوں کو یقین بھی ہو جائے کہ فلاں شخص دشمن کا جاسوس ہے یا فلاں گھر دشمن کے جاسوسوں کا اڈہ ہے تو انٹیلی جنس فوراً" اس آدمی کو گرفتار نہیں کر لیتی نہ اس گھر پر فوراً" چھاپہ مارتی ہے۔ اگر وہ ایسا کریں تو اس گروہ کے جسے رِنگ کہا جاتا ہے، دوسرے ارکان غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسے آدمی اور ایسے ٹھکانے پر کچھ عرصہ نظر رکھی جاتی ہے اور نوٹ کیا جاتا ہے کہ یہ آدمی کہاں کہاں جاتا ہے اور کس کس سے ملتا ملاتا ہے اور اس ٹھکانے میں کون کون آتا جاتا ہے۔ یہ ساری معلومات حاصل کر کے کوئی کارروائی کی جاتی ہے۔

میجر سمیع اور کیپٹن آصف کو انٹیلی جنس کا یہ طریقہ معلوم تھا۔ وہ آئی ایس آئی کے لئے زمین ہموار کر کے اطلاع دینا چاہتے تھے۔ اب لڑکی ان کے ہاتھ آ گئی تھی اور انہیں توقع تھی کہ یہ لڑکی اقبال جرم کر لے گی اور وہ آئی ایس آئی سے اگلی کارروائی کرائیں گے لیکن لڑکی نے ایسے انداز اختیار کر لئے کہ وہ موم کی گڑیا کی بجائے ایسا پتھر بن گئی جسے

توڑنا محال نظر آ رہا تھا۔

میجر سمیع، اختر، امجد اور کیپٹن آصف کو کمرے کے ایک کونے میں لے گیا۔

"اختر صاحب!" — میجر سمیع نے کہا — "آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میرے مسئلے سے آپ واقف ہیں۔ مجھے اس کا حل بھی نکالنا ہے"۔

"ایکس کیوز می!" — کیپٹن آصف نے معذرت کرتے ہوئے کہا — "ہمارا یعنی آئی ایس آئی کا مسئلہ حل ہو گیا تو پھر اختر صاحب کا کام تو اور زیادہ پکا ہو جاتا ہے۔ لڑکی آئی ایس آئی کے قبضے میں چلی جائے گی اور عثمان بھیا اسے ڈھونڈتے پھریں گے"۔

"آپ دونوں صاحبان جو مناسب سمجھتے ہیں کریں" — اختر نے کہا — "ہم دونوں بھائی ہر طرح آپ کے ساتھ ہیں" — اس نے میجر سمیع کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا — "لڑکی کو قتل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ کام ایسے طریقے سے ہو گا کہ اس کا سراغ بھی نہیں ملے گا"۔

"وہ دیکھ لیں گے اختر صاحب!" — میجر سمیع نے کہا — "آپ ٹیلی فون لے آئیں"۔

امجد ٹیلی فون لانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔



ٹیلی فون آ گیا جو لڑکی کے پاس رکھ دیا گیا۔

"دیکھ لڑکی!" — میجر سمیع نے لوسی سے کہا — "ہم عثمان کا نمبر ملائیں گے اور ریسیور تمہیں دے دیں گے۔ تم نے عثمان سے یہ کہنا ہے کہ میرا ایک پرانا فرینڈ امریکہ سے آ گیا تھا۔ وہ اچانک سڑک پر مل گیا۔ تم اپنے دوستوں کے ساتھ گاڑی سے ذرا دور چلے گئے تھے۔ اس فرینڈ نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں اسے ٹال نہیں سکتی تھی اس لئے اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ تم ناراض تو ضرور ہو گے لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی.... تم یہ باتیں عثمان کے ساتھ کرو اور وہ تمہیں جو کچھ کہے اس کا جواب اس طرح دو کہ تمہیں عثمان کی بجائے یہ فرینڈ زیادہ عزیز ہے اور تم اس کی فرینڈ شپ نہیں چھوڑ سکتیں"۔

"میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ہوں" — لُوسی نے ایسے لہجے میں کہا جس میں ذرا سا بھی ڈر یا خوف نہیں تھا۔ کہنے لگی — "تم لوگ چاہتے ہو کہ میں عثمان کے ساتھ

تعلقات توڑ لوں۔ میں تمہارا یہ کام کر دوں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ عثمان سے نہیں ملوں گی۔ اس کے عوض مجھ پر یہ کرم کرو کہ مجھے چھوڑ دو"۔

"چھوڑ دیں گے" — میجر سمیع نے کہا — "تم نے دیکھ لیا ہے کہ ہم نے تمہارے جسم کو سوائے آنکھوں پر پٹی باندھنے کے چھُوا تک نہیں۔ ہم تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کریں گے"۔

"وہ تو میں نے دیکھ لیا ہے" — لوسی نے کہا — "حالانکہ میں نے اپنا آپ پیش بھی کر دیا تھا.... نمبر ملاؤ"۔

میجر سمیع نے عثمان کا نمبر ملایا اور لوسی کے ہاتھ میں ریسیور دے کر کہا کہ رِنگ جا رہی ہے۔ لوسی نے ریسیور لے لیا۔

عثمان گھر پہنچ چکا تھا اور غصے سے باؤلا ہُوا جا رہا تھا۔ گھر میں صرف وینا تھی جس پر غصہ نکال سکتا تھا۔ اس نے روز مرّہ کی طرح کوئی وجہ پیدا کر لی اور وینا کے ساتھ ایسا شدید قسم کا لڑائی جھگڑا شروع کر دیا جو اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ وینا پر ایسی ایسی الزام تراشیاں کر رہا تھا جیسے وینا زبردستی اس کی بیوی بن گئی تھی اور اسے وینا نے اس کمرے میں قید کر لیا تھا۔

وینا پہلے تو برداشت کرتی رہی آخر وہ بھی پھٹ پڑی اور اس نے عثمان کو کھری کھری سنا ڈالیں۔ عثمان نے اسے طلاق تک کی دھمکی دی جس کا وینا نے یہ جواب دیا کہ طلاق لے کر میں اپنے آپ کو ایک خوش قسمت عورت سمجھوں گی۔

"میری بات سن رہے ہو عثمان!" — وینا نے کہا — "میں تو خود تم سے علیحدگی چاہتی ہوں لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تم کس انجام کی طرف گھسیٹے ہوئے جا رہے ہو۔ میں تمہیں اس انجام سے بچا رہی ہوں۔ اس سے زیادہ خلوص اور کیا ہو گا۔ آزما کر دیکھ لو، طلاق نہ دو، میں گھر چلی جاتی ہوں۔ ایک دن آئے گا تم پریشان حال میرے پاس آؤ گے اور ہاتھ جوڑ کے کہو گے وینا اپنے گھر چلو.... وہ جو کوئی بھی ہے، اُس نے تمہارے دل اور دماغ پر بدروحوں کی طرح قبضہ کر رکھا ہے۔ اسے تمہاری ذات کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ اسے تمہارے پیسے اور اس عیش و عشرت کے ساتھ دلچسپی ہے جو تم اسے کراتے ہو۔ جس روز اسے تم سے زیادہ عیش کرانے والا آدمی مل گیا وہ تمہارے منہ پر تھوک کر تمہیں پہچاننے سے انکار کر دے گی"۔

غصے سے عثمان کے دانت بجنے لگے۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ وینا کا گلا گھونٹ دے گا۔ غصے نے اسے اس قدر پاگل کر دیا تھا کہ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ وینا کا گلا گھونٹ ہی دیتا لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور عثمان ٹیلی فون کی طرف لپکا اور ریسیور اٹھایا۔ لوسی بول رہی تھی۔

"کہاں ہو تم؟" —— عثمان نے پوچھا۔

لُوسی نے وہ ساری باتیں عثمان سے کہہ ڈالیں جو میجر سمیع نے اسے کہی تھیں۔ عثمان نے اسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ بے وفا سے لے کر بیسوا تک کہا۔ پھر ایک دو گالیاں بھی دے ڈالیں۔ لوسی نے اسے یہ آخری فیصلہ سنا کر کہ وہ آئندہ اسے نہیں ملے گی فون بند کر دیا۔ عثمان نے ریسیور کچھ دیر ہاتھ میں پکڑے رکھا اور پھر اتنی زور سے ریسیور کو فون پر رکھا کہ اس دھماکے سے وینا بدک گئی۔

وِینا سمجھ گئی کہ اس کے بھائیوں اور سمیع اور آصف نے کوئی ڈرامہ کھیلا ہے اور وہ لڑکی ان کے ہاتھ آ گئی ہے۔ وینا کو توقع تھی کہ عثمان اب اس پر اور زیادہ برسے گا لیکن عثمان سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وینا اسے دیکھتی رہی۔ عثمان کہنیاں گھٹنوں پر اور سر ہاتھوں پر رکھے بیٹھا رہا جیسے اس سے ہتھیار ڈلوا لئے گئے ہوں۔

وِینا اٹھی اور آہستہ آہستہ عثمان کے پاس پہنچی۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور اس کا چہرا اوپر اٹھایا۔

"اٹھو" —— اُس نے رُوٹھے ہوئے بچّے کو منانے کے پیارے انداز سے عثمان سے کہا —— "سو جاؤ' مجھے ہمدرد اور ہمراز سمجھو اور اپنی پریشانی مجھے بتاؤ"۔

وِینا نے دیکھا کہ عثمان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وینا نے اسے اٹھایا پھر اس کا سلیپنگ سوٹ الماری سے نکال کر اس کے ہاتھ میں دیا۔ عجیب بات یہ نظر آ رہی تھی کہ عثمان بالکل ہی سرد ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے کپڑے بدلے اور لیٹ گیا اور وِینا اس کے بالوں میں اپنی خوبصورت انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔

عثمان نے وہ رات کروٹیں بدلتے اور تڑپتے گذاری۔



میجر عثمان تو بڑے آرام دہ بستر اور بڑے خوبصورت پلنگ پر تڑپ رہا تھا لیکن لُوسی کچے فرش پر بچھے ہوئے ایک کمبل پر تڑپ رہی تھی۔ یہ اختر اور امجد کی کوٹھی نہیں تھی بلکہ یہ ایک

نیم کچّا مکان تھا۔ یہ مکان اُس وقت بنایا گیا تھا جب ان لوگوں کا یہاں سبزیوں کا باغ ہُوا کرتا تھا۔ پھر باغ اُجڑا اور یہ مکان خالی پڑا رہ گیا۔ اس مکان کے اردگرد کچھ کھیتیاں اور کچھ جگہ ویران تھی۔ یہ جگہ اختر کے خاندان کی تھی۔

لوسی سے عثمان کو فون کروا کے اسے یہ کہا گیا کہ اسے گھر لے جایا جا رہا ہے لیکن گھر لے جانے کی بجائے اس کمرے میں بند کر دیا گیا اور اسے کہا گیا کہ وہ در پردہ جو کچھ ہے وہ بتا دے لیکن وہ کچھ بھی بتانے پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا اور اختر نے اپنے گھر کا جواں سال نوکر برآمدے میں بٹھا دیا۔ لُوسی کی آنکھوں سے پٹی اتار کر منہ پر باندھ دی گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں رسّیوں سے باندھ دیئے گئے تھے۔ نوکر کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ صبح باہر کے دروازے کو تالا لگا کر سائیکل پر گھر سے یعنی اختر کی کوٹھی سے ناشتہ لائے اور اس طرح دوپہر اور شام کا کھانا بھی لے آیا کرے اور لڑکی کا منہ کھول کر اسے کھانا کھلا دیا کرے۔

اگلے روز نوکر نے لوسی کو اسی طرح ناشتہ کرایا اور کھانا بھی کھلایا۔ لڑکی نے اس سے بارہا پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور یہ جگہ کیا ہے اور شہر سے کتنی دُور ہے لیکن نوکر نے اسے کچھ بھی نہ بتایا۔

عثمان اپنے آفس گیا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ آفس کا وقت ختم ہُوا تو وہ ایم اے خان کی کوٹھی میں گیا۔ اس نے لوسی پر اچھا خاصا پیسہ تباہ کیا تھا۔ ایم اے خان کو جو دراصل مہندر آہوجا تھا' لوسی کا باپ اور وہاں کی ایک عورت کو لوسی کی ماں سمجھتا تھا۔ وہ ان سے ملنا چاہتا تھا۔

"آؤ عثمان!" —— مہندر نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا —— "لُوسی کہاں ہے؟"

"یہی تو میں پوچھنے آیا ہوں" —— عثمان نے کہا —— "رات وہ میرے ساتھ نکلی۔ مجھے دو دوست مل گئے۔ میں ان کی ایک ضروری بات سننے کے لئے گاڑی سے کچھ دور چلا گیا۔ ایک گاڑی میری گاڑی کے قریب آ کر رکی۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی اس گاڑی سے نکلا۔ لوسی اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ آدمی لوسی تک گیا اور لوسی گاڑی سے نکلی اور اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی اور گاڑی چلی گئی۔ رات تقریباً ایک بجے لوسی کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ وہ اپنے ایک پرانے فرینڈ کے ساتھ چلی گئی تھی"۔

میجر عثمان نے مہندر کو وہ ساری باتیں سنائیں جو لوسی نے اسے فون پر کہی تھیں۔

"وہ تو واپس ہی نہیں آئی" —— مہندر نے کہا —— "میں اگر کہوں کہ اسے آپ ہی

لے گئے ہیں تو آپ کیا کہیں گے؟"

"میں کہوں گا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں" — عثمان نے غصیلی آواز میں کہا — "اگر آپ اس کی منگنی توڑ کر میرے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتے تو مجھے صاف بتا دیں۔ میں کیسے مان لوں کہ وہ رات کو واپس ہی نہ آئی ہو؟ آپ میرے ساتھ گیم کھیل رہے ہیں"۔

مندر نے عثمان کا غصہ اور انداز دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ لوسی کو عثمان نے غائب نہیں کیا۔ مندر کو بجا طور پر پریشانی ہوئی کہ لڑکی گئی کہاں۔ ایک پریشانی تو اس کی یہ تھی کہ ایک تجربہ کار لڑکی اسے بتائے بغیر کہیں چلی گئی تھی اور دوسری پریشانی یہ کہ پاک آرمی کا ایک آفیسر اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔

"اب بتائیں آپ کیا کہتے ہیں؟" — میجر عثمان نے مندر کو پریشانی کی حالت میں دیکھ کر پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں!" — مندر نے کہا — "مجھے تو اب تک یہ خیال رہا کہ وہ آپ کے ساتھ ہے لیکن پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی اور کے ساتھ چلی گئی یا اغوا ہو گئی ہے"۔

"تو چلئے میرے ساتھ!" — میجر عثمان نے کہا — "پولیس سٹیشن چلتے ہیں۔ لوسی کا ایک فوٹو ساتھ لے لیں۔ پولیس حلیہ معلوم کرنا چاہے گی"۔

"پولیس کیا کرے گی!" — مندر نے کہا — "یہ تو ہمیں خود سراغ لگانا پڑے گا۔ اپنی پولیس کو تو آپ جانتے ہیں۔ رپورٹ لکھ کر پولیس تھانے میں بیٹھی رہے گی، اتنے میں لڑکی کہیں سے کہیں تک جا پہنچے گی" — مندر نے ایک دو سیکنڈ کچھ سوچ کر عثمان سے پوچھا — "وہ اس کا منگیتر صغیر تو نہیں تھا جس کے ساتھ چلی گئی ہے؟"

"نہیں" — عثمان نے جواب دیا — "اسے تو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ صغیر کو تو وہ پسند ہی نہیں کرتی تھی"۔

میجر عثمان مندر پر زور دے رہا تھا کہ وہ پولیس سٹیشن چلے لیکن مندر پولیس سٹیشن جانے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دلیل تو کچھ اور دے رہا تھا لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ وہ پولیس سٹیشن جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا حالانکہ اس کے پاس پاکستان کا شناختی کارڈ تھا جس پر اس کا نام محمود علی خان لکھا ہوا تھا تاہم پولیس سٹیشن جانے میں اچھا خاصا خطرہ تھا۔

عثمان ٹلتا نظر نہیں آ رہا تھا لیکن مندر کے سامنے وہ گھٹنوں کے بل چلنے والا طفل شیر خوار تھا۔ اس نے عثمان کو لگام ڈال لی اور اسے گھر بھیج دیا۔ وہ عورت جو لوسی کی ماں

بنی ہوئی تھی ایسی کلاکار عورت تھی کہ اس نے رونا شروع کر دیا اور اس طرح اپنے آنسو بہائے کہ آنسوؤں سے اس کا منہ دھلنے لگا۔ عثمان تو ان پر شک کر رہا تھا لیکن اس عورت کے آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا۔ کہاں وہ ان پر غصہ جھاڑ رہا تھا اور کہاں یہ حالت کہ اس نے اس عورت کو تسلی دلاسہ دینا شروع کر دیا۔

میجر عثمان جب اس کوٹھی سے نکلا تو اس کے دل میں لوسی کے خلاف غصہ اور لوسی کے "ماں باپ" کی ہمدردی تھی۔ وہ جب اپنی گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی چلی تو اسے ایک نسوانی آواز سنائی دی — "اسے تمہاری ذات کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ جس روز اسے تم سے زیادہ عیش کرانے والا آدمی مل گیا وہ تمہارے منہ پر تھوک کر تمہیں پہچاننے سے انکار کر دے گی"۔

یہ آواز ایسی حقیقی تھی کہ عثمان نے چونک کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا مگر سیٹ خالی تھی۔ اسے وینا کے رات کے الفاظ یاد آ گئے اور اب اسے وینا کی ہی آواز سنائی دی تھی۔ اسے شرمساری سی محسوس ہوئی اور شرمساری اس کے اندر ایک احساس بیدار کرنے لگی کہ اسے پناہ مل سکتی ہے تو اپنے گھر میں ہی ملے گی اور اگر وہ سچے پیار کی تلاش میں ہے تو وہ وینا کے پاس ہے اور اس کے ننھے منے بچوں کی معصوم مسکراہٹوں میں ہے۔

عثمان وینا اور اپنے بچوں کی پیاری سی یاد میں کھو چلا تھا اور اسے کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا تھا لیکن اس کے ذہن میں جب لوسی نے انگڑائی لی تو ایک بار پھر غصے کا لاوا پھوٹ پڑا۔

یہ ایک بھیانک کشمکش تھی جس میں عثمان مبتلا ہو گیا تھا۔ اسی کشمکش میں وہ اپنے گھر پہنچا۔ وینا کو اس کا چھوٹا بھائی امجد بتا گیا تھا کہ لوسی کو غائب کر دیا گیا ہے۔ بھائی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ لوسی کو کہاں چھپایا گیا ہے۔

عثمان جب گھر میں داخل ہوا تو وینا نے مسکرا کر اور آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ وینا نے تو اس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ عثمان گھر آتا تھا تو وہ دوسرے کمرے میں چلی جایا کرتی تھی۔ چونکہ بیوی تھی اس لئے چائے وائے کا پوچھ لیتی تھی لیکن بے دلی سے۔ اب وینا کا انداز بالکل ہی بدل گیا تھا۔ عثمان کو ذرا سا بھی شک نہ ہوا کہ لوسی کی گمشدگی میں وینا کا بھی ہاتھ ہے۔

اُس شام عثمان باہر گیا ہی نہیں۔ باہر کی دنیا کے ساتھ اس کا رابطہ ٹیلی فون کے ذریعے تھا۔ اس نے ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے چار مرتبہ مندر کو فون کیا اور لوسی کے متعلق پوچھا۔ ہر بار اسے یہی جواب ملا کہ لوسی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

میجر عثمان نے تو چار مرتبہ فون کیا تھا' مہندر پر پریشانی کا یہ عالم طاری تھا کہ وہ اس تھوڑے سے عرصہ میں بیسیوں فون کر چکا تھا۔ جہاں جہاں اس کے آدمی تھے اس نے لوسی کے متعلق پوچھا تھا۔ ہر جگہ سے اسے یہی ایک جواب ملتا رہا کہ لوسی یہاں نہیں آئی۔ اگر اسے اطلاع ملتی کہ لوسی مر گئی ہے یا کہیں گاڑی کے نیچے آگئی ہے تو مہندر کو صرف یہ افسوس ہوتا کہ کام کی ایک لڑکی ضائع ہو گئی ہے' اسے غم یہ لگا ہوا تھا کہ وہ پاکستان کی انٹیلی جنس کے ہاتھ نہ چڑھ گئی ہو۔ اس نے وائرلیس کے ذریعے خفیہ الفاظ میں نئی دلی اپنی انٹیلی جنس کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ لوسی لاپتہ ہو گئی ہے۔

"اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرو" —— اسے جواب ملا —— "اگر وہ مل جائے اور پتہ چل جائے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہے تو اسے کسی طرح واپس انڈیا بھیج دو اور اگر وہ کوئی گڑبڑ کرے تو اسے وہیں ختم کر دو"۔

○

رات کے نو بج رہے تھے جب میجر سمیع اور کیپٹن آصف اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں لوسی قید تھی۔ ان کے ساتھ ایک اور تیس بتیس سال عمر کا خوبرو آدمی تھا۔ وہ ملٹری انٹیلی جنس کا میجر امتیاز تھا۔ اختر اور امجد مکان کے باہر کھڑے رہے تھے تاکہ لڑکی کو یہ پتہ نہ چل سکے کہ اسے وینا کے بھائیوں نے اغوا کیا ہے۔

"کیوں لڑکی!" —— میجر سمیع نے لوسی سے پوچھا —— "ہمارے سوال کا جواب دو گی؟"

"کیا آپ اپنا سوال دہرائیں گے؟" —— لوسی نے ایسے لہجے میں پوچھا جیسے اس کے دل پر ذرا سا بھی خوف نہیں بلکہ اس کے دلکش ہونٹوں پر تبسم تھا۔

"اپنی اصلیت بتا دو!" —— میجر سمیع نے کہا —— "اگر تم لوگ تہذیب اور کلچر کے پردے میں عصمت فروشی کر رہے ہو تو بتا دو۔ سمگلنگ کا چکر ہے تو وہ بتا دو"۔

"یہ لڑکی جاسوس معلوم ہوتی ہے" —— میجر امتیاز نے کہا۔

"آپ لوگ اس سے بھی بڑی گالی دے سکتے ہیں" —— لوسی نے کہا —— "میں آپ کی قید میں ہوں۔ اگر آپ سڑک پر یا کہیں اور مجھے عصمت فروش' سمگلر یا جاسوس کہتے تو خدا کی قسم' میں پتھر مار کر آپ کے یہ اگلے دانت توڑ دیتی.... مجھ سے پوچھتے ہو میں کون ہوں.... یہ مجھے پوچھنا چاہئے کہ تم کون ہو۔ مجھے یہی سمجھ نہیں آ رہی کہ میں تمہیں 'تم' کہوں یا 'آپ'۔ مجھے معلوم ہے تم آخر مجھ سے میرے گھر کا فون نمبر لو گے اور وہاں فون کرو گے

کہ اتنے لاکھ روپیہ فلاں جگہ پہنچا دو اور اپنی لڑکی واپس لے لو۔ کیوں نہیں اپنا مطالبہ ابھی مجھے بتا دیتے۔ میں اپنے گھر کا ایڈریس دے دیتی ہوں۔ وہاں سے آپ کو رقم مل جائے گی"۔

میجر سمیع نے میجر امتیاز کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے تم دو تین روز اور ہماری مہمان رہو" —— میجر سمیع نے لوسی سے کہا —— "تم خود ہی بول پڑو گی کہ تم کیا ہو"۔

"اکبر!" —— میجر سمیع نے نوکر کو آواز دی۔ وہ باہر تھا دوڑا آیا۔ میجر سمیع نے اسے کہا —— "پہلے کی طرح اسے باندھ دو"۔

سمیع اور امتیاز کمرے سے نکل گئے۔ نوکر نے لوسی کے ہاتھ پاؤں باندھنے شروع کر دیئے۔

"لڑکی مشکوک ہے" —— باہر جا کر میجر امتیاز نے کہا —— "اسے ابھی یہیں پڑا رہنے دو' لیکن یہ دیکھنا آپ لوگوں کا کام ہے کہ اس مکان کی سیکیورٹی کتنی مضبوط ہے اور آپ لوگ اس لڑکی کو کب تک بے خوف و خطر چھپا کر رکھ سکیں گے.... کیا یہ نوکر قابلِ اعتماد ہے؟"

"لڑکپن سے ہمارے گھر میں ہے" —— اختر نے جواب دیا —— "مجھے پوری امید ہے یہ دھوکہ نہیں دے گا"۔

○

میجر امتیاز انٹیلی جنس کی طرف سے سرکاری طور پر نہیں آیا تھا۔ وہ کیپٹن آصف کا قریبی رشتہ دار تھا۔ سمیع اور آصف نے اسے کہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو آ کر دیکھ لے۔ جب تک یقین نہ ہو جائے کہ یہ لڑکی جاسوسی کے کسی رنگ کی ہے اُس وقت تک آئی ایس آئی کو اطلاع نہ دی جائے۔

یہ تینوں آرمی آفیسر گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔ لوسی کے منہ پر کپڑا باندھ کر رکھا جاتا تھا تاکہ اس کی آواز نہ نکل سکے۔ اختر کا ملازم اس کے ہاتھ پاؤں باندھ چکا تو اس کے منہ پر کپڑا باندھنے لگا۔ لوسی نے اس سے اس کا نام پوچھا۔ نوکر نے اپنا نام اکبر بتایا۔

اکبر کی عمر تینتیس چونتیس سال ہو گئی تھی۔ وہ اختر کے گھر کا خاص نوکر تھا۔ صاف ستھرے اور اچھی قسم کے کپڑے پہنتا تھا۔ اس کی شکل و صورت بھی ایسی تھی کہ کسی گھر

کانوکر نہیں لگتا تھا نہ اس کے چہرے اور انداز میں غربت کی جھلک تھی۔ چہرے مہرے کا رنگ بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔

"اکبر!" ـــ لُوسی نے منت کے لہجے میں اسے کہا ـــ "تھوڑی دیر اور میرا منہ کھلا رہنے دو۔ میں ذرا سی بھی اونچی آواز نہیں نکالوں گی"۔

اکبر نے اس کی بات مان لی اور کپڑا الگ رکھ دیا۔

"تم ان لوگوں کے کیا لگتے ہو؟" ـــ لُوسی نے اکبر سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" ـــ اکبر نے جواب دیا ـــ "میں تو ان کا نوکر ہوں"۔

"کیوں جھوٹ بولتے ہو" ـــ لُوسی نے مسکرا کر کہا ـــ "تم نوکر لگتے ہی نہیں۔ تمہارا چہرہ، تمہارے کپڑے اور تمہارا طور طریقہ نوکروں والا ہے ہی نہیں۔ تم تو کوٹھیوں میں رہنے والے آدمی ہو"۔

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے" ـــ اکبر نے کہا ـــ "یہ لوگ جب آئیں تو ان سے پوچھ لینا"۔

"میں نہیں مانتی" ـــ لوسی نے کہا ـــ "تم کسی محکمے میں افسر ہو یا تم بہت بڑے جاگیردار ہو۔ تم تو خوبصورت آدمی ہو۔ اگر تم نوکر ہوتے تو میں تمہارے ساتھ بات بھی نہ کرتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ باتیں کروں کیونکہ تم میرے خاندان کی برابری کے آدمی ہو.... میرے قریب ہو کر بیٹھو"۔

اکبر نوکر ہی تو تھا۔ ایک خوبصورت اور اونچے درجے کی لڑکی نے اسے افسر، جاگیردار، خوبصورت اور دلکش آدمی کہہ دیا تو اس کے غبارے میں ہوا بھر گئی۔ لوسی کی مسکراہٹ کا جادو الگ چل رہا تھا۔ لوسی نے اسے کہا کہ میرے قریب ہو جاؤ تو وہ اتنا قریب ہو گیا کہ دونوں کے جسموں کے درمیان ہوا کے گزرنے کی بھی جگہ نہ رہی۔

"کیا میں واقعی تمہیں افسر یا امیر آدمی لگتا ہوں؟" ـــ اکبر نے پوچھا۔

"تو کیا میں غلط کہہ رہی ہوں!" ـــ لوسی نے اپنی مسکراہٹ کو اور زیادہ طلسماتی بناتے ہوئے کہا ـــ "اگر تم افسر نہیں ہو اور امیر آدمی بھی نہیں ہو تو بھی تم مجھے بہت ہی اچھے لگتے ہو.... یہ لوگ کون ہیں جو مجھے یہاں لائے ہیں؟"

"یہ نہیں بتاؤں گا" ـــ اکبر نے جواب دیا۔

"چلو نہ بتاؤ" ـــ لُوسی نے کہا ـــ "کوئی اور بات کرو۔ میرا دل بہت گھبرا رہا

ہے"۔

اکبر اس کے پہلو کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا تھا۔ لوسی کھلاڑی لڑکی تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے اپنا سر اکبر کے چہرے کے قریب لے گئی۔ لوسی کے ریشم جیسے بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ یہ بال اکبر کے گالوں سے مس کرنے لگے۔ اکبر نے پرے ہٹنے کی بجائے اپنا چہرہ لوسی کے اور قریب کر لیا۔

"اکبر!" ـــ لوسی نے منت سماجت کے انداز سے کہا ـــ "تھوڑی سی دیر کے لئے ہاتھ بھی کھول دو۔ میں کمزور سی لڑکی ہوں اور تم اتنے تندرست اور توانا مرد ہو۔ میں بھاگ تو نہیں سکتی" ـــ لوسی نے اپنا چہرہ اکبر کی طرف گھمایا تو اس کا منہ اکبر کے منہ کے بالکل قریب ہو گیا، اتنا قریب کہ ان کی سانسیں ٹکرانے لگیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کے سانسوں کی تپش محسوس کرنے لگے۔ لوسی نے سرگوشی کی ـــ "ہاتھ کھول دو اکبر!"

اکبر آہستہ آہستہ لوسی کے پیچھے ہو گیا اور اس کے ہاتھ کھولنے لگا۔ رسّی کھول کر وہ پھر لوسی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ لوسی نے اپنی دونوں کلائیاں ہاتھوں سے ملیں پھر بازو انگڑائی لینے کے انداز سے اوپر کو اور کچھ دائیں بائیں پھیلائے، انگڑائی لی اور جس طرف اکبر بیٹھا ہوا تھا، اپنا اس طرف کا بازو اکبر کی گردن میں ڈال دیا اور اس کا گال اپنے گالوں سے لگا دیا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ" ـــ لوسی نے مخمور سی آواز میں کہا ـــ "اب جس وقت تم چاہو گے میرے ہاتھ باندھ دینا"۔

"پاؤں بھی کھول دوں؟" ـــ اکبر نے پوچھا۔

"تم چاہو تو کھول دو" ـــ لوسی نے کہا ـــ "میں تمہیں کہنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ تمہاری ذمہ داری میں ہوں۔ میں سوچتی تھی کہ دوسرے آدمی آ گئے تو وہ تم سے ناراض ہوں گے" ـــ لوسی نے پیارے سے لہجے میں اکبر سے پوچھا ـــ "اب جھوٹ نہ بولنا۔ سچ بتاؤ، کیا تم واقعی ان لوگوں کے گھر میں نوکر ہو؟"

"تم مانتیں کیوں نہیں؟" ـــ اکبر نے کہا ـــ "میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں ان کا نوکر ہوں" ـــ یہ کہہ کر اس نے لوسی کے پاؤں بھی کھول دیئے۔

"اتنے خوبصورت اور اتنے پیارے آدمی ہوتے ہوئے تم کسی کے گھر کی نوکری

کیوں کر رہے ہو؟" —— لوسی نے پوچھا —— "کیا تم شادی شدہ ہو؟"

"نہیں" —— اکبر نے جواب دیا —— "میں اپنی شادی کی تو سوچ بھی نہیں سکتا"۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"تیس پینتیس کے درمیان ہو گی" —— اکبر نے جواب دیا۔

"نہیں" —— لوسی نے حیران سا ہو کے کہا —— "تمہاری عمر اتنی نہیں ہو سکتی۔ تم تو بیس بائیس سال کے نوجوان لگتے ہو.... گھر میں نوکری کیوں کر رہے ہو اور ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"مجبوری!"

"کیسی مجبوری؟" —— لوسی نے پوچھا۔

"میری دو چھوٹی بہنیں جوان ہو گئی ہیں" —— اکبر نے کہا —— "باپ بچپن میں مر گیا تھا۔ پہلے ان بہنوں کو بیاہوں گا پھر ہمت ہوئی تو خود شادی کروں گا ورنہ اکیلے ہی عمر گزار دوں گا۔ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا جب باپ مر گیا تھا۔ پڑھنا چھوڑ دیا اور کبھی کسی ہوٹل میں اور کبھی کسی گھر میں نوکری کرتا رہا' پھر اس گھر میں آ گیا۔ یہ اچھے لوگ ہیں۔ انہوں نے میری بہت قدر کی۔ تنخواہ بھی زیادہ دیتے ہیں۔ کھانا پینا اور کپڑا لتا انہی سے ملتا ہے اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ساری تنخواہ ماں کو دے آتا ہوں۔ وہ بیچاری اس بڑھاپے میں بھی محنت مزدوری کرتی ہے اور میری تنخواہ میری بہنوں کے جہیز بنانے کے لئے رکھتی رہتی ہے"۔

"نہیں" —— لوسی نے کہا —— "ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ تم جیسا عقل اور شکل والا آدمی اپنی زندگی برباد کر رہا ہے.... اس طرح کب تک جہیز بنا لو گے؟"

"اور کوئی ذریعہ بھی تو نہیں" —— اکبر نے کہا —— "ماں نے آدھے آدھے جہیز تو بنا ہی لئے ہیں۔ اکٹھی رقم کہیں سے مل نہیں سکتی"۔

"کتنی رقم مل جائے تو تمہارا کام ہو سکتا ہے؟" —— لُوسی نے پوچھا۔

"بیس پچیس ہزار تو ہو" —— اکبر نے اس طرح کہا جیسے اس نے آہ لی ہو —— "اتنی رقم تو خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا"۔

"تم یہ تو ضرور سوچتے ہو گے کہ تمہاری شادی ہو" —— لُوسی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"غریب آدمی اتنے اچھے خواب کہاں دیکھ سکتا ہے" —— اکبر نے آہ لے کر کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ اکبر!" —— لوسی نے مذاق کے رنگ میں پوچھا —— "تمہیں کس قسم کی لڑکی پسند ہے؟"

اکبر ہنس پڑا۔

"مجھ جیسی بیوی کو پسند کرو گے؟" —— لوسی نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

"تم تو بہت خوبصورت ہو" —— اکبر نے کہا۔

"ایک بات بتاؤں اکبر!" —— لُوسی نے کہا —— "مجھ جیسی خوبصورت لڑکیاں تم جیسے خوبصورت آدمیوں کو پسند کرتی ہیں"۔

لُوسی نے اکبر کو اپنے دونوں بازوؤں میں لے لیا۔ اکبر پر خود سپردگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ لوسی تجربہ کار لڑکی تھی۔ اس نے اکبر پر اپنے حسن کا طلسم طاری کر دیا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ جوان آدمی کس حد تک متاثر ہو چکا ہے۔ اسے وہ پوری طرح ہپناٹائز کر رہی تھی۔ کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔ اکبر کبھی اس کے نرم و ملائم بالوں میں اپنی انگلیاں ڈالتا' کبھی اسے اپنے ساتھ لگا لیتا۔

لُوسی کو پتہ چل گیا کہ اب یہ شخص مکمل طور پر اپنے قابو سے نکل کر اس کے قابو میں آ گیا ہے۔

"اب بات سنو اکبر!" —— لوسی نے اس سے ذرا الگ ہوتے ہوئے کہا —— "میرے دماغ پر تمہاری دونوں بہنیں سوار ہیں۔ تم کہتے ہو کہ بیس پچیس ہزار روپیہ مل جائے تو ان کی شادی ہو سکتی ہے۔ اگر آج ہی رات تمہیں بیس ہزار روپیہ مل جائے تو اچھا نہیں؟"

"میرے لئے خدا چھت تو نہیں پھاڑ سکتا" —— اکبر نے کہا۔

"اگر خدا چھت پھاڑ دے تو کیا تم یہ رقم قبول کر لو گے؟" —— لُوسی نے پوچھا۔

اکبر جوان آدمی تھا اور اس کی جوانی کو لوسی جیسی خوبصورت لڑکی نے مشتعل کر دیا تھا۔ اس نے لُوسی کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر پھر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"ذرا ٹھہرو اکبر!" —— لُوسی نے اس کے بازوؤں سے نکلے بغیر کہا —— "میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔ تم تو میرے دل کو اتنے اچھے لگتے ہو کہ میں تمہیں اپنے گھر رکھ

لوں گی۔ میری شادی کسی اور کے ساتھ ہو گئی تو میں پھر بھی تمہاری رہوں گی۔ اس محبت کی وجہ سے میں چاہتی ہوں کہ آج ہی رات تمہیں بیس ہزار روپیہ مل جائے تاکہ تم اپنی بہنوں کے غم سے آزاد ہو جاؤ پھر ہم دونوں آزاد ہوں گے"۔

"بیس ہزار ملے گا کہاں سے؟" ـــــ اکبر نے پوچھا ـــــ "تم تو یہاں قید میں پڑی ہوئی ہو"۔

"قید سے نکالنا تمہارا کام ہے" ـــــ لوسی نے اپنا ایک گال اس کے ایک گال کے ساتھ لگا کر کہا ـــــ "تمہارے پاس سائیکل ہے۔ اس پر مجھے بٹھاؤ اور چلو"۔

"کہاں؟"

"میرے گھر!" ـــــ لوسی نے کہا اور اپنا گال اس کے گال کے ساتھ اور زیادہ دبایا۔

"میرے مالک مجھے جان سے مار ڈالیں گے" ـــــ اکبر نے کہا۔

"تم انہیں پھر کبھی ملو گے تو جان سے ماریں گے نا!" ـــــ لُوسی نے کہا ـــــ "میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گی اور میں نے اس شہر میں رہنا ہی نہیں ہے۔ تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ بیس ہزار نقد دوں گی اور میں خود بھی تمہارے لئے ایک انعام ہوں۔ آج رات میں تمہیں اپنی کوٹھی کے کمرے میں اپنے ساتھ رکھوں گی"۔

اکبر اس کلاس کا ایک جوان آدمی تھا جس میں دو ہی ضروریات کو اہمیت دی جاتی ہے ـــــ پیٹ کی بھوک اور جنسیت کی بھوک ـــــ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو مار دھاڑ اور جنسی لذت سے بھرپور فلمیں دیکھنے جاتے ہیں اور کپڑے پھاڑ پھڑوا کر ٹکٹ لیتے اور فلم دیکھتے ہیں۔ ان ہی لوگوں کے مطالبے پر سینما ہال میں بلیو فلموں کے ٹوٹے دکھائے جاتے ہیں۔

لُوسی ہوشیار لڑکی تھی اور اس کلاس کی نفسیات کو سمجھتی تھی۔ آدمی کسی بھی کلاس کا ہوتا 'لوئر' 'مڈل یا اپر' وہ ہر کلاس کے آدمیوں کی کمزوریوں سے آگاہ تھی۔ یہی لوسی اور اس جیسی لڑکیوں کو ٹریننگ ملتی تھی۔ اس نے اکبر کو بڑی آسانی سے اپنے شیشے میں اتار لیا تھا۔ یہ تو بڑا آسان شکار تھا جو اس لڑکی نے مار لیا۔

رات ساڑھے گیارہ بارہ بجے کے درمیان عمل تھا۔ شہر کی ایک سڑک پر جو دن بھر ٹریفک کے ہجوم تلے کراہتی تھی ایک سائیکل جا رہی تھی۔ گاڑیوں کی ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ سائیکل کے پیچھے کیریئر پر ایک عورت بیٹھی تھی جس نے اپنے اوپر ایک کمبل لے رکھا تھا۔ اِکّا دُکّا گاڑی قریب سے گزرتی تھی اور کوئی گاڑی والا اس سائیکل والے کی طرف دیکھتا ہی نہیں تھا۔ کوئی دیکھتا بھی تو یہی کہتا کہ ایک مزدور پیشہ آدمی اپنی بیوی' بہن یا ماں کو سائیکل پر بٹھائے کہیں جا رہا ہے۔

"کمبل اور آگے کر لو" ـــــ سائیکل والے نے اپنے پیچھے بیٹھی ہوئی عورت سے کہا ـــــ "آگے پولیس کی گاڑی کھڑی ہے"۔

عورت نے کمبل کا گھونگھٹ نکال لیا۔ دو تین منٹ بعد سائیکل پولیس کی گاڑی کے قریب پہنچی۔ یہ گشتی پولیس کی گاڑی تھی جو انہوں نے وہاں روک لی تھی۔ سائیکل گاڑی کے پاس سے گزری تو ایک پولیس والے کی آواز سنائی دی۔

"اوئے ٹھہر اوئے!" ـــــ ایک پولیس والے نے کہا۔

سائیکل رک گئی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل سائیکل کے قریب گیا اور اس نے عورت کے اوپر سے کمبل اتار دیا۔ کمبل کے اندر سے نہایت خوبصورت اور ماڈرن لڑکی برآمد ہوئی۔

"یہ کون ہے اوئے؟" ـــــ ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا ـــــ "اور تم کون ہو؟ ادھر آؤ ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھو"۔

لڑکی کُود کر سائیکل سے اُتری اور اُس نے کمبل الگ پھینک دیا ـــــ یہ لُوسی تھی اور

سائیکل چلانے والا اکبر تھا۔

"کیوں بیٹھیں تمہاری گاڑی میں؟" ——لُوسی نے بڑے رعب سے پوچھا —— "کیا نام ہے تمہارا؟"

"واہ بھئی واہ" —— ہیڈ کانسٹیبل نے طنزیہ کہا —— "یہ دیکھو بھائیو' چور کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے"۔

"بکواس بند کرو" —— لُوسی نے کہا —— "چلو مجھے گاڑی میں بٹھاؤ پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ تم میرے جوتے چاٹو گے کہ مجھے چھوڑ دو اور میں نہیں چھوڑوں گی۔ ایس ایس پی اشتیاق ہاشمی کو جانتے ہو؟"

"تم کیا سمجھتی ہو میں اپنے ایس ایس پی کو بھی نہیں جانتا؟" —— ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"تو پھر مجھے بھی جان لو گے" —— لُوسی نے کہا —— "میں جانتی ہوں تم اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے ہو اس لئے میں تمہیں بتا دیتی ہوں کہ میں اس سائیکل پر کس طرح بیٹھی ہوں۔ تم میرے پاس ٹھہرو اور اپنی گاڑی سیدھی آگے بھیجو۔ آگے ایک بتی والا چوک آئے گا۔ دائیں طرف گھوم جانا۔ دور آگے جا کر بائیں کو جانا۔ دو تین فرلانگ آگے میدان آ جائے گا...."

"ہمیں اس چکر میں نہ ڈالو" —— ہیڈ کانسٹیبل نے کہا —— "تم اپنی بات بتاؤ"۔

"میں ایک فنکشن سے آ رہی تھی" —— لُوسی نے جواب دیا —— "راستے میں گاڑی پنکچر ہو گئی۔ ڈگی کھول کر دیکھا تو اس میں جیک نہیں تھا۔ وہ ایسی ویران جگہ ہے کہ کوئی گاڑی بھی نظر نہیں آتی تھی جس سے لفٹ لے لیتی۔ وہاں میرا کھڑا رہنا تو ٹھیک نہیں تھا۔ یہ بے چارہ آ رہا تھا۔ اسے کہا کہ میں تمہیں پچاس روپے دوں گی' مجھے گھر پہنچا دو۔ اس نے کہا میں کچھ بھی نہیں لوں گا' اکیلی دکیلی عورت کی مدد کرنا میرا فرض ہے"۔

"پھر یہ کمبل اوپر کیوں لے رکھا تھا؟" —— ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

"سائیکل پر بیٹھے مجھے اچھا نہیں لگتا تھا" —— لُوسی نے کہا —— "اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کوئی دیکھ لیتا تو وہ حیران ہوتا کہ یہ غریب سا آدمی اس لڑکی کو کہاں لے جا رہا ہے۔ آج کل کے ایک دو نوجوان موٹر سائیکل یا گاڑی پر جاتا دیکھ لیتے تو تم جانتے ہو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے"۔

"ایس ایس پی صاحب تمہارے کیا لگتے ہیں؟" —— ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

"یہ تھانے چل کر بتاؤں گی" —— لُوسی نے کہا —— "اگر ہمت ہے تو مجھے تھانے لے چلو.... وہاں جا کر ایک فائدہ تو یہ ہو گا کہ میں اشتیاق ہاشمی صاحب کو اور اپنے گھر بھی ٹیلی فون پر اطلاع دے سکوں گی۔ دونوں گھروں کی گاڑیاں مجھے لینے کے لئے آ جائیں گی لیکن تمہاری خیر نہیں.... کہو کیا کہتے ہو؟"

"جا بی بی جا!" —— ہیڈ کانسٹیبل نے بے مزہ سے لہجے میں کہا —— "لیکن ٹھہر جا۔ ہم تمہیں اپنی گاڑی میں گھر پہنچا دیتے ہیں"۔

"نہیں نہیں" —— لُوسی نے کہا —— "ڈیوٹی والی گاڑی کو میں ذاتی کام کے لئے استعمال نہیں کروں گی۔ بھائی جان ہاشمی صاحب کو پتہ چلا تو وہ ناراض ہوں گے"۔

لُوسی کی شکل و صورت اور اس کا لباس اور اس کی ڈیل ڈول بتا رہی تھی کہ اپر کلاس کی لڑکی ہے اور یہ ایس ایس پی جیسے بڑے افسر کی قریبی رشتہ دار ہو سکتی ہے۔ باقی کمال لُوسی کی ایکٹنگ کا تھا جو اس نے بڑی خود اعتمادی سے کی تھی۔ اکبر نے ہیڈ کانسٹیبل سے اتنا ہی کہا کہ جناب میں نے تو اپنی طرف سے نیکی کا کام کیا ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل ایسا مرعوب ہوا کہ اس نے بڑے احترام سے اکبر اور لوسی کو رخصت کر دیا۔



آدھی رات کے وقت "ایم اے خان" کی کال بیل بجی تو مہندر بڑی شدت سے چونکا۔ وہ گہری نیند سے جاگا تھا۔ اس کوٹھی کی کال بیل تو کسی بھی وقت بج سکتی تھی اور بجتی ہی رہتی تھی لیکن لُوسی کی گمشدگی نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ اسے یہی ایک خطرہ نظر آ رہا تھا کہ لُوسی نے کوئی الٹی سیدھی نشاندہی کر دی تو سارا رنگ پکڑا جائے گا۔ گیٹ کھولنے کی ڈیوٹی ایک نوکر کی تھی۔ وہ دوڑ آ گیا۔ اُس نے دُور سے گیٹ کی روشنی میں لُوسی کو دیکھا تو اور تیز دوڑ پڑا اور جا کر گیٹ کھولا۔

ان الفاظ پر کہ لُوسی آ گئی ہے مہندر اچھل کر پلنگ سے اٹھا اور اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔

"کہاں چلی گئی تھی؟" —— مہندر نے پوچھا۔

لُوسی نے اسے من و عن سنا دیا کہ وہ کس طرح اغوا ہوئی اور اس پر کیا بیتی اور وہ

کس طرح اس قید سے فرار ہوئی ہے۔ اس نے اکبر کو مہندر کے سامنے کیا۔

"ڈیڈی!" ــــ لوسی نے مہندر سے کہا ــــ "اسے بیس ہزار روپیہ انعام دینا ہے"۔

"ہاں بیٹی!" ــــ مہندر نے کہا ــــ "بیس ہزار تم نے کہا ہے، میں اسے پچیس ہزار روپیہ دوں گا۔ کل بینک سے چیک کیش کروا لینا۔ ابھی اس کے سونے کا بندوبست کرو"۔

ایک نوکر کو بلا کر اکبر کو اس کے حوالے کر دیا گیا۔ نوکر اکبر کو کمرے سے باہر لے گیا اور خود واپس آ گیا۔ مہندر نے اسے اشارہ ایسا ہی کیا تھا۔ مہندر نے نوکر کو اپنے پاس بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔

"ٹھیک ہے" ــــ نوکر نے کہا ــــ "میں سمجھ گیا۔ سنبھال لوں گا"۔

"خیال رکھنا لوسی!" ــــ مہندر نے کہا ــــ "اس کی ہوا بھی باہر نہ نکلے ورنہ سب پھنس جائیں گے.... اب سوچنا یہ ہے کہ یہ کون لوگ تھے جو تمہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے"۔

"ایک وجہ تو بڑی صاف ہے" ــــ لوسی نے کہا ــــ "میرا خیال ہے اتنا زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دو تو میجر عثمان کے بھائی لگتے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ میں میجر عثمان کے ساتھ تعلقات توڑ لوں اور انہوں نے مجھ سے میجر عثمان کو ٹیلی فون بھی کروایا تھا اور مجھ سے یہ کہلوایا تھا کہ میں اپنے ایک فرینڈ کے ساتھ جا رہی ہوں اور میں آئندہ اسے یعنی عثمان سے نہیں ملوں گی.... اس سے میرے اغوا کا مقصد صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عثمان کے ساتھ میرے تعلقات توڑنا چاہتے ہیں لیکن وہ تو مجھ سے یہ پوچھ رہے تھے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ انہوں نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ تم جاسوس ہو یا سمگلر یا ہائی کلاس سوسائٹی کی عصمت فروش ہو"۔

"صبح ہوتے ہی تمہیں غائب کر دوں گا" ــــ مہندر نے لوسی سے کہا ــــ "تمہارا اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں"۔

"کراچی؟ ترہے گا یا اسلام آباد؟" ــــ لوسی نے پوچھا۔

"کراچی!" ــــ مہندر نے کہا ــــ "اسلام آباد کی نسبت کراچی زیادہ محفوظ ہے۔ ویسے تو پورا سندھ اپنے قبضے میں ہے۔ میں تمہیں پہلی فلائٹ میں ہی کراچی بھیج دوں

گا"۔

لوسی بڑی تکلیف دہ قید سے نکلی تھی اور وہ فرش پر سوتی رہی تھی۔ اُس کا جسم دکھ رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں گئی، پلنگ پر گر پڑنے کے انداز سے لیٹی اور لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

○

اکبر کا روز مرّہ کا معمول یہ تھا کہ علی الصبح اس مکان کو جس میں لوسی قید تھی تالا لگا کر اختر کے گھر چلا جایا کرتا اور لوسی کے لئے ناشتہ لے جایا کرتا تھا۔ اس صبح سورج بھی نکل آیا اور سورج اوپر بھی آ گیا لیکن اکبر گھر نہ پہنچا۔ امجد گاڑی میں بیٹھا اور اُس جگہ گیا جہاں لوسی قید تھی۔ اس نے گاڑی دور روک لی تھی۔ مکان کے باہر والے دروازے پر اس نے ہاتھ رکھا تو دروازہ کھل گیا۔ اندر جا کے دیکھا تو وہاں اکبر نہیں تھا، لوسی بھی نہیں تھی اور اکبر کی سائیکل بھی نہیں تھی۔ دو رسیاں جن سے لوسی کے ہاتھ اور پاؤں باندھے جاتے تھے اور وہ کپڑا جو لوسی کے منہ سے باندھا جاتا تھا وہ وہیں پڑا تھا۔ امجد کا تو پسینہ نکل آیا۔ باہر والے دروازے سے جو تالا لگایا جاتا تھا وہ بمعہ چابی اندر پڑا تھا۔ امجد نے وہ تالا باہر لگایا اور واپس اپنے گھر پہنچ گیا۔

اختر نے جب سنا کہ لوسی بمعہ اکبر غائب ہے تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے میجر سمیع کو فون پر بتایا۔

"یہ تو بڑا موٹا شکار ہاتھ سے نکل گیا ہے" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اکبر لوسی کو اُڑا کر لے گیا ہو۔ اُس نے لوسی کا کیا بنانا تھا۔ وہ تو غریب آدمی تھا۔ یہی ہُوا ہے کہ لوسی اکبر کو اُڑا کر لے گئی ہے یا اس رنگ کے آدمیوں کو کسی طرح سراغ مل گیا ہو گا کہ ان کی لڑکی یہاں قید ہے۔ ان آدمیوں نے دیواریں پھاند کر لوسی کو آزاد کرا لیا اور اکبر کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے.... کیا اکبر واقعی قابلِ اعتماد تھا؟"

"ہاں میجر سمیع!" ــــ اختر نے کہا ــــ "وہ اتنی جرات نہیں کر سکتا کہ لڑکی کو اُڑا لے گیا ہو۔ بہرحال میں اس کے گاؤں جا کر اس کا پتہ کروں گا"۔

اختر اُسی وقت گاڑی میں بیٹھا اور اکبر کے گاؤں چلا گیا جو شہر سے دو تین میل ہی دور تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ اکبر گھر نہیں آیا۔

اکبر گاؤں میں کیسے ملتا، وہ اُس وقت ایم اے خان کی کوٹھی کے ایک کمرے میں تھا

اور بڑی ہی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ڈھول بجائے جاتے تو بھی وہ اس نیند سے بیدار نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے ناشتے کے ساتھ جو چائے پلائی گئی تھی، اس میں بڑی تیز طاقت والی ٹرانکولائزر گولیاں ملائی گئی تھیں۔ ان گولیوں کا کوئی ذائقہ نہیں تھا۔ اکبر نے ایسا پر تکلف ناشتہ دیکھا تو ہوگا لیکن کھایا کبھی نہیں تھا۔ وہ چائے کی تین پیالیاں پی گیا تھا۔ کم از کم اڑتالیس گھنٹے کے بعد ہی اس نے بیدار ہونا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت اس کی آنکھ نہ کھلی۔ شام کے کھانے کے وقت بھی وہ گہری نیند سویا رہا۔ اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی۔ کوٹھی کے نوکر نے دیکھا تو پھر اس کے آگے ناشتہ رکھ دیا اور اُسے پھر وہی چائے پلائی گئی جس میں ذہن کو سلا دینے والی گولیاں ملی ہوئی تھیں۔

ناشتہ کر کے وہ پھر سو گیا۔ سارا دن سویا رہا۔ رات آدھی گزر گئی تھی جب دو نوکروں نے اسے پلنگ سے اٹھایا اور کوٹھی کے پیچھے کھڑی کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ اس کی آنکھ نہ کھلی۔ کار کوٹھی سے نکل گئی اور نہر کے کنارے کنارے دور تک چلی گئی۔

یہ تو تیسرے دن کا واقعہ ہے جب اکبر کو اس کوٹھی سے لے گئے تھے، اس سے پہلے رہائی کی پہلی صبح جب اکبر کو پہلا ناشتہ دیا جا رہا تھا، لُوسی مہندر کے پاس بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ وہ عورت بھی ان کے ساتھ تھی جو لُوسی کی ماں بنی ہوئی تھی۔

"مجھے ایک مشورہ دیں" —— لُوسی نے مہندر اور اس عورت سے کہا —— "عثمان کی بیوی کے بھائی اس سے میرا تعلق توڑنا چاہتے تھے، اس کا انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ میرے لئے بڑا ہی اذیّت ناک تھا۔ میں ان سے اور ان کی بہن سے انتقام لینا چاہتی ہوں"۔

"وہ کیسے؟" —— مہندر نے پوچھا۔

"وہ اس طرح" —— لُوسی نے کہا —— "میں عثمان کو فون پر بتاؤں گی کہ میں نے اسے جو فون کیا تھا وہ مجھ سے ڈرا دھمکا کر کرایا گیا تھا۔ میں قید میں تھی، میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ تین یا چار آدمی تھے۔ میں عثمان کو اتنا زیادہ بھڑکاؤں گی کہ وہ اپنی بیوی کے بھائیوں کو گولی مارنے پر تیار ہو جائے گا۔ اگر اس نے اپنی بیوی کو گولی نہ ماری تو اسے طلاق تو ضرور دے دے گا"۔

"ہاں" —— مہندر نے کہا —— "یہ کام تو کرنا ہی کرنا ہے۔ ہمارا وہ کیا لگتا ہے یا

ہمارے وہ کیا لگتے ہیں۔ انہیں آپس میں ٹکرا دینا ہر لحاظ سے بہتر رہے گا۔ اگر ہم نے انہیں اس طرح ماؤف نہ کیا تو وہ اس کوٹھی کے چکر لگانے شروع کر دیں گے کہ یہاں ہوتا کیا ہے اور یہ کون لوگ ہیں۔ تم کہتی ہو کہ تم سے یہ لوگ تمہاری اصلیت معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن یہ سن لو لُوسی! تم اب عثمان سے نہیں ملو گی۔ اب اس پر بھی اعتبار نہ کرنا۔ ان مسلمانوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ سب ہمارے خلاف ایک ہی محاذ بنا لیں۔ تم عثمان کو اس کے آفس فون کرو اور ساتھ یہ کہو کہ میں کراچی جا رہی ہوں اور تمہیں مل نہیں سکوں گی"۔

لُوسی نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملایا اور آپریٹر سے کہا کہ میجر عثمان صاحب سے بات کراؤ۔

"ہیلو.... میجر عثمان بول رہا ہوں"۔

"ہیلو عثمان!" —— لُوسی نے کہا۔

"کیا اُس حرام زادے فرینڈ سے فرصت مل گئی ہے؟" —— عثمان نے طنزیہ اور غصیلے لہجے میں کہا —— "اب مجھے فون کرنے کی کیا ضرورت آ پڑی ہے؟"

"او! ڈیئر" —— لُوسی نے کہا —— "بات تو سنو۔ کون سے فرینڈ کی بات کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں جو فون کیا تھا وہ ایک قیدی کی حیثیت سے کیا تھا۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور ایک ریوالور کی نالی میری کنپٹی کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ مجھے پہلے بتا دیا گیا تھا کہ عثمان کو تم نے یہ الفاظ کہنے ہیں اگر ایک بھی لفظ اِدھر اُدھر ہوا تو گولی مار دیں گے۔ میں نے اپنی جان کا خطرہ دیکھ کر تمہیں وہی کہا جو انہوں نے بتایا تھا"۔

"کون تھے وہ لوگ؟"

"تم خود سمجھ جاؤ گے" —— لوسی نے کہا —— "وہ وقت بھی یاد کرو جب تمہارے دو دوست تمہیں گاڑی سے دور لے گئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ تمہیں دانستہ دور لے گئے تھے۔ وہ تو ذرا پرے ہٹ کر بات کر سکتے تھے اور پھر ایسی بھی کون سی راز کی بات تھی کہ تمہیں اتنی دور لے گئے اور ایک گاڑی میرے پاس آ کر رکی۔ اس میں سے ایک آدمی نے نکل کر اور میرے پاس آ کر کہا کہ میری گاڑی میں یہ صاحب بیٹھے ہوئے ایک کلینک کا اتا پتہ معلوم کرنا چاہتے ہیں اور تم انہیں آ کر راستہ سمجھاؤ۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں اس کی بات میں آ گئی اور گاڑی سے نکل کر اس کی گاڑی کے قریب چلی گئی۔ جو آدمی

مجھے اپنی گاڑی تک لے گیا تھا اس نے پیچھے سے میری گردن پر ہاتھ رکھ کر مجھے آگے کو جھکا دیا اور دوسرا آدمی جو پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اندر کو گھسیٹنے لگا۔ پیچھے سے ایک آدمی دھکیل رہا تھا اور آگے سے دوسرا آدمی کھینچ رہا تھا۔ میں سیٹ پر جا پڑی۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ اور آنکھوں پر کپڑا باندھ گیا....

"وہ شاید کسی کوٹھی کا کمرہ تھا جس میں مجھے لے گئے۔ پھر ایک گاڑی کا ہارن بجا۔ کمرے سے ایک آدمی باہر گیا اور میرا اندازہ یہ ہے کہ دو اور آدمی اندر آئے۔ مجھے ایک خطرہ تو یہ تھا کہ یہ مجھے ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کی حیثیت سے یہاں لائے ہیں اور مجھے پریشان کریں گے۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ یہ میرے گھر کا فون نمبر اور ایڈریس لیں گے اور میرے ڈیڈی کو فون کریں گے کہ اتنے لاکھ روپیہ دو اور اپنی بیٹی کو چھڑوا لو لیکن انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ ہمیں تمہاری خوبصورتی اور تمہارے جسم کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ صرف یہ کام کرو کہ عثمان کو یہ فون کرو اور وعدہ کرو کہ آئندہ تم عثمان سے نہیں ملو گی"۔

"اوں!" ــــ عثمان نے کہا ــــ "ہاں! میں سمجھ گیا۔ یہ میری بیوی کے بھائی تھے اور کون ہو سکتا ہے۔ تمہارا شک ٹھیک ہے کہ وہ دو آدمی جو مجھے گاڑی سے دور لے گئے تھے وہ میرے دوست ہیں اور دونوں آرمی آفیسر ہیں۔ وہ بھی میرے پیچھے پڑے رہتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ تعلق توڑ لوں.... دیکھو' کیسے دھوکہ باز نکلے.... ہاں.... پھر کیا ہوا؟"

پھر یہ ہوا!" ــــ لوسی نے کہا ــــ "میں نے تمہیں فون کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ تم میری آواز سے شک میں پڑ جاؤ گے کہ میں گھبرائی ہوئی سی ہوں لیکن تم میرے فون کو صحیح سمجھ بیٹھے۔ فون تو ہو گیا اب مجھ سے پوچھنے لگے کہ اپنی اصلیت بتاؤ۔ وہ مجھ پر شک کر رہے تھے کہ میں جاسوسوں کے کسی گروہ سے تعلق رکھتی ہوں اور میری کوٹھی جاسوسوں کا اڈہ ہے.... دیکھو عثمان! اس سے زیادہ ذلیل الزام اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے رونا شروع کر دیا لیکن وہ تو بڑے ہی بے رحم ثابت ہوئے۔ میرا خیال ہے یہ باتیں پوچھنے والے تمہارے فوجی دوست تھے....

"میں جاسوس یا کچھ اور ہوتی تو انہیں بتاتی لیکن وہ مانتے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے مجھے اس کمرے سے نکالا' باہر لے جا کر گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی چل پڑی۔ یہ کمرہ شہر

سے ذرا باہر ہے۔ وہاں انہوں نے مجھے فرش پر بٹھایا۔ اب میرے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے یہ کہہ کر سب چلے گئے کہ اپنی اصلیت بتاؤ گی تو تمہیں چھوڑ دیں گے۔ کمرے میں ایک پہریدار چھوڑ گئے۔ فرش پر ایک کمبل بچھا ہوا تھا۔ میں اس کمبل پر سوئی۔ صرف فرش پر سونا ہی میرے لئے ناقابل برداشت تھا لیکن میرے ساتھ جو سلوک ہوا اسے تم بھی برداشت نہیں کر سکو گے" ــــ لوسی نے عثمان کو بھڑکانے کے لئے جھوٹ بولا ــــ "میرے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس آدمی نے جسے پہرے پر چھوڑ گئے تھے میری آبروریزی شروع کر دی اور اس نے یہ حرکت رات دو دفعہ کی۔ میں رسیوں میں جکڑی ہوئی مزاحمت بھی نہیں کر سکتی تھی"۔

"اوہ!.... ڈیمش اٹ" ــــ عثمان کے منہ سے سخت غصیلی آواز نکلی ــــ "آئی ول شوٹ دیم.... یو باسٹرڈز!.... ہاں پھر کیا ہوا؟"

پھر کیا بتاؤں عثمان!" ــــ لوسی نے اپنی آواز میں رونے کی کیفیت پیدا کر لی اور سسکنے لگی ــــ "یہی تو میری دولت تھی جو لٹ گئی۔ صبح میرے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں کھولی گئیں اور اس پہریدار نے مجھے ناشتہ کروایا۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ ناشتہ کہاں سے آیا تھا۔ اس کے بعد پھر میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے اور اس پہریدار نے دن کے وقت پھر رات والی حرکت کی۔ رات آئی تو ایک کی بجائے چار آدمی آ گئے۔ وہ پھر مجھ سے کہنے لگے کہ میں کون ہوں۔ میں بہت روئی۔ ان چاروں نے میری آبروریزی کی۔ ان میں تمہارے سالے صاحبان بھی شامل تھے"۔

لوسی نے عثمان کو بتایا کہ وہ کس طرح وہاں سے فرار ہوئی ہے۔ اس نے وہ چکمہ تفصیل سے سنایا جو اس نے اکبر کو دیا تھا۔

"میں اکبر کو جانتا ہوں" ــــ عثمان نے کہا ــــ "وہ ان کا نوکر ہے۔ اسے تو میں جان سے مار ڈالوں گا"۔

"نہیں عثمان!" ــــ لوسی نے کہا ــــ "اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔ کسی کو قتل کر کے پھانسی چڑھ جاؤ گے پھر میرا کیا بنے گا"۔

"میں آفس سے فارغ ہو کر سیدھا تمہارے پاس آؤں گا" ــــ عثمان نے کہا۔

"نہیں عثمان!" ــــ لوسی نے کہا ــــ "میں کراچی جا رہی ہوں"۔

"کون سی فلائٹ سے؟"

"ابھی تو ہم لوگ اسلام آباد جا رہے ہیں" —— لُوسی نے جھوٹ بولا —— "اپنی گاڑی پر جائیں گے، کل پہلی فلائٹ سے وہاں سے میں سیدھی کراچی چلی جاؤں گی۔ ہفتہ دس دن تک واپس آ جاؤں گی۔ آتے ہی تمہیں اطلاع دوں گی لیکن میرے ساتھ جو سلوک ہُوا ہے اس نے میرا ذہن ماؤف کر دیا ہے۔ اب خدا ہی ہے جو مجھے نارمل حالت میں لے آئے۔ میں تو ایسا محسوس کرنے لگی ہوں جیسے میں تمہارے قابل رہی نہیں"۔

"اوہ.... شٹ اپ!" —— عثمان نے بڑے پیارے غصے سے کہا —— "میں نے تمہارے جسم کے ساتھ محبت نہیں کی۔ ہماری محبت روحانی ہے۔ تم ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا"۔

"میں تمہیں کراچی سے فون کروں گی" —— لوسی نے کہا —— "اور میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی لیکن تم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ مجھے کس نے اغوا کیا تھا"۔

○

عثمان کے ہاتھ ہی نہیں اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ غصہ اتنا زیادہ کہ اس کا دماغی توازن بھی بگڑا جا رہا تھا۔ دفتر کے اردلی نے آکر اسے سیلوٹ کیا۔

"کیا ہے!" —— عثمان بم کی طرح پھٹا —— "جلدی بولو"۔

اردلی جس کام کے لئے آیا تھا، اس نے بڑی جلدی جلدی بتایا اور اسی تیزی سے عثمان نے اسے چلتا کیا۔ وہ تو اردلی تھا اس لئے خاموشی سے چلا گیا۔ اگر کوئی افسر ہوتا تو عثمان سے ضرور پوچھتا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ عثمان بھول چکا تھا کہ وہ فوجی افسر ہے اور اس وقت بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا بڑا اہم کام کر رہا ہے لیکن اس کے ذہن میں اہمیت اور اولیت کا معاملہ اُلٹ ہو گیا تھا۔ وہ جسے میدانِ جنگ میں مرنے اور مارنے کی ٹریننگ دی گئی تھی وہ مرنے اور مارنے کے لئے تیار ہو گیا تھا لیکن میدانِ جنگ میں نہیں بلکہ شہر کی سڑکوں پر اور کوٹھیوں میں۔ ایک مشکوک لڑکی نے اس کے جذبات کے بارود میں چنگاری رکھ دی تھی۔ وہ بھول گیا تھا کہ وینا اس کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں ہے، میجر سمیع اور کیپٹن آصف اس کے دوست ہیں۔ ان سب کو اب اس نے دشمن سمجھ لیا تھا۔

اسے یہ سوال پریشان کرنے لگا —— "کیا میجر سمیع اور کیپٹن آصف لُوسی کے اغوا میں شامل تھے؟" —— وہ تصوّر میں اس منظر کو لایا جب وہ سمیع اور آصف کے ساتھ اپنی گاڑی سے کچھ دور چلا گیا تھا اور اس نے وہاں سے لوسی کو گاڑی سے نکلتا اور دوسری گاڑی تک جاتے دیکھا تھا۔ اُس وقت میجر سمیع اسے اپنی ایک پرابلم بتا رہا تھا۔ عثمان نے اس گاڑی کو جاتے دیکھا تھا جس میں لوسی بیٹھ گئی تھی۔ عثمان سمیع کی پوری بات سنے بغیر اپنی گاڑی کی طرف چل پڑا تھا۔ اس کے ذہن سے نکل ہی گیا تھا کہ سمیع اسے کیا کہہ رہا تھا۔ سمیع اور آصف اس کے پیچھے پیچھے اُس تک پہنچے تھے۔

"وہ تو چلی گئی ہے یار!" —— عثمان نے کھسیانا سا ہو کر کہا تھا۔

"بڑی گھٹیا لڑکی ثابت ہوئی" —— سمیع نے کہا تھا —— "اس نے تمہیں یہ بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کہ وہ کسی اور کے ساتھ جا رہی ہے"۔

"میرا خیال ہے یہ اس کا کوئی بھائی وغیرہ ہو گا" —— عثمان نے کہا تھا —— "اسے وہ یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں اپنے فرینڈ کے ساتھ کہیں جا رہی ہوں۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے ورنہ بڑی سولائزڈ لڑکی ہے"۔

"چلو جانے دو" —— کیپٹن آصف نے کہا —— "وہ تمہاری فرینڈ ہے۔ کل مل جائے گی۔ تم سمیع کی بات سن لو اور کچھ کرو۔ یہ بہت پریشان ہے"۔

عثمان ظاہر تو یہ کر رہا تھا کہ اس نے لُوسی کے اس طرح چلے جانے کو محسوس نہیں کیا لیکن وہ غصے کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لڑکی کو وہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور اس پر اس طرح حکم چلاتا تھا جیسے وہ اس کی زر خرید لونڈی ہو۔ وہ سمجھتا تھا کہ لڑکی اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ اس کی وہ روپے پیسے، تحفوں اور ہوٹلوں میں لنچ اور ڈنر کی صورت میں قیمت ادا کر رہا تھا۔ وہ اس حقیقت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھا کہ اس لڑکی کو انہی عیاشیوں کے ساتھ دلچسپی ہے اور پھر ایک دلچسپی یہ بھی ہے کہ وہ فوجی افسر ہے، بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں ذمّہ دار پوسٹ پر لگا ہُوا ہے اس لئے قیمتی راز دے سکتا ہے۔ لڑکی نے ایکٹنگ میں اس پر طلسم طاری کر رکھا تھا۔

دفتر میں بیٹھے بیٹھے وہ لُوسی کے اغوا کے وقت کو یاد کر رہا تھا۔ میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی کہ تم نے کسی بد تمیز لڑکی کے ساتھ یارانہ لگا رکھا ہے جو تمہیں بتائے بغیر کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہے۔ کیپٹن آصف نے بھی کچھ نہیں

کہا تھا۔ آصف نے اتنا ہی کہا تھا کہ سمیع کی پرابلم سنو اور اس کا کچھ کرو۔

عثمان کو خیال آیا کہ یہ دونوں اغوا میں شامل ہوتے تو کچھ اور طرح کی باتیں کرتے۔ ویسے بھی وہ ایسے بُرے کریکٹر کے آدمی نہیں تھے لیکن جب عثمان کو اختر اور امجد کا خیال آیا تو اس کے اندر سے غصہ شعلے کی طرح اٹھا اور جس تحمل سے اس نے سوچنا شروع کیا تھا وہ تحمل جل جل کر راکھ ہو گیا اور اس کا وجود ایک بار پھر کانپنے لگا۔ اس نے اسی غصے میں آپریٹر سے میجر سمیع کا نمبر ملانے کو کہا۔

میجر سمیع فون پر مل گیا۔ عثمان نے اسے اتنا ہی کہا کہ آج تین بجے میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ کیپٹن آصف کو بھی بلا لینا۔



تین بجے عثمان میجر سمیع کی یونٹ کے آفس میں پہنچ گیا۔ سمیع اور آصف اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اُسی بے تکلفی اور خوشگوار مُوڈ میں عثمان کا استقبال کیا جس طرح وہ کیا کرتے تھے۔ عثمان نے جواب میں رسمی طور پر بھی ایسی مزاجی خوشگواری کا اظہار نہ کیا۔ اگر سمیع اور آصف اپنے ہاتھ آگے نہ کرتے تو عثمان ان سے ہاتھ بھی نہ ملاتا۔ وہ اس طرح کرسی پر بیٹھ گیا جیسے بڑی لمبی مسافت پیدل طے کر کے آیا ہو۔

"خیریت؟" — میجر سمیع نے پوچھا — "کیا بات ہے.... معلوم ہوتا ہے...."

"میرا خیال ہے تمہیں معلوم ہے" — میجر عثمان نے دبی سی آواز میں کہا — "مجھ سے کیا پوچھتے ہو!"

"کم آن، سپیک اپ عثمان!" — میجر سمیع نے چونک کر کہا اور اٹھ کر عثمان کے قریب چلا گیا۔ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا — "تم نے یہ عورتوں والا انداز کب سے اختیار کیا ہے! فوراً اس بات پر آ جاؤ جس نے تمہیں اتنا زیادہ اپ سیٹ کر رکھا ہے"۔

"میری فرینڈ اغوا ہو گئی تھی" — عثمان نے کہا — "اور وہ فرار ہو گئی ہے۔ اس نے مجھے فون پر اپنے اغوا کی رُوداد تفصیل سے سنائی ہے۔ اُس نے کچھ ایسی باتیں بتائی ہیں جو ماننے کو جی نہیں چاہتا"۔

"وہ باتیں ہمیں بتاؤ" — کیپٹن آصف نے کہا۔

"اگر ہمارے خلاف کوئی بات ہے تو وہ بھی بتاؤ" — میجر سمیع نے کہا — "وہ ہمیں

اپنا نہیں تمہارا غم ہے، میں تو تمہاری صورت دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں"۔

"وہ کہتی ہے کہ اس کے اغوا میں تم دونوں بھی شامل تھے" — عثمان نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا — "وہ کہتی ہے کہ تم مجھے اُس رات صرف اس لئے میری گاڑی سے دُور لے گئے تھے کہ لُوسی کو اغوا کیا جا سکے۔ پھر اس نے تم دونوں پر یہ الزام لگایا ہے کہ تم نے اور ان دو آدمیوں نے جو اسے گاڑی میں بٹھا کر لے گئے تھے، اس کی آبروریزی کی ہے"۔

"اور تم مان گئے" — سمیع نے کہا۔

"وہ جھوٹ نہیں بولا کرتی" — عثمان نے کہا۔

"یہ تم کہتے ہو" — سمیع نے کہا — "لیکن میں اپنے اور آصف کے ڈیفنس میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ صرف یہ کہوں گا کہ اس لڑکی سے ہمیں ملواؤ.... دیکھو عثمان! تمہاری بد نصیبی یہ ہے کہ تم ایک مشکوک کریکٹر کی لڑکی کی باتوں کو سچ مان رہے ہو اور ہم جیسے دوستوں پر شک کر رہے ہو۔ یہ ایک ٹریجڈی ہے جس کا اثر صرف تم پر نہیں بلکہ تمہاری بیوی اور تمہارے بچوں پر بھی ہے، تمہاری ازدواجی زندگی تباہ ہو چکی ہے اور جہاں سے تمہیں روحانی مسرتیں مل سکتی ہیں وہاں کے دروازے تم نے اپنے ہاتھوں بند کر دیئے ہیں"۔

"تم ایک تصوراتی جنّت میں چلے گئے ہو" — کیپٹن آصف نے کہا — "یہ حسن بن صباح والی جنّت ہے۔ تم نے اس جنّت کے قصے پڑھے ہیں۔ حسن بن صباح نے ایک بڑے وسیع غار میں یا ایسی ہی کسی بند جگہ پر یہ جنّت بنائی تھی جس میں سوائے پتھروں اور غلاظت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے اندر اس نے ایسی جڑی بُوٹیاں رکھ دی تھیں جن کی بُو اس بند جگہ پر پھیل گئی تھی۔ وہ لوگوں کو اس جگہ میں بند کر دیتا تھا۔ اس بُو کا اثر یہ تھا کہ اس آدمی کے تصوّرات بڑے ہی حسین ہو جاتے تھے۔ ہر آدمی اپنے آپ کو شہزادہ سمجھ لیتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے یہ دھوکہ ہوتا تھا کہ اس نے شاہانہ لباس پہن رکھا ہے۔ یہ بد قسمت لوگ کنکریاں اور غلاظت کھاتے تھے لیکن تصوّروں میں انہیں یہ مرغن غذائیں لگتی تھیں۔ انہیں بڑی ہی حسین دلکش اور جوان لڑکیاں ملتی تھیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ اندر ہی مرجاتے اور ان کی لاشیں گھسیٹ کر باہر پھینک دی جاتی تھیں"۔

"تم مجھے یہ قصے کیوں سنا رہے ہو؟" ـــــ عثمان نے اکتاہٹ کے لہجے میں پوچھا۔

"اس لئے کہ یہ لڑکی تمہیں ایسی ہی ایک جنت میں لے گئی ہے" ـــــ کیپٹن آصف نے کہا ـــــ "اس نے تمہیں اس دنیا کا حسین ترین آدمی ثابت کر دیا ہے اور یہ کر تمہارے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتی اور سکندرِ اعظم کے بعد تم ہو جو ساری دنیا کو فتح کر سکتے ہو.... ہوش میں آؤ عثمان!"

"یہ باتیں بعد میں ہوں گی آصف!" ـــــ میجر سمیع نے بڑی سنجیدگی سے کہا ـــــ "ابھی میں یہی کہوں گا کہ اس لڑکی سے ہماری ملاقات کراؤ"۔

"وہ کہتی ہے کہ وہ فرار ہو کر آئی ہے" ـــــ کیپٹن آصف نے کہا ـــــ "میں اسے اغوا کرتا ہوں اور اسے عام سے مکان میں رکھوں گا جس کی کوئی سیکیورٹی نہیں ہو گی۔ وہاں کسی آدمی کا پہرا بھی نہیں ہو گا۔ لڑکی سے کہوں گا کہ فرار ہو جاؤ۔ میں دیکھوں گا وہ کس طرح فرار ہوتی ہے"۔

"نہیں آصف!" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "یہ فضول باتیں ہیں۔ میں لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے ہمارے اتنے عزیز دوست کے دل میں ہمارے خلاف ایک غلیظ شبہ ہی نہیں ڈالا بلکہ تاثر ڈال دیا ہے کہ ہم اس کے دشمن ہیں"۔

"وہ کراچی چلی گئی ہے" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "اسے آنے دو.... لیکن یہ تو مجھے یقین ہے کہ اس اغوا میں میرے دونوں سالے 'اختر اور امجد' شامل تھے"۔

"وہ اغوا ہوئی ہی نہیں" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "وہ تمہارے دل میں تمہاری بیوی اور اپنی بیوی کے بھائیوں کی نفرت اور دشمنی پیدا کر رہی ہے اور تم اپنی بیوی اور سالوں سے انتقام لینے کے موڈ میں آ گئے ہو۔ سیدھی بات ہے میرے بھائی! تم بہت بڑے دھوکے میں آ گئے ہو۔ فوری طور پر تم یہ کرو کہ ٹھنڈے ہو جاؤ اور ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ ایسا نہ کر بیٹھنا کہ گھر جا کر بیوی اور پھر اس کے بھائیوں کے گلے پڑ جاؤ۔ کوئی پرابلم ہو تو ہمیں بتاؤ"۔

عثمان کے ان دونوں دوستوں نے ایسی ہی کچھ اور باتیں کر کے عثمان کو ٹھنڈا تو کر لیا لیکن وہ ٹھنڈا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا باہر نکل گیا۔

○

میجر سمیع اور کیپٹن آصف کو معلوم ہو چکا تھا کہ لڑکی فرار ہو گئی ہے۔ انہیں اختر نے

فون پر بتا دیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اکبر کے گاؤں جا کر بھی دیکھا گیا ہے۔ اکبر گاؤں نہیں گیا۔ میجر سمیع اور کیپٹن آصف اس فرار پر حیران نہ ہوئے۔ انہیں پہلے ہی شک تھا کہ یہ لڑکی کوئی معمولی لڑکی نہیں۔ اب انہوں نے عثمان کا ردِّعمل دیکھا اور یہ سنا کہ لڑکی ان پر آبروریزی کا الزام لگا رہی ہے تو ان کی اس رائے کی بھی تصدیق ہو گئی کہ یہ لڑکی کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

"آصف یار!" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "اس لڑکی اور اس کے رِنگ کو تو شاید ہم پکڑ ہی لیں گے لیکن عثمان کی ذہنی حالت دیکھ کر مجھے اس کا غم لگ گیا ہے۔ یہ تو خطرناک حد تک انتقامی کارروائی کر گزرے گا۔ اسے کس طرح اپنے کنٹرول میں لیا جائے!"

"یہ کہتا ہے لڑکی کراچی چلی گئی ہے" ـــــ آصف نے کہا۔

"یہ تو اچھا ہُوا ہے" ـــــ سمیع نے کہا ـــــ "اسے جانا ہی تھا' ہم جو اسے کہتے رہے ہیں کہ اپنی اصلیت بتاؤ اس سے وہ انڈر گراؤنڈ ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے اب وہ عثمان سے کبھی نہیں ملے گی"۔

"ان کا نوکر بڑا ہی کچّا نکلا" ـــــ کیپٹن آصف نے کہا ـــــ "وہ بھی لاپتہ ہو گیا ہے"۔

"نوکر کو تو اچھی خاصی رقم مل گئی ہو گی" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "وہ اب واپس نہیں آئے گا"۔

سمیع اور آصف دفتر سے نکلے اور ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

"عثمان ان دوستوں سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ اس پر خاموشی طاری تھی۔ وینا نے دو تین بار پوچھا بھی کہ خیریت تو ہے۔ عثمان نے ہر بار پھیکی سی مسکراہٹ سے ٹال دیا۔ وینا کو معلوم نہ تھا کہ اس خاموشی میں کتنا بڑا طوفان اٹھ رہا ہے۔

رات خیریت سے اور خاموشی سے گزر گئی۔ صبح عثمان وَردی پہن کر جانے لگا تو اخبار آ گیا۔ عثمان نے کھڑے کھڑے اخبار کی سرخیاں دیکھیں پھر اندرونی صفحے الٹے اور ایک خبر پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔

"وینا!" ـــــ عثمان نے اپنی بیوی کو بلایا ـــــ "یہ فوٹو پہچانو"۔

وینا اخبار میں ایک خبر کے ساتھ چھپی ہوئی فوٹو کو دیکھنے لگی۔ خبر یہ تھی کہ ایک لاش نہر میں بہتی ہوئی نکالی گئی ہے۔ خبر میں عوام سے کہا گیا تھا کہ اس لاش کو پہچانیں اور یہ

جس کسی کا بھی آدمی ہو وہ فلاں ہسپتال کے مُردہ خانے میں آکر لاش شناخت کرے اور لے جائے۔ خبر کے ساتھ مرنے والے کے چہرے کی بڑی صاف فوٹو تھی۔

"یہ تو ہمارا نوکر اکبر لگتا ہے" ـــــ وینا نے کہا۔

"وہی ہے" ـــــ عثمان نے کہا اور اخبار وینا کے ہاتھ میں چھوڑ کر اپنے دفتر کو روانہ ہو گیا۔

"اس کے جانے کے بعد وینا نے اپنے گھر فون کیا اور اختر کے ساتھ بات کی۔

"میں دیکھ چکا ہوں" ـــــ اختر نے کہا ـــــ "یہ اکبر کی ہی لاش ہے۔ میں ہسپتال جا رہا ہوں لیکن میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ یہ ہمارا نوکر تھا۔ اس نے ہمیں دھوکہ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے دھوکہ نہ ہی دیا ہو۔ اس لڑکی کے ساتھیوں نے اسے قتل کر دیا ہو لیکن میں اس لاش کو تسلیم نہیں کروں گا.... فون پر کوئی اور بات نہ کرنا"۔

اختر اور امجد ہسپتال چلے گئے اور متعلقہ اہلکاروں کی رہنمائی میں مُردہ خانے میں گئے اور لاش دیکھی۔ وہ ان کے نوکر اکبر کی ہی لاش تھی۔ ان دونوں بھائیوں کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ بدقسمت انسان اپنی بہنوں کی شادی کرنے کے لئے بیس ہزار کے لالچ میں اس لڑکی کے چکمے میں آ گیا تھا۔

بیس ہزار کے لالچ میں مارے جانے والے اکبر کی لاش لاوارث قرار دے دی گئی۔ اس کے نصیب میں کفن نہیں تھا' جنازہ بھی نہیں۔ بیس ہزار کے تصور نے اسے کیا کیا خواب دکھائے ہوں گے۔ تصوروں میں اس نے بہنوں کی ڈولیاں اٹھتی دیکھی ہوں گی مگر بہنیں اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ ان غریب لوگوں نے کہاں اخبار دیکھنا تھا کہ انہیں پتہ چلتا کہ بہنوں کی ڈولیاں اٹھوانے والے کا اپنا جنازہ اُٹھ رہا ہے۔ نہ انہوں نے اخبار دیکھا نہ انہیں کسی نے بتایا کہ ان کے بھائی کی لاش ہسپتال کے مُردہ خانے میں پڑی ہے۔

دو تین دنوں بعد ایک میڈیکل کالج سے ہسپتال والوں کو ڈیمانڈ ملی کہ کالج میں ایک دو لاشوں کی ضرورت ہے۔ میڈیکل سٹوڈنٹس کے لئے کالجوں میں لاشیں رکھی جاتی ہیں اور سٹوڈنٹ ان لاشوں کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔

"....اور یہ دیکھو" ـــــ ایک میڈیکل کالج کا پروفیسر اکبر کی لاش کا سینہ چیر کر اور دل باہر نکال کر کلاس کو دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا ـــــ "یہ ہے دل۔ میں اس دل کی ڈائی

سیکشن کر کے تمہیں اس کے مختلف حصے اور اس کی کارکردگی سمجھاؤں گا"۔

"سر!" ـــــ ایک امیرزادے اور نالائق سٹوڈنٹ نے از راہِ مذاق پوچھا ـــــ "پہلے ہمیں دل کا وہ خانہ دکھائیں جس میں خواہشات ہوتی ہیں اور پھر ہمیں وہ خانہ دکھائیں جس میں محبت ہوتی ہے"۔

کلاس نے قہقہہ لگایا۔ پروفیسر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے غصیلی نگاہوں سے اُس لڑکے کی طرف دیکھ جس نے یہ سوال پوچھا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ لڑکا کون ہے اور کس کا بیٹا ہے تو اس کے چہرے سے غصے کے تاثرات صاف ہو گئے۔ اُسے خیال آ گیا کہ یہ لڑکا اس خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس نے وزیر پیدا کئے ہیں اور سیاسی لیڈری ان کا آبائی پیشہ ہے۔

"دل گوشت کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے" ـــــ پروفیسر نے کھسیانا سا ہو کر کہا ـــــ "اس میں کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ خواہشات' محبت اور نفرت ذہن میں ہوتی ہیں اور ذہن دل کی طرح گوشت کا لوتھڑا نہیں ہوتا"۔

امیروں کے گھروں میں نوکری چاکری کرنے والے غریب آدمی کی چیری پھاڑی ہوئی لاش ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے والے امیرزادوں کے لئے مذاق کا ذریعہ بنی رہی۔ ایک لڑکے نے اس کا دل اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا اور اپنے سامنے ٹیبل کی دوسری طرف کھڑے لڑکے کی طرف پھینکا۔ اس لڑکے نے ایک اور لڑکے کی طرف پھینکا۔ وہ لڑکا دل ایک اور لڑکے کی طرف اچھالنے لگا تھا کہ پروفیسر نے اس کے ہاتھ سے دل چھین لیا اور لیکچر شروع کر دیا۔

کچھ دنوں تک اکبر کی لاش مختلف کلاسوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ہاتھوں چیری پھاڑی جاتی رہی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غائب ہو گئی۔ اسے لوسی کے پہرے پر بٹھانے والے اس سے لاتعلق ہو چکے تھے۔ اگر کسی کو اس کا غم تھا تو وہ اس کے ماں باپ اور اس کی بہنیں تھیں اور بہنیں اپنی تمام تر امیدیں اس بھائی سے لگائے ہوئے تھیں کہ وہ انہیں عزت سے گھر سے رخصت کرے گا۔ انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ وہ تو خود ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔

○

صغیر کو ایک خفیہ کمرے میں ایذا رسانی کے عمل میں ڈالا گیا تھا۔ اُس نے قوتِ

برداشت کا ایسا معجزاتی مظاہرہ کیا تھا کہ اسے اذیتیں دینے والے بھی حیران تھے۔ لُوی کا ہوائی جہاز جب کراچی ایئرپورٹ پر اُترا تھا تو اس وقت صغیر اس خفیہ کمرے میں بے ہوش پڑا تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ ہوش میں آ گیا۔ سب سے پہلے اس کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے کہ اللہ میرے ساتھ ہے' اللہ ہی میری مدد کرے گا....."

چار منٹ بعد ایک آدمی کمرے میں داخل ہُوا۔

"میرے جسم کے ٹکڑے کر دو' کافرو!" —— صغیر نے کربناک سی آواز میں کہا۔ "میں تمہارے راستے پر نہیں چلوں گا"۔

"اٹھو یار!" —— اُس آدمی نے دوستانہ لہجے میں کہا —— "ہوں تو میں بھی ہندو ہی لیکن میرے ہاتھوں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی"۔

اس آدمی کو صغیر پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی نے صاف الفاظ میں صغیر کو بتا دیا کہ وہ ہندو ہے۔

"مجھے آج پتہ چلا ہے کہ انہوں نے تمہیں یہاں رکھا ہُوا ہے" —— ہندو نے کہا —— "مجھے ان لوگوں پر بہت غصہ آیا۔ صاف بات ہے میرے دوست! تم نے ہمارے لئے جو کام کئے ہیں وہ ہمارا اور کوئی ایجنٹ نہیں کر سکا۔ اس لائن کا جتنا تجربہ مجھے ہے' اتنا ان لوگوں کو نہیں جو تمہارا یہ حال کر رہے ہیں۔ ہم دیکھ لیتے ہیں کہ جو آدمی ایک بار انکار کر دے وہ دوبارہ ہاتھ نہیں آتا۔ اگر ہاتھ آ بھی جائے تو خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ میں یہاں ہوتا تو تمہارے ساتھ ایک معاہدہ کر کے تمہیں عزت سے رخصت کر دیتا۔ یہ بیوقوف لوگ ہیں"۔

اس ہندو نے دروازے میں جا کر کسی کو آواز دی اور کہا کہ ایک گلاس گرم دودھ اور کچھ کھانے کے لئے فوراً لاؤ۔ اس نے صغیر کو سہارا دے کر اٹھایا اور کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر اس نے کمرے میں رکھی ہوئی ایک تپائی صغیر کے آگے رکھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دودھ' فرائی انڈے اور ٹوسٹ وغیرہ پہلے ہی تیار رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب چیزیں صغیر کے آگے رکھ دی گئیں۔

"لو میرے بھائی!" —— ہندو نے صغیر سے کہا —— "یہ لو ناشتہ کر لو۔ اب تمہیں کوئی نہیں کہے گا کہ ہمارے ساتھ رہو۔ میں تمہارے ساتھ ایک دو باتیں کروں گا پھر تم چلے جانا"۔

صغیر بھوک محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے انڈے اور ٹوسٹ کھا لئے اور دودھ کا گلاس پی گیا۔

"بات کیا کرو گے؟" —— صغیر نے اس ہندو سے پوچھا۔

"تم خود عقل والے ہو" —— ہندو نے کہا —— "تمہیں آزاد چھوڑ کر ہمارے لئے جو خطرہ پیدا ہوتا ہے وہ تم سمجھ سکتے ہو۔ اس کی پیش بندی یہی ہو سکتی ہے کہ تمہیں قتل کر کے لاش غائب کر دی جائے جو میں کسی قیمت پر نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ تم نے ہمارے لئے جو کام کئے ہیں' تمہیں اس کا کچھ صلہ ملنا چاہئے۔ دوسرا شریفانہ طریقہ یہ ہے کہ تم سچے دل سے وعدہ کرو کہ ہمیں دھوکہ نہیں دو گے اور ہماری نشاندہی نہیں کرو گے.... کہو کیا کہتے ہو۔ اگر میری یہ بات نہیں مانو گے تو بھی میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے جسم کو کوئی ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہاں جو بھی آئے گا' تمہاری عزت کرے گا"۔

صغیر کے چہرے پر رونق سی آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے ہاتھ لمبا کر کے اس ہندو کے کندھوں پر رکھا اور اسے اپنے قریب کر لیا۔

"تم تو بڑے پیارے آدمی ہو میرے بھائی!" —— صغیر نے ایسے لہجے میں کہا جیسے ابھی ابھی اس کمرے میں آیا ہو اور وہ یہاں کے لوگوں کی نگاہوں میں بڑا ہی قابلِ اعتماد آدمی ہو۔ اس نے عجیب سی بے تکلفی سے کہا —— "میں تم لوگوں کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ دراصل بات یہ ہے کہ بھائی کی موت نے میرے دماغ پر بہت بُرا اثر کیا ہے" —— اس نے افسوس کا اظہار کرنے کی بجائے مسکراتے ہوئے کہا —— "مرنا تو ہر کسی نے ہے' ہو سکتا ہے میں پھر تمہارے پاس ہی آ جاؤں' میری طرف سے مطمئن رہو"۔

ہندو اٹھ کر دروازے تک گیا اور بڑی زور سے بولا —— "برتن لے جاؤ"۔

تئیس چوبیس برس عمر کی ایک دلنشیں لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بظاہر سیدھی سادی لڑکی تھی' اس کے بال کٹے ہوئے نہیں تھے۔ اس کے سر پر دوپٹہ تھا لیکن اس کے سرخ و سپید رنگ' آنکھوں کی چمک اور انداز سے پتہ چلتا تھا کہ پڑھی لکھی اور اونچے خاندان کی لڑکی ہے لیکن ظاہر یہ ہوتا تھا کہ وہ اس گھر کی نوکرانی ہے۔ وہ کمرے میں آئی تو ہندو جس کا نام سریش کمار تھا' صغیر سے یہ کہہ کر باہر چلا گیا کہ کچھ دیر آرام کر لو' میں ایک گھنٹے تک واپس آ جاؤں گا۔

"بڑے اطمینان سے آرام کرو" — سریش کمار نے کہا — "میں تمہیں یقین دلا چکا ہوں صغیر بھائی! تمہیں غصیلی آنکھ سے بھی کوئی نہیں دیکھے گا"۔

"یہاں آئے گا ہی کوئی نہیں" — لڑکی بولی — "آپ نے سب کو منع تو کر ہی دیا ہے"۔

"اور دیکھو مُنّی!" — سریش نے لڑکی سے کہا — "تم اس کا خیال رکھنا۔ اسے میرا بھائی سمجھو"۔

"ہاں ہاں" — منی نے بڑے پیارے سے انداز سے کہا — "میں خیال نہیں رکھوں گی تو اور کون رکھے گا! آپ جائیں"۔



صغیر اٹھا۔ اس نے انگڑائی لی جیسے سو کر اٹھا ہو۔ وہ جوان آدمی تھا۔ اس کی نظریں اس دلکش لڑکی پر لگی ہوئی تھیں۔ لڑکی کو برتن اٹھا کر نکل جانا چاہئے تھا لیکن وہ وہیں موجود رہی۔ کمرے میں ایک پلنگ پڑا ہوا تھا۔ لڑکی نے پلنگ پوش سیدھا کیا اور صغیر سے کہا کہ وہ لیٹ جائے۔

"تم کون ہو؟" — صغیر نے مُنّی سے پوچھا۔

"نوکرانی سمجھ لو" — مُنّی نے جواب دیا — "لیکن اس قسم کی نوکرانی نہیں جو عام گھروں میں ہوتی ہیں۔ میں کچھ پڑھی ہوئی بھی ہوں اور تم جانتے ہو کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں اور یہاں کیا ہوتا ہے اس لئے مجھے رکھا گیا ہے کہ میں سب کچھ سمجھتی ہوں .... میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں مسلمان ہوں۔ اب کوئی غم اور فکر نہ کرنا۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ لوگ تمہاری بہت تعریفیں کرتے ہیں"۔

ناشتے کے بعد صغیر میں ایک تغیّر آگیا تھا۔ وہ جیسے بھول ہی گیا تھا کہ اسے کتنی زیادہ ایذا رسانی میں سے گزارا گیا ہے۔ اس پر ایسا تاثر طاری ہوتا جا رہا تھا جیسے وہ اس گھر کا ایک معزز مہمان ہو۔ وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔

"تم چلی جاؤ گی؟" — صغیر نے مُنّی سے پوچھا۔

"ضروری نہیں" — مُنّی نے جواب دیا — "کہتے ہو تو تمہارے پاس رُک جاتی ہوں"۔

"میرے پاس بیٹھو گی؟"

"کیوں نہیں!" — مُنّی نے کہا اور صغیر کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی اور صغیر کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

صغیر کا جسم دکھ رہا تھا لیکن اسے وہ زیادہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ لیٹے لیٹے اٹھا اور نیم دراز ہو گیا۔ مُنّی اس کے اور قریب ہو گئی۔ صغیر پر رومانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے ایک بازو منی کے گرد لپیٹ کر اسے اور زیادہ قریب کر لیا۔

"میں تمہیں سچی بات بتاؤں صغیر!" — لڑکی نے جذباتی سے انداز سے کہا — "میں نے تمہیں پہلے بھی دیکھا تھا اور تم مجھے اتنے پیارے لگے کہ تم سے ملنے اور کچھ دیر تمہارے پاس بیٹھنے کو دل تڑپتا تھا۔ تم اتنے خوش طبع ہو کہ تمہاری باتیں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ تم نے میری طرف کبھی توجہ ہی نہیں دی تھی۔ میں نے اب خود سریش کمار سے کہا تھا کہ تمہارے کام کاج کے لئے مجھے موقع دے"۔

صغیر نے دروازے کی طرف دیکھا جس کے کواڑ بند تھے لیکن چٹخنی نہیں چڑھی ہوئی تھی۔

"ابھی نہیں" — مُنّی نے کہا — "دروازہ بند نہیں کریں گے۔ میں اسی کوٹھی میں رہوں گی اور تمہارے پاس زیادہ وقت کے لئے آؤں گی"۔

وہ ایک دوسرے کے اتنا قریب ہو گئے کہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں محسوس کرنے لگے اور ان کی سانسیں ٹکرانے لگیں لیکن مُنّی نے بات آگے نہ بڑھنے دی۔ وہ پانی سے بھرا ہوا ایسا پیالہ بن گئی جو ہونٹوں کے ساتھ لگ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ صغیر پر رومانی دیوانگی سی طاری ہو گئی۔

"تم کبھی انڈیا گئے ہو؟" — منی نے پوچھا۔

"نہیں" — صغیر نے جواب دیا — "جانے کو دل بڑا کرتا ہے لیکن طبیعت کچھ اُکھڑی گئی ہے"۔

"لو، یہ بھلا کیا بات ہوئی" — مُنّی نے اپنا ایک گال اس کے گال کے ساتھ دبا کر بچوں کی سی شوخی سے کہا — "تم ایک بار چلو تو سہی۔ ایک تو وہ لوگ جن کے پاس جاؤ گے، تمہیں شہزادوں کی طرح ہاتھوں پر اٹھائیں گے۔ پاکستانی کی تو وہ بہت ہی عزت کرتے ہیں اور تم نے ان لوگوں کے لئے جو کام کئے ہیں، اس کا تو تمہیں ایسا صِلہ دیں گے کہ تم وہاں سے آنا ہی نہیں چاہو گے۔ انڈیا بہت خوبصورت ملک ہے۔ تمہیں ایسی ایسی

جگہیں دکھائیں گے جو تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔ وہاں سے تم ہی نہیں چاہو گے"۔

"تم ساتھ چلو گی؟"

"ہاں ہاں" — مُنی نے جواب دیا — "میں ساتھ ہوں گی' اور وہاں تمہیں ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت لڑکی ملے گی"۔

اس لڑکی نے انڈیا کی ایسی خوبصورت تصویر پیش کی کہ صغیر بڑے خوبصورت تصوّروں میں کھو گیا۔ مُنی نے اپنی رومانی حرکتوں اور جذبات کو مشتعل کر دینے والے انداز سے اس کے تصوروں کو بیداری کے خواب بنا دیا۔

"میں نے سنا ہے تم ان لوگوں سے الگ ہو رہے ہو!" — مُنی نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا — "یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے۔ میں کچھ نہیں کہوں گی لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ ایک بار انڈیا کی سیر کر لو۔ انہیں کہہ دو کہ میں تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہوں"۔

صغیر بڑے حسین خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔ منی اسے فضا کی بلندیوں میں اُڑاتی ہوئی لے گئی اور صغیر کی آنکھ لگ گئی۔



صغیر میں یہ تغیر پیدا کیا گیا تھا۔ اس رِنگ کے لیڈر مہندر آہوجا نے لُوسی کے اغوا اور اس کی واپسی کے بعد رِنگ کے چیدہ چیدہ افراد کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اس مسئلے پر بحث مباحثہ کیا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ ایک مسئلہ تو ان کے سامنے یہ تھا کہ اس کوٹھی کی نشاندہی ہو گئی ہے' کیا یہ کوٹھی چھوڑ دی جائے یا اسی میں رہائش رکھ کر کوئی اور پردہ ڈالا جائے۔ اس مسئلے کا حل ان سب نے یہ سوچا اور فیصلہ کیا کہ کوٹھی چھوڑنا زیادہ خطرناک ہو گا کیونکہ یہ شک پیدا ہو گا کہ یہاں مشکوک لوگ رہتے تھے اور اب وہ کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ اس طرح انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

دوسرا مسئلہ صغیر کا تھا کہ اس کا کیا کیا جائے۔

"اس کا وہی حل بہتر ہے" — ایک نے کہا — "اسے بھی اسی طرح غائب کر دو جس طرح ان کے نوکر کو کیا تھا۔ اس کی باتیں آپ نے سنی ہیں۔ کیا کوئی آدمی اتنی اذیت برداشت کر سکتا ہے؟ بے ہوش ہو کر ہوش میں آتا ہے تو اس کی زبان پر وہی انکار

ہے کہ میں تمہارے راستے پر نہیں آؤں گا"۔

"میری رائے کچھ اور ہے" — مہندر نے کہا — "میں نے اس شخص میں جو خوبیاں دیکھی ہیں وہ اور کسی پاکستانی ایجنٹ میں نہیں دیکھیں۔ یہی ایک خوبی دیکھ لو کہ اس قدر سخت ایذا رسانی شاید گھوڑا بھی برداشت نہ کر سکے لیکن اس شخص کی زبان سے جو الفاظ نکل گئے' انہی پر قائم ہے۔ ہمیں ایسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے ساتھ تھا تو اس نے پوری وفاداری سے ہمارا ہر کام کیا۔ اس نے ایسی جگہوں پر بھی بم رکھ دیئے تھے جہاں تک اور کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس میں عقل اور ذہانت بھی ہے۔ میں چاہتا ہوں ایسے آدمی کو ہم ضائع نہ کریں"۔

"لیکن کس طرح!" — ان میں سے کسی نے پوچھا۔

"دوسرا طریقہ استعمال کرو" — مہندر نے کہا — "برین واشنگ.... کیا تم یہ کام نہیں کر سکتے؟.... برین واشنگ کرو اور اسے سرحد پار لے چلو۔ ٹھیک ہو جائے گا"۔

اس میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ صغیر کی برین واشنگ کی جائے۔ یہ کام اس ہندو اور اس لڑکی کے سپرد کیا گیا تھا جنہوں نے اپنے نام سریش کمار اور منی بتائے تھے۔ اُن دونوں نے فوراً" اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ یہ کام ناشتے سے شروع ہوتا تھا۔ دودھ میں وہ نشہ آور دوائی ملائی گئی تھی جو ذہن کو سکون دیتی ہے اور دماغ پر بھی اثر کر کے سوچوں اور خیالوں کا رخ موڑ دیتی ہے۔

برین واشنگ کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ خاصی مدت تک ایذا رسانی کا طریقہ استعمال ہوتا رہا لیکن جدید دَور کی میڈیکل سائنس نے ایسی دوائیاں تیار کر لی ہیں جو دماغ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ دماغی قوت کا رخ موڑنے کے لئے تجربہ کار آدمی ایسی باتیں کرتے ہیں جو دوائی کے اثرات کے ساتھ مل کر خیالات کو ایک خاص راستے پر ڈال دیتی ہیں۔ یہی دوائیاں کھانے پینے کی اشیاء میں مسلسل دی جاتی ہیں اور متعلقہ آدمی کو ایک طرح کا باتوں سے ہپناٹائز کیا جاتا رہتا ہے۔

صغیر کو جو دودھ پلایا گیا تھا اس میں ایک خاص دوائی شامل کی گئی تھی۔ اس دوائی کے اثرات کو اور زیادہ بڑھانے کے لئے ایک دلکش لڑکی کو استعمال کیا گیا تھا۔ یہ عمل یہیں پر ختم نہیں ہو گیا تھا۔ ہر کھانے کے ساتھ صغیر کو یہ دوائی دینی تھی۔ باقی کام سریش اور مُنی نے کرنا تھا۔ مُنی اپنے کام کی ماہر تھی۔ وہ طوائف نہیں تھی۔ اسے یہ ٹریننگ حاصل تھی

کہ جس آدمی کو پھانسنا ہو اس کے اتنا قریب ہو جاؤ کہ وہ آدمی دیوانہ ہو جائے۔ پھر اس کے لئے سراب بن جاؤ یعنی متعلقہ آدمی کو تشنہ رکھو۔ مُنی نے صغیر کے ساتھ یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔



میجر عثمان کی ذہنی اور جذباتی حالت پاگلوں جیسی ہو چکی تھی۔ اس کے لئے ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ لُوسی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ لوسی نے اسے اس خوش فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ وہ اس پر دل و جان سے فدا ہے اور جس کے ساتھ اس کی منگنی ہوئی ہے' اسے وہ بالکل ہی پسند نہیں کرتی۔

ایک وجہ اور بھی تھی جو میجر عثمان کو پریشان کر رہی تھی۔ وہ یہ کہ وہ تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور لوسی اسے بیوقوف بناتی رہی ہے۔ مسئلہ دراصل یہ تھا کہ لوسی میجر عثمان کے لئے ایک نشہ بن گئی تھی اور عثمان اسی نشے کا عادی ہو گیا تھا اور اس کی حالت نشے سے ٹوٹے ہوئے نشئی جیسی ہو گئی تھی۔ لوسی نے اسے ذہنی فرار اور لذّت پرستی کا عادی بنا دیا تھا۔ یہ ایک قسم کی برین واشنگ تھی جس نے میجر عثمان کو زندگی کے حقیقی راستوں اور حقائق سے متنفر کر دیا تھا۔

انسان کی سب سے بڑی کمزوری خوشامد پسندی ہے۔ ہر انسان اہمیت کا متمنی ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے یہ احساس دلوایا جاتا رہے کہ اس دنیا میں تم جیسا ارفع و اعلیٰ کوئی نہیں۔ لُوسی اور اس جیسی عورتوں کو یہی ٹریننگ حاصل ہوتی ہے کہ وہ ایک تھرڈ کلاس آدمی کو بھی فرسٹ کلاس آدمی ثابت کر دیں۔ آدمی اپنے گھر جاتا ہے تو اسے کچھ مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر اس کے بچے ہیں تو بچے اپنے مطالبات پیش کرتے ہیں۔ بیوی ہے تو وہ گھر کے ایک دو مسئلے پیش کرے گی۔ زندگی اسی کو کہتے ہیں لیکن لوسی جیسی عورتیں جسے پھانس لیتی ہیں وہ یہی طریقہ اختیار کرتی ہیں کہ اس آدمی کو خیالوں ہی خیالوں میں اور باتوں ہی باتوں میں شہزادہ بنا دیتی ہیں اور پھر اس سے وہ کام لیتی ہیں جس کی خاطر وہ برین واشنگ کرتی ہیں۔ جس آدمی کی برین واشنگ ہو چکی ہو اسے اپنے بیوی بچے اور گھر کا کوئی فرد اچھا نہیں لگتا۔ وہ اپنے آپ کو بڑی اونچی سطح پر رکھتا ہے جو دراصل خیالی ہوتی ہے اور گھر کے افراد کو وہ حقیر اور فضول افراد سمجھتا ہے۔

عثمان اسی سطح پر پہنچ گیا تھا۔ لُوسی وہاں سے چلی گئی تھی اور عثمان کو بڑے خوبصورت ہوائی قلعے میں اکیلا چھوڑ گئی تھی۔ اس کا ردِعمل ویسا ہی تھا جیسا ہیروئن کے نشئی کا اس وقت ہوتا ہے جب اس کے پاس ہیروئن نہیں ہوتی۔ وہ غصے سے بپھرا رہتا تھا۔ مزاج چڑچڑا ہو گیا تھا۔ وہ گھر میں وینا کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا تھا۔ مثلاً" وہ دفتر سے گھر پہنچا تو وینا نے کہا ___ "آپ آ گئے ہیں" ___ عثمان بھڑک کر بولا ___ "تو کیا واپس چلا جاؤں؟"

وینا نے گوشت پکایا اور جب کھانا سامنے آیا تو عثمان غصے میں آ گیا اور یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ یہ کیا پکا کر میرے آگے رکھ دیا ہے۔ میں نے آج سبزی کھانی تھی۔ وینا نے ایک دو روز پہلے کی پکی ہوئی سبزی فریج میں سے نکال کر گرم کی اور اس کے آگے رکھ دی تو عثمان بولا ___ "یہ سبزی تو میں ایک مہینے سے فریج میں پڑی دیکھ رہا ہوں"۔

میجر عثمان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ وینا کے ساتھ کم سے کم بات کرے۔ وینا جانتی تھی کہ عثمان کے اس ابنارمل سلوک کی وجہ کیا ہے مگر وہ برداشت کر رہی تھی۔



میجر عثمان ایم اے خان کی کوٹھی میں چلا گیا اور مندر سے ملا جو اس کے لئے اور سارے پاکستان کے لئے ایم اے خان بنا ہوا تھا۔ اس نے اور اس عورت نے جو ایم اے خان کی بیوی اور لوسی کی ماں کا رول ادا کر رہی تھی' عثمان کا پُرتپاک استقبال کیا اور اس کے ساتھ ہی وہ اداس اور پریشان ہو گئے جیسے ان پر غموں کا بوجھ آ پڑا ہو۔

"لوسی کہاں ہے؟" ___ میجر عثمان نے غم زدہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ تمہیں بتا کر گئی ہے" ___ مندر نے جواب دیا ___ "اس نے تمہیں فون کر دیا تھا کہ وہ کراچی جا رہی ہے"۔

"وہاں کا ایڈریس؟" ___ میجر عثمان نے پوچھا ___ "فون نمبر؟"

"کیا کرو گے ایڈریس اور فون نمبر پوچھ کر؟" ___ مندر نے کہا ___ "کیا یہ ایک آزاد ملک ہے؟ کیا ہم مسلمان کہلانے کے قابل رہ گئے ہیں؟ مجھے تو اپنی بیٹی کا غم لگا ہوا ہے کہ خودکشی ہی نہ کر لے۔ اسے اغوا کیا گیا' خراب کیا گیا اور پھر چھوڑ دیا گیا۔ ہمارے ملک میں قانون تو رہا ہی نہیں۔ تم کیسے فوجی افسر ہو کہ ان بدمعاشوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمیں تین بار ٹیلی فون پر دھمکی مل چکی ہے کہ ہم نے کوئی کارروائی کی تو اس کا

انجام ہمارے لئے بہت بُرا ہو گا۔ سچی بات ہے عثمان بیٹا! ہم تو ڈر گئے ہیں، کہیں ہماری کوٹھی میں ڈاکہ نہ پڑ جائے۔ لُوسی نے تمہیں بتا دیا ہے کہ یہ بدمعاش کون ہیں"۔

"میں ان بدمعاشوں کو جانتا ہوں" —— عثمان نے کہا —— "لیکن میں لُوسی سے ملنا چاہوں گا"۔

"وہ تمہیں مل جائے گی" —— مندر نے کہا —— "کچھ دن انتظار کر لو"۔

"مجھے ایک بات سمجھا دو" —— میجر عثمان نے کہا —— "لُوسی نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ وہ اسلام آباد جا رہی ہے اور وہاں سے کراچی چلی جائے گی۔ آپ مجھے اس کا ایڈریس یا فون نمبر کیوں نہیں بتاتے؟"

"میرا خیال ہے میجر عثمان!" —— مندر نے کچھ اور ہی طرح کی سنجیدگی سے کہا —— "اس حقیقت کو نہ بھولو کہ لوسی کے ساتھ ابھی تمہارا تعلق محض دوست کی حیثیت سے ہے۔ وہ ابھی کسی اور کی منگیتر ہے۔ میں ابھی مناسب نہیں سمجھتا کہ تمہیں اس معاملے میں زیادہ انوالو کروں"۔

"اس کا منگیتر کہاں ہے؟" —— میجر عثمان نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو اس کا بھائی مر گیا ہے" —— مندر نے کہا —— "وہ اپنے گھر ہو گا"۔

"کیا آپ اس کے بھائی کے مرنے پر گجرات گئے تھے؟"

"میں گیا تھا" —— مندر نے جھوٹ بولا —— "صبح گیا شام کو جنازہ پڑھ کر آ گیا تھا"۔

"آپ نے یہ جھوٹ کیوں بولا ہے؟" —— میجر عثمان نے پوچھا اور مندر کا جواب سُنے بغیر کہنے لگا —— "جس روز صغیر کا بھائی فوت ہُوا ہے اس روز ڈیڑھ دو بجے آفس سے آتے ہوئے میں نے آپ کو یہاں دیکھا تھا"۔

"تمہیں غلطی لگی ہے" —— مندر نے کہا —— "وہ ایک روز پہلے فوت ہُوا تھا"۔

"آپ کہتے ہیں کہ لوسی کے ساتھ میرا ابھی کوئی تعلق نہیں" —— میجر عثمان نے ابنارمل سی آواز میں کہا —— "اس تھوڑے سے عرصے میں میں آپ کو کم و بیش ڈیڑھ لاکھ روپیہ کِھلا چکا ہوں۔ آپ کے ڈرائنگ روم میں جو قالین بچھا ہُوا ہے وہ میرا بچھایا ہُوا ہے اور یہ میں نے بتیس ہزار روپے میں خریدا تھا۔ اس کے علاوہ لوسی نے خود جو تحفے مجھ سے وصول کئے اور جو اس نے مجھ سے آپ کو دلوائے اور ہوٹلوں میں اس نے میری جو

دولت خرچ کروائی وہ حساب الگ ہے۔ آپ کہتے ہیں لُوسی کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں"۔

"تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم ہمیں لوسی کی قیمت دیتے رہے ہو؟" —— مندر نے پوچھا۔

"میں سو فیصد یہی کہنا چاہتا ہوں" —— میجر عثمان نے کہا۔

"محبت میں انسان جان تک کی قربانی دے دیتا ہے عثمان بیٹا!" —— مندر نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

"میں جان کی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہوں" —— عثمان نے کہا —— "لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ کوئی ایسی بات ہے جس پر آپ پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

"تم سے کوئی پردہ نہیں عثمان!" —— مندر نے کہا —— "دراصل ہم لوگوں پر خوف و ہراس سا طاری ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی کیا کروں اور کیا کہوں۔ یہ نہ بھولو اس بیٹی کا باپ میں ہوں جس کے ساتھ یہ سلوک ہُوا ہے۔ مجھے جذباتی سہارے کی ضرورت ہے جو تم سے ہی مل سکتا ہے۔ تم میرے پاس آتے رہنا۔ لُوسی تمہیں مل جائے گی"۔

میجر عثمان وہاں سے آ گیا۔ اس کی ذہنی حالت نارمل نہیں تھی۔ ایک تو لُوسی اُس کے لئے بہت بڑا اور ٹیڑھا مسئلہ بن گئی تھی اور دوسرا مسئلہ جو اسے پریشان کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ وینا کے بھائیوں کے نوکر اکبر کو قتل کس نے کیا۔ عثمان ایم اے خان کی کوٹھی سے نکل کر گاڑی میں بیٹھا تو یہی سوال اسے پریشان کر رہا تھا۔ اب مندر نے اسے لُوسی کا ایڈریس اور فون نمبر دینے سے ٹال دیا تھا تو اس کے ذہن میں ہلکا سا ایک شک سر اٹھانے لگا تھا۔

وہ اپنے ذہن میں لُوسی کی اس کہانی کو یاد کرنے لگا جو لُوسی نے اسے اپنے فرار کے متعلق سنائی تھی۔ لُوسی نے اسے یہ تو بتا دیا تھا کہ ایک نوکر اس کمرے میں اس پر پہرہ دیتا تھا۔ لُوسی نے عثمان کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس نے اس نوکر کو کس طرح بے وقوف بنایا اور وہاں سے اس نوکر کی مدد سے فرار ہوئی تھی لیکن عثمان کو بعد میں پتہ چلا کہ نوکر تو قتل ہو گیا ہے۔ لُوسی کو عثمان نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اکبر کو قتل کر دیا گیا تھا یا کیا ہُوا تھا۔

عثمان کے ذہن میں ایک سوال اور پیدا ہُوا ــــــ "کیا اپنے نوکر کو وینا کے بھائیوں نے اس غصے میں خود ہی قتل کر دیا ہے کہ اس نے اپنی ڈیوٹی میں کوتاہی کی تھی؟" ــــــ اسے اس سوال کا جواب مل رہا تھا۔ ایک خیال اسے یہ آیا کہ ہو سکتا ہے نوکر نے مالکوں کے ڈر سے خُودکشی کر لی ہو۔



عثمان کی بیوی وینا کی ذہنی حالت ایسی ہو گئی تھی جو اس کے لئے عجیب و غریب تھی اور ناقابلِ برداشت بھی۔ گھروں پر مشکلات آتی ہی رہتی ہیں۔ کبھی گھر کا کوئی فرد بیمار پڑ جاتا ہے۔ کوئی عزیز فوت ہو جاتا ہے۔ مالی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور ایسے ہی کچھ مصائب ہیں جو اچانک آ پڑتے ہیں۔ گھر والے ان مسائل یا مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں۔ چونکہ مسئلہ کوئی بھی ہو' وہ واضح ہوتا ہے اس لئے اس کے مطابق حل تلاش کیا جاتا ہے لیکن یہ مسئلہ ایسا تھا جس کا کم از کم وینا کو کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے اور بھائیوں سے بھی کہا تھا کہ اس کا خاوند پاگل ہو جاتا' اسے پاگل خانے میں داخل کرا دیتے تو اسے یہ تو پتہ چلتا کہ اس کے خاوند کا دماغ کس وجہ سے ماؤف ہو گیا ہے مگر یہاں صورتِ حال یہ تھی کہ خاوند بظاہر اچھا بھلا تھا لیکن اس کا دماغ اس کے قابو میں نہیں تھا۔ اس کی تو یہ حالت تھی جیسے اس پر کوئی آسیب طاری ہو اور وہ زندگی کے شب و روز اس آسیب کے زیرِ اثر گذار رہا ہو۔

وینا ایک مخلص اور وفاشعار بیوی تھی۔ کوئی اور ہوتی تو عثمان نے جو سلوک وینا کے ساتھ کیا تھا وہ کبھی برداشت نہ کرتی۔ وینا کو جب بھائیوں نے کہا تھا کہ لعنت بھیجو ایسے خاوند پر اور اپنے گھر آ بیٹھو' تم بوڑھی تو نہیں ہو گئیں تو وینا نے کہا تھا کہ یہ مسئلہ میرے لئے ایک چیلنج بن گیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اس خاوند کو اکیلا چھوڑ دوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے خاوند سے بے وفائی کر رہی ہوں اور اسے ایک انتہائی خطرناک عورت کے حوالے کر رہی ہوں۔

"خاوند میرا ہے" ــــــ وینا نے یہ الفاظ کئی بار اپنے عزیزوں سے' میجر سمیع اور کیپٹن آصف سے بھی کہے تھے ــــــ "میرا دماغ حاضر ہے۔ مجھ پر کسی آسیب کا اثر نہیں۔ میں اپنے خاوند کی نجات کے لئے اپنے جذبات کی اور اپنے بچوں تک کی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہوں"۔

یہ اس کا عزم تھا اور یہ اس کی نیت تھی لیکن حالات اس کے بس سے باہر تھے۔ اس کے بھائیوں نے لُوسی کے اغوا کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ وینا کو اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ بھائیوں کے کہنے پر چپ رہی تھی۔ اس کے بھائی بے وقار اور بدمعاش قسم کے آدمی نہیں تھے۔ عقل اور ہوش والے لوگ تھے۔ وینا دراصل یہ چاہتی تھی کہ عثمان کے ذہن میں اور کردار میں تبدیلی آئے اور وہ خود محسوس کرے کہ وہ ایک جادوگرنی کے قبضے میں آ گیا تھا۔ وہ خود محسوس کرے اور اس چکر سے نکلے۔

وینا ایک محاذ پر ڈٹ گئی تھی لیکن اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ بے تیغ سپاہی تھی۔ تیغ ہوتی بھی تو وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وار کس پر کرے۔ رہ رہ کر اس کا دھیان اللہ کی طرف جاتا تھا۔ وہ تھی تو باوقار اور شریف لڑکی لیکن وہ اس کلاس کی لڑکی تھی جس کلاس کو اللہ کی ضرورت کم ہی کبھی محسوس ہُوا کرتی ہے۔ اس کلاس میں نماز روزہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اب وینا پر ایسی آ پڑی کہ اسے کوئی حل' کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا تو اسے یہ احساس ہُوا کہ ایک قوّت موجود ہے جو جسے چاہے عزت دیتی اور جسے چاہے ذلّت دیتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے صوم و صلوٰۃ کی طرف توجہ دی۔ اس نے باقاعدگی سے نمازیں پڑھنی شروع کر دیں۔

اسے کچھ سکون محسوس ہُوا تو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اُس نے نفل پڑھنے بھی شروع کر دیئے۔ اس کی آنکھوں میں اس سے پہلے کبھی آنسو نہیں آیا تھا۔ عثمان نے بارہا اسے بڑے سخت الفاظ کہے تھے بلکہ اسے ایک طرح سے لُوسی کے مقابلے میں دھتکار دیا تھا پھر بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے تھے مگر پہلے روز جب اس نے نماز پڑھ کر اللہ کے آگے ہاتھ پھیلائے تو بے اختیار اس کے آنسو بہنے لگے اور پھر اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اُس نے روحانی سا سکون محسوس کیا اور اسے صاف طور پر محسوس ہُوا کہ اللہ اس کی سن رہا ہے اور اللہ اس کی مدد کو پہنچے گا۔ اس کے بعد اس نے اللہ کو ہی اپنا رازدار اور مددگار بنا لیا۔

اب اسے پتہ چلا کہ اس کے میکے کے نوکر اکبر کو قتل کر دیا گیا ہے اور لُوسی فرار ہو گئی ہے تو اسے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اسے اپنا خاوند بھی خطرے میں نظر آنے لگا۔ وہ اللہ سے یہی ایک دعا مانگتی تھی کہ اس کا خاوند اسے واپس مل جائے۔ وہ خاوند کو خبردار کرنا چاہتی تھی کہ اس لڑکی سے بچ کے رہے لیکن خاوند اس کے ساتھ نہ بات کرتا تھا نہ اس

کی سنتا تھا۔ پھر بھی وہ اللہ اللہ کئے جا رہی تھی۔

○

شام کے سات بج رہے تھے جب میجر عثمان کے گھر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عثمان کی ذہنی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ فون کی گھنٹی بجتی تو وہ بڑی تیزی سے اس توقع پر ریسیور اٹھاتا کہ لوسی کا فون ہو گا لیکن ہر بار کوئی اور بول رہا ہوتا تھا۔ اب اس نے ریسیور اٹھایا تو میجر امتیاز بول رہا تھا۔

"میجر امتیاز؟" — عثمان نے پوچھا۔

"ہاں میجر عثمان!" — میجر امتیاز نے کہا — "آپ مجھے نہیں جانتے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ابھی آ جاتا ہوں"۔

"یُو آر ویلکم ڈیئر!" — میجر عثمان نے کہا — "میرے لئے کوئی خاص خدمت؟"

"حاضر ہو کر بتاؤں گا" — میجر امتیاز نے کہا — "کوئی ذاتی کام نہیں"۔

"آ جائیں" — میجر عثمان نے کہا — "میں گھر پر ہی ہوں گا.... کیا آپ جانتے ہیں میں کہاں رہتا ہوں؟"

"جانتا ہوں میجر عثمان!" — میجر امتیاز نے کہا — "ابھی حاضر ہُوا"۔

عثمان نے فون تو بند کر دیا لیکن یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ یہ میجر امتیاز کون ہے اور اسے میرے گھر کے ایڈریس کا کیسے پتہ چلا ہے۔

میجر امتیاز نے جیپ دور ہی روک لی اور عثمان کے گھر تک پیدل گیا۔ وہ انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) کا میجر تھا۔ سرکاری جیپ پر آیا تھا۔ اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی تو عثمان نے خود ہی آ کر دروازہ کھولا اور اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

"چائے یا ٹھنڈا؟" — میجر عثمان نے پوچھا — "بے تکلفی سے بتا دیں"۔

"چائے بنوالیں" — میجر امتیاز نے کہا۔

میجر عثمان نے نوکر کو آواز دے کر چائے کے لئے کہا اور امتیاز سے پوچھا کہ وہ کس طرح آیا ہے۔

"میرا تعلق ملٹری انٹیلی جنس سے ہے" — میجر امتیاز نے کہا — "آپ سے ایک فیملی کے متعلق کچھ پوچھنا ہے"۔

"کون سی فیملی؟" — میجر عثمان نے پوچھا۔

"آپ وہاں جاتے رہتے ہیں" — میجر امتیاز نے کہا — "ایم اے خان کی فیملی ہے یہ"۔

"میجر امتیاز!" — عثمان نے یک لخت سنجیدہ ہو کر پوچھا — "آپ کو میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے تو نہیں بھیجا؟... بی فرینک پلیز.... میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا"۔

"پہلی بات تو میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ آپ پر نہ کوئی الزام ہے اور نہ کوئی شک" — میجر امتیاز نے کہا — "میں پوچھنا تو یہ چاہتا تھا کہ میجر سمیع اور کیپٹن آصف کے ساتھ آپ کی دشمنی تو نہیں' لیکن یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ دونوں آپ کے بڑے گہرے دوست ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے بھی انہی جیسا دوست سمجھیں۔ ملٹری انٹیلی جنس کی حیثیت اور اہمیت کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہوں اور اس میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے"۔

"میں اس پوری فیملی کو نہیں جانتا" — میجر عثمان نے کہا — "ان کی ایک لڑکی کے ساتھ میری فرینڈشپ ہے۔ اس کے فادر ایم اے خان اور اس کی ماں کو جانتا ہوں... امتیاز بھائی! کیا آپ مجھے یہ نہیں بتائیں گے کہ آپ یہ انفارمیشن کیوں لے رہے ہیں؟"

"میجر عثمان!" — میجر امتیاز نے یک لخت سنجیدہ ہو کر کہا — "یہ کوئی فیملی نہیں' یہ مشکوک لوگ ہیں۔ میں دراصل آپ کے سوال کا جواب انٹیلی جنس کی لائن سے ہٹ کر دے رہا ہوں۔ مجھے ایسے سوال کا جواب دینا ہی نہیں چاہئے۔ اگر یہ فیملی یا اس کوٹھی میں رہنے والے لوگ مشکوک ہیں تو ان کے پاس جانے والا ہر فرد مشکوک سمجھا جاتا ہے اور یہ شک آپ پر بھی کیا جا سکتا ہے لیکن آپ کے دونوں دوست میرے بھی دوست ہیں اس لئے میں یہ انوسٹی گیشن غلط طریقے سے کر رہا ہوں"۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ اس انوسٹی گیشن میں میرے یہ دونوں دوست بھی شامل ہیں" — میجر عثمان نے کہا — "یہ دونوں اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ میں اس لڑکی کے ساتھ تعلق توڑ لوں اور اپنے بیوی بچوں کی طرف توجہ دوں"۔

"مجھے آپ کے گھریلو معاملات میں نہیں پڑنا چاہئے" — میجر امتیاز نے کہا — "ہم نے ان لوگوں یعنی ایم اے خان کے بارے میں کچھ اور انفارمیشن بھی اکٹھی کر لی ہے ... آپ کے موڈ اور انداز سے مجھے شک ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ان کے ڈیفنس میں بات کریں گے تو شک آپ پر پختہ ہو گا.... میجر عثمان! اپنے آپ میں

آئیں.... پلیز.... میں جو پوچھتا ہوں وہ بتائیں۔ آپ کو ہمارے آفس میں بلایا جا سکتا تھا لیکن میں آپ کے گھر آ گیا"۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرے ان دوستوں نے کیا کیا ہے؟" —— میجر عثمان نے پوچھا —— "انہوں نے اس لڑکی کو اغوا کیا اور خراب بھی کیا ہے۔ اس جرم میں میری بیوی کے دو بھائی بھی شامل تھے"۔

"میجر عثمان!" —— میجر امتیاز نے کہا —— "مجھے کچھ معلوم ہے یا نہیں، میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں، کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے سسرال کا ایک نوکر قتل ہو چکا ہے؟"

"ہاں" —— میجر عثمان نے جواب دیا —— "مجھے معلوم ہے"۔

"کیا آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ اس نوکر کو قتل کس نے کیا ہے؟" —— میجر امتیاز نے پوچھا۔

"میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا" —— میجر عثمان نے جواب دیا —— "ہو سکتا ہے میری بیوی کے بھائیوں نے اسے قتل کر دیا ہو"۔

"نہیں میجر عثمان!" —— میجر امتیاز نے کہا —— "اور گہرائی میں جا کر سوچو.... کیا اس لڑکی نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ وہ فرار کس طرح ہوئی؟"

"اس نے بتایا تھا" —— میجر عثمان نے جواب دیا —— "اس لڑکی نے اس نوکر کو بیس ہزار روپے کا لالچ دیا تھا"۔

"تو کیا اُسے بیس ہزار روپیہ ادا کر دیا گیا تھا؟" —— میجر امتیاز نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا" —— میجر عثمان نے جواب دیا۔

"میں بتا سکتا ہوں" —— میجر امتیاز نے کہا —— "میرے خیال کے مطابق ہُوا یوں ہے کہ ان بیس ہزار روپوں نے ہی اس کی جان لی ہے۔ یہیں سے ان کے خلاف شک پختہ ہوتا ہے کہ یہ عام سی قسم کے لوگ نہیں۔ میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس سے زیادہ آپ کچھ جانتے ہیں؟"

"نہیں" —— میجر عثمان نے جواب دیا۔

"آپ کو بہت محتاط ہونا چاہیئے میجر عثمان!" —— میجر امتیاز نے کہا —— "آپ آرمی آفیسر ہیں۔ انڈیا کی انٹیلی جنس کی دلچسپی آرمی آفیسرز کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اگر آپ کا

تعلق اس لڑکی کے ساتھ ہے تو اور زیادہ محتاط ہو جائیں.... بائی دی وے.... یہ لڑکی کہاں ہے؟"

"مجھے لڑکی نے فون پر بتایا تھا کہ وہ اسلام آباد اور پھر کراچی جا رہی ہے"۔

"وہاں کے ایڈریس آپ کو معلوم ہیں؟"

"نہیں" —— میجر عثمان نے جواب دیا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں کیسے مان لوں کہ آپ کو لڑکی کا ایڈریس معلوم نہیں" —— میجر امتیاز نے کہا —— "دوسری بات یہ کہ آپ کو کس طرح یقین ہے کہ لڑکی یہاں نہیں ہے؟"

"میں آپ کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا" —— میجر عثمان نے کہا اور پھر اکتا کر بولا —— "آپ تو تھانیداروں کی طرح تفتیش کر رہے ہیں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں"۔

"ضرورت یہ ہے میجر عثمان کہ پاک آرمی کے آفیسر کی حیثیت سے آپ ان لوگوں میں اور زیادہ اُتر جائیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ یہ اصل میں ہیں کیا" —— میجر امتیاز نے کہا —— "یہ لوگ ہمارے ملک کے دشمن ہیں۔ یہ انڈیا کا ایک رِنگ معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ اس لڑکی کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ نوکر مارا نہ گیا ہوتا تو کم از کم میں اسے کوئی اہمیت نہ دیتا"۔

"پھر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس آدمی کو کس نے قتل کیا ہے" —— میجر عثمان نے کہا۔

"میں نے تو اپنے چیف تک رپورٹ پہنچا دینی ہے" —— میجر امتیاز نے کہا —— "آگے ان کی مرضی ہے وہ کیا کرتے ہیں"۔

میجر امتیاز اُٹھ کھڑا ہُوا اور دو چار رسمی باتیں کہہ کر چلا گیا۔



اگلی شام میجر سمیع اور کیپٹن آصف میجر عثمان کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں عثمان نے بلایا تھا۔ عثمان کی ذہنی حالت صحیح نہیں لگتی تھی۔ صحیح ہونی بھی نہیں چاہیئے تھی۔ ایک تو لُوسی اس کے لئے عجیب سا معمہ بن گئی تھی۔ دوسرے میجر امتیاز نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی تھی۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی یہ سب کیا ہے!" ـــــ میجر عثمان نے سمیع اور آصف سے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ ابھی رو پڑے گا ـــــ "کل آئی ایس آئی کا میجر امتیاز آیا تھا اس نے تو مجھے مشتبہ سمجھ کر انوسٹی گیشن شروع کر دی تھی"۔

"اور تمہیں یہ شک ہے کہ میجر امتیاز کو ہم دونوں نے تمہارے پیچھے ڈالا ہے" ـــــ میجر سمیع نے کہا۔

"ہاں" ـــــ میجر عثمان نے یوں کہا جیسے اس کے منہ سے بے اختیار اقبالِ جرم نکل گیا ہو ـــــ "میرا شک تو یہی ہے اور میں بہت پریشان ہوں"۔

"تمہاری پریشانی بجا ہے" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "تمہیں اس سے زیادہ پریشان ہونا چاہئے۔ پریشانی یہ نہیں کہ لُوسی تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ تم دو نشوں سے ٹوٹے ہوئے ہو۔ ایک تو لُوسی تمہارے لئے نشہ بن گئی تھی' اس کے ساتھ وہ تمہیں دھوکے سے خاص قسم کے نشے والی گولیاں چائے کافی وغیرہ میں پلاتی رہتی تھی' اور پھر اس کے ساتھ اس کی وہ عیّارانہ باتیں تھیں جن سے وہ تمہیں میجر سے میجر جنرل بنا دیتی تھی اور تم پر ایسا تاثر طاری کر دیتی تھی جیسے تم شاہی خاندان کے شہزادے ہو اور غلط گھر اور غلط ماحول میں پھنسے ہوئے ہو' پھر اس نے اپنی باتوں سے اور باتیں کرنے کے انداز سے اور اپنی مخصوص ایکٹنگ سے تمہیں یہ تاثر بھی دے رکھا تھا کہ ہر حسین عورت تم پر مرتی ہے اور تم اتنے دلکش اور اتنے قیمتی ہو جسے جو بھی عورت اپنے ہاتھ میں لے گی چھوڑنا نہیں چاہے گی۔ یہ ایک ایسا نشہ ہے میرے دوست! جو ہیروئن سے زیادہ خطرناک ہے اور جو جس پر طاری ہو جاتا ہے اسے اپنے چُنگل سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ جب تک تم اس طلسم ہوش ربا کو اپنے ذہن سے صاف نہیں کرتے تمہاری یہ پریشانی رفع نہیں ہو سکتی"۔

"سر!" ـــــ کیپٹن آصف بولا ـــــ "آپ کو ایڈکشن ہو گئی ہے"۔

"پہلے یہ بتاؤ آصف! تم نے مجھے سر کیوں کہا ہے؟" ـــــ میجر عثمان نے پوچھا ـــــ "ہم اپنی پرائیویٹ محفل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ باہر بے شک سر کہتے رہا کرو"۔

"عثمان بھائی!" ـــــ کیپٹن آصف نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا ـــــ "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہمیں بیگانہ سمجھنے لگے ہو۔ خدا کی قسم' تمہیں سر کہہ کر خود میرے دل کو تکلیف ہوئی ہے .... میں کہہ رہا تھا کہ تم لُوسی کی دوستی کے ایڈکٹ ہو گئے ہو۔

خطرناک لڑکی ایک تو تمہیں نقصان پہنچا رہی ہے اور دوسرا نقصان پاکستان کو پہنچ رہا ہے۔ تمہیں اتنے ہی عزیز ہو جتنا پاکستان"۔

"پاکستان' پاکستان' پاکستان" ـــــ میجر عثمان نے جھنجلا کر کہا ـــــ "کیا یہ لڑکی پاکستان کو اٹھا کر انڈیا لے جائے گی؟"

"نان سینس!" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "ایک آرمی آفیسر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر یوں لگتا ہے جیسے یہ آفیسر نہیں بلکہ بہروپیا ہے یا پنجابی فلموں کا ایکٹر ہے جسے فلم کی شوٹنگ کے لئے تھوڑی سی دیر کے لئے وردی پہنا دی گئی ہے.... اپنی حالت پر غور کرو عثمان! تم جیسا انٹیلی جنٹ آرمی آفیسر کیسی بے معنی باتیں کر رہا ہے۔ کچھ دنوں بعد تمہاری زبان اور زیادہ بازاری بلکہ ہیرا منڈی جیسی ہو جائے گی.... پاکستان کو اٹھا کر انڈیا نہیں لے جایا جا سکتا بلکہ یہ ہو گا کہ انڈین آرمی بڑے آرام سے اٹھ کر پاکستان میں آ بیٹھے گی"۔

"آئی ول شوٹ دی باسٹرڈز" ـــــ میجر عثمان نے کہا ـــــ "انڈین آرمی اتنی جرأت نہیں کر سکتی۔ ہم موجود ہیں' زندہ ہیں اور ہم بیدار ہیں"۔

"نہیں عثمان!" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "تم موجود ہو' زندہ بھی ہو لیکن بیدار نہیں ہو"۔

"لُوسی کی یہی تو کامیابی ہے" ـــــ کیپٹن آصف بولا ـــــ "اُس نے تمہیں سلا دیا ہے اور یقین یہ دلا رکھا ہے کہ تم بیدار ہو۔ تمہاری حالت ان پاگلوں جیسی ہے جو اپنے آپ کو دانشمند اور ساری دنیا کو پاگل سمجھتے ہیں یا تمہاری حالت اُس نشئی جیسی ہے جو جھومتا لڑکھڑاتا چلا جا رہا ہوتا ہو اور سمجھتا ہو کہ اس کے ہوش و حواس قائم ہیں اور اس کے قریب سے گزرنے والے لوگ جھوم اور لڑکھڑا رہے ہیں"۔

"تم نے کہا ہے کہ انڈین آرمی پاکستان میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "جرأت اس لئے نہیں کر سکتی کہ تم موجود اور زندہ ہو۔ انڈین آرمی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ وہ پاکستان میں تم جیسے آرمی آفیسرز اور جوانوں کی موجودگی میں پاکستان میں داخل نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے انڈیا یہ ہتھیار استعمال کر رہا ہے اور لُوسی کا شمار انہی ہتھیاروں میں ہوتا ہے۔ جیسا آصف نے کہا ہے کہ تم موجود بھی ہو' زندہ بھی ہو مگر بیدار نہیں ہو۔ ایک کامیابی تو لُوسی نے یہ حاصل کر لی ہے۔ اس کا اگلا

قدم یہ ہو گا کہ وہ تم سے سیکرٹ انفارمیشن لے گی اور اس کے بعد تمہیں باقاعدہ اپنے رِنگ میں شامل کرلے گی"۔

"ایسا کبھی نہیں ہو گا" ___ میجر عثمان نے کہا۔

"تمہیں اُس وقت پتہ چلے گا جب یہ ہو چکا ہو گا" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "اور اس وقت تم اپنی اس پوزیشن کو قبول کر چکے ہو گے۔ تمہیں اُس راستے پر لے جایا جا رہا ہے"۔

"لیکن لُوسی کا اغوا میرے لئے بڑا تکلیف دہ مسئلہ بن گیا ہے" ___ میجر عثمان نے کہا ___ "اور پھر انٹیلی جنس کے میجر کا میرے پاس آنا...."

"ٹھنڈے دل سے سنو" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "آج ہم تمہیں یہ بھی سنا دیتے ہیں کہ یہ سب کیا تھا.... اس لڑکی کو ہم نے اغوا کیا تھا اور اس لئے اغوا نہیں کیا تھا کہ ہم اس کی عصمت دری کرنا چاہتے تھے بلکہ اس لئے کہ ہم نے اس کی اصلیت معلوم کرنی تھی۔ ہم دونوں وہاں گئے تھے۔ جہاں اسے رکھا گیا تھا۔ تمہارے سسرال کا ایک نوکر پہرے پر تھا۔ اس لڑکی نے اپنا آپ ظاہر نہ ہونے دیا۔ میجر امتیاز بھی وہاں گیا تھا۔ اس نے لڑکی کو اپنی نظر سے دیکھا تھا اور اس کی رائے یہ ہے کہ یہ لڑکی مشکوک ہے.... اب غور کرو کہ اس لڑکی کے ہاتھ میں کتنی پاور ہے۔ وہ نہ صرف فرار ہوئی بلکہ نوکر کو بھی اُڑا کے لے گئی اور اسے قتل کر کے لاش نہر میں پھینک دی۔ یہ ایک ثبوت ہے کہ یہ لڑکی کتنے مضبوط اور طاقتور رِنگ سے تعلق رکھتی ہے"۔

"یہ تو رِنگ کی مضبوطی کی بات ہے" ___ کیپٹن آصف نے کہا ___ "خود لڑکی کی مضبوطی دیکھو' عثمان جیسے پختہ کار شخص کا اس نے کیا حال کر دیا ہے.... اور اس نے ہمیں آپس میں لڑانے کے لئے کیا بیان گھڑا ہے کہ ہم نے اسے کسی اور نیت سے اغوا کیا تھا اور ہم نے اس کی آبروریزی کی ہے"۔

"ایک بات بتاؤ" ___ میجر عثمان نے پوچھا ___ "کیا میرے سالے امجد اور اختر بھی پاکستان کے اتنے خیر خواہ ہیں کہ انہوں نے لڑکی کو اس نیت سے اغوا کرایا ہے؟"

"ذرا سمجھنے کی کوشش کرو عثمان!" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "یہ ان کی بہن کی ازدواجی زندگی کا مسئلہ بھی ہے۔ میں تمہیں ایک بات اور بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں اپنے نوکر کے قتل پر بہت بھڑکے ہوئے ہیں۔ وہ تو اپنی بہن کو اپنے گھر لے جانے پر تُلے

ہوئے تھے لیکن بھابی وینا کی وفاداری دیکھو کہ وہ تمہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتیں"۔

"عثمان بھائی!" ___ کیپٹن آصف نے کہا ___ "ایک وہ عورت ہے جو تمہارے ہوش و حواس پر قبضہ کر کے تمہیں اور تمہارے ملک کو بھی تباہ و برباد کرنے کے ڈھنگ کھیل رہی ہے اور ایک یہ عورت ہے جو نہ جانے تمہارا کیسا سلوک برداشت کر کے تمہیں بچانے کے جتن کر رہی ہے"۔

عثمان کی ذہنی کیفیت اب یہ ہو گئی تھی کہ وہ کچھ سمجھنے کی حالت میں آ گیا تھا لیکن اس کے ذہن پر لُوسی اس حد تک سوار تھی کہ اپنے آپ کو سمجھاتے سمجھاتے جب لُوسی اس کے ذہن میں آتی تھی تو ویسے ہی ہوتا تھا جیسے چھوٹا سا بچہ چلتے چلتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا ہو۔ اس کے یہ دونوں دوست بہت دیر اس کے پاس بیٹھے رہے اور معلوم یہی ہوتا تھا کہ اُنہوں نے عثمان پر اپنا اثر پیدا کر لیا ہے لیکن وہ اٹھ کر چلے گئے تو عثمان پھر اپنے خیالوں میں اُلجھنے لگا۔ وہ بہت دیر اکیلا ہی کمرے میں بیٹھا رہا۔ اسے جیسے محسوس ہی نہ ہُوا ہو کہ اس کے دوست جا چکے ہیں اور اس کی بیوی اس کے پاس کھڑی ہے۔

وینا نے اس کے ساتھ بے تکلفی سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ازدواجی بے تکلفی سے بات کرتی تھی تو عثمان کو غصہ آ جاتا تھا۔ غصہ بھی ایسا جیسے اسے دھتکار رہا ہو لیکن وینا زہر کا یہ گھونٹ پی جاتی تھی۔ اب اس نے عثمان کو اس طرح کھویا کھویا سا بیٹھا دیکھا اور اس کے چہرے پر اضطراب اور تذبذب کے گہرے آثار دیکھے تو اس کے جی میں آئی کہ اسے سینے سے لگا لے اور اسے کہے کہ اپنے دکھ' اپنے غم میرے سینے میں ڈال دے لیکن اسے یاد آ گیا کہ اس نے ایسی بے تکلیف کا مظاہرہ کیا تو عثمان نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کرے گا بلکہ ایسا دھکا دے گا کہ وہ دروازے سے باہر جا پڑے گی۔ اس نے عثمان کے ساتھ کوئی بات کئے بغیر چائے کے برتن سمیٹنے شروع کر دیئے۔

عثمان بے زاری کی سی کیفیت میں اٹھا۔ اس کا انداز شکست خوردگی جیسا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ڈرائنگ روم سے کسی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔



صغیر پر برین واشنگ کا بڑا ہی خوبصورت عمل جاری تھا۔ مُنی اس کے ساتھ رہتی تھی۔ کھانے میں اسے نشہ آور چیزیں کھلائی جا رہی تھیں اور اب اُس نے یہ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ وہ ان کے راستے پر نہیں آئے گا۔

ایک رات اس کی آنکھ کھلی تو اُس نے گھٹن سی محسوس کی جو بڑھتے بڑھتے صورت اختیار کر گئی جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے چکر سا آیا اور جسم میں اس نے نقاہت سی محسوس کی اور اس کے ساتھ اس پر ڈیپریشن طاری ہونے لگی۔ وہ کمرے سے نکلا اور زور سے آواز دی —— "کوئی ہے؟"

سریش جو قریب ہی کسی کمرے میں سویا ہُوا تھا' دوڑا آیا اور صغیر سے پوچھا' کیا بات ہے۔

"معلوم نہیں کیا بات ہے" —— صغیر نے اپنی گردن کو شہ رگ کی طرف سے آہستہ آہستہ دباتے ہوئے کہا —— "دم گھُٹ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے یہاں سے بھاگ جاؤں"۔

"جانے دو یار!" —— سریش نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا —— "تم تو بچوں کی طرح ڈر رہے ہو۔ کوئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھا ہو گا.... کمرے میں چلو' میں تمہاری طبیعت ٹھیک کرتا ہوں"۔

صغیر اپنے کمرے میں پلنگ پر جا بیٹھا اور سریش دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گلاس تھا جو اس نے صغیر کو دیا۔

"کولڈ کافی ہے" —— سریش نے کہا —— "پی لو۔ ابھی طبیعت سنبھل جائے گی"۔

صغیر نے کولڈ کافی پی لی۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اس کی ڈیپریشن پر بشاشت غالب آنے لگی اور وہ اپنے آپ میں بہتر تبدیلی محسوس کرنے لگا۔

"تم تنہائی محسوس کر رہے ہو" —— سریش نے صغیر سے کہا —— "میں خود تمہارے پاس بیٹھتا' لیکن میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جی چاہتا ہے ہر وقت تمہارے پاس ہی بیٹھا رہوں۔ معلوم نہیں تم میں کیا جادو ہے کہ میں تو تمہارا مرید ہو گیا ہوں۔ تمہیں تو پاکستان کا لیڈر ہونا چاہئے تھا لیکن پاکستانیوں نے تمہاری قدر نہیں کی"۔

سریش کمار کی یہ باتیں برین واشنگ کے عمل کا ایک لازمی حصہ تھیں۔ صغیر پر پہلے نشہ طاری کیا جاتا پھر سریش اسے باتوں باتوں میں زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا۔ نشے کی کیفیت میں سریش کی یہ باتیں صغیر کے ذہن پر نقش ہوتی چلی جاتیں اور وہ اپنے آپ کو عوام کی صف سے بہت بلند اٹھا کر حکمرانوں کی صف میں کھڑا کر دیتا —— "کچھ کمرا

جاتی تو وہ کمی پوری کر دیتی تھی۔

سریش صغیر سے یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا کہ وہ مُنی کو بھیجے گا۔

"تم اپنا کام ٹھیک طرح نہیں کر رہی" —— سریش نے مُنی کو اس کے کمرے میں بلا کر کہا —— "آج شام تم نے اسے بہت تھوڑی ڈوز دی ہے یا دی ہی نہیں"۔

"میں نے پوری ڈوز دی تھی" —— مُنی نے کہا —— "جوان آدمی ہے۔ ہضم کر گیا ہو گا.... کیوں؟ کیا ہوا؟"

"وہ تو کمرے سے نکل آیا تھا" —— سریش نے کہا —— "اگر وہ آواز نہ دیتا تو میری آنکھ نہ کھلتی اور وہ باہر نکل جاتا.... جاؤ' تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھو' میں نے اسے ڈوز دے دی ہے' جلدی سو جائے گا اور دیکھو' اپنے آپ کو بچا کر رکھنا۔ تم جانتی ہی ہو.... اسے تشنہ رکھو"۔

"کیا بات کرتے ہو سریش!" —— مُنی نے کہا —— "میں اُس کی داشتہ تو نہیں۔ تم فکر نہ کرو"۔

مُنی صغیر کے کمرے میں چلی گئی اور اس کے پلنگ پر بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں صغیر کی آنکھ لگ گئی اور مُنی اٹھ کر چلی گئی۔

لُوسی کراچی پہنچ چکی تھی۔ شام کے بعد وہ ایک کوٹھی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ چار پانچ اور آدمی بھی تھے۔ لُوسی کو یہاں آئے کچھ دن گزر گئے تھے۔ وہ اپنے آدمیوں کو بتا چکی تھی کہ اس کے ساتھ لاہور میں کیا ہُوا ہے اور وہ کس طرح یہاں پہنچی ہے۔ کراچی میں اس رِنگ کا لیڈر کوئی اور تھا۔ اُس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ لُوسی چونکہ دوسری لائن میں مہارت رکھتی ہے اس لئے اسے اسی لائن پر رکھا جائے۔

"کراچی اور سندھ کا معاملہ کچھ اور ہے" —— لیڈر نے کہا —— "یہاں لڑکیوں کی ضرورت کم ہی پڑتی ہے۔ یہاں تو تخریب کاری اور خون خرابہ کرنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے"۔

اُسی شام اس کوٹھی میں اس رِنگ کی ایک اہم میٹنگ ہو رہی تھی۔

"تم سب دیکھ رہے ہو کہ کراچی میں معاملہ کچھ سرد پڑ گیا ہے" —— لیڈر نے کہا —— "ٹھو ٹھاہ جاری رہنی چاہئے۔ سندھ کے اندر تو معاملہ ٹھیک چل رہا ہے۔ سندھ کو

اپنا ہی سمجھو۔ ہم نے یہاں مشرقی پاکستان والے حالات پیدا کرنے میں مکمل کامیابی حاصل کرلی ہے"۔

"ہم نے ٹھو ٹھاہ جاری رکھی ہوئی ہے" — ایک آدمی بولا — "پرسوں ہمارے دو لڑکوں نے بہاریوں کی کالونی میں فائرنگ کی تھی اور باقی لڑکوں نے واویلا بپا کیا تھا کہ یہ افغانیوں نے گولیاں چلائی ہیں"۔

"ہاں ہاں" — لیڈر نے کہا — "وہ رپورٹ مجھے مل چکی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پاکستان کے سیاسی حالات ہمارے حق میں ہوتے جا رہے ہیں۔ سیاسی لیڈروں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا ہے۔ اس جلتی پر تیل ڈالنا بہت ضروری ہے۔ یہاں کے لیڈروں کو اپنے ملک کی سلامتی کا ذرا سا بھی خیال نہیں۔ یہ حالات ہماری کامیابی کے ضامن ہیں"۔

"ہم ان حالات سے اچھی طرح آگاہ ہیں" — میٹنگ کے شرکاء میں سے ایک اور بولا — "ہمارے آدمی یہاں کی دو سیاسی پارٹیوں میں داخل ہو چکے ہیں اور دونوں نے سندھی مسلمانوں کے بہروپ میں بڑی اچھی پوزیشنیں حاصل کر لی ہیں۔ کراچی میں امن قائم نہیں ہونے دیں گے"۔

"آپ مشرقی پاکستان کا حوالہ نہ دیا کریں" — ایک اور ذمہ دار آدمی نے کہا — "وہاں آخر میں فوج اور ایئرفورس سے حملہ کرنا پڑا تھا۔ سندھ بغیر حملے کے ہمارے پاس آ جائے گا۔ حملہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں"۔

"وہ تو صاف نظر آ رہا ہے" — رِنگ لیڈر نے کہا — "یہاں کے لیڈر خود ہی مشرقی پاکستان والے حالات پیدا کرتے چلے جا رہے ہیں"۔

اس میٹنگ میں ایک لیڈر قسم کا آدمی اندرون سندھ سے آیا تھا۔ اس نے رپورٹ دی کہ ہر طرف کامیابی حاصل ہوئی ہے' ڈکیتی' راہزنی اور اغوا کی وارداتیں اتنی زیادہ کرائی جا رہی ہیں کہ اب یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہمارے سامنے گھومنے پھرنے والے لوگوں میں سے کون ڈاکو اور کون پُرامن شہری ہے۔ ہم نے امن و امان تو رہنے ہی نہیں دیا"۔

پاکستان کے اخباروں میں خبریں چھپتی رہتی تھیں کہ سندھ میں غیر ملکی ہاتھ کام کر رہا ہے۔ بعض خبروں میں صاف لکھا ہوتا تھا کہ انڈیا کا جاسوسی اور تخریب کاری کا ادارہ "را"

سندھ اور کراچی میں سرگرم ہے اور یہ خبریں تو ہر روز اخباروں میں چھپتی تھیں کہ آج فلاں فلاں جگہ ڈاکے کی وارداتیں ہوئی ہیں اور فلاں فلاں کو ڈاکو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ اتنا خوفناک مسئلہ خبروں تک ہی محدود رہتا تھا۔ اگر کوئی کارروائی ہوتی تھی تو صرف یہ کہ ایک دو وزراء کے بیان اخباروں میں چھپ جاتے تھے:

"سندھ میں شہریوں کے جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے گی"۔

"ہم سندھ میں امن قائم کر کے دم لیں گے"۔

"سندھ کی صورت حال ہمارے قابو میں ہے"۔

"ہم نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ ڈاکوؤں کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے"۔

یہ بیانات ایسے ہی ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر جاری کئے جاتے تھے جس طرح کے ڈرائنگ روم میں انڈیا کے تخریب کاروں کے لیڈروں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔

ایک طرف خالی الفاظ تھے۔

دوسری طرف عمل ہی عمل تھا.... تباہی اور بربادی کا سامان تھا۔

پاکستان کے لیڈر پاکستانیوں کو تھپکیاں دے دے کر سُلا رہے تھے۔

بھارتی لیڈر پاکستان کی تباہی کو تیز تر کرنے کے لئے سراپا عمل بنے ہوئے تھے۔

انہوں نے پاکستان سے اپنے ایجنٹوں کی ایک فوج تیار کر لی تھی۔



وینا کا بڑا بھائی امجد اُن دنوں اپنے کاروباری سلسلے میں کراچی گیا اور ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔

اگلے روز وہ الفنسٹن سٹریٹ میں جا رہا تھا تو اسے ایک کار میں سے لُوسی ایک آدمی کے ساتھ نکلتی نظر آئی۔ امجد کچھ دور جا کر رک گیا اور لُوسی پر نظریں جمائے رکھیں۔ لُوسی ایک دکان میں چلی گئی۔ امجد دیکھتا رہا۔

اسے لُوسی کے نکلنے کا انتظار کرنا پڑا۔ لوسی کم و بیش آدھے گھنٹے بعد نکلی اور اس آدمی کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔ امجد نے ٹیکسی لی اور ڈرائیور سے کہا کہ فلاں گاڑی کے پیچھے چلو۔

ٹیکسی نے لُوسی کی گاڑی کا تعاقب شروع کر دیا۔ امجد نے ٹیکسی ڈرائیو کو زیادہ پیسوں کا لالچ دیا تھا اس لئے ڈرائیور بڑی استادی سے گاڑی کا تعاقب کر رہا تھا ورنہ کراچی

کی ٹریفک میں کسی گاڑی کا تعاقب کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔

لُوسی کی گاڑی شہر سے نکل گئی اور کوٹھیوں کی ایک کالونی میں داخل ہو گئی۔ کئی موڑ کاٹ کر گاڑی ایک کوٹھی میں چلی گئی۔ امجد نے ٹیکسی کی رفتار کم کروا کے کوٹھی کا نمبر دیکھ لیا اور ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ اُسے واپس اسی جگہ لے چلے جہاں سے آئے تھے۔

میجر عثمان کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ کبھی اس پر ایسی کیفیت طاری ہوتی تھی جیسے نشے میں ہو اور کبھی ایسی جیسے نشے سے ٹوٹا ہُوا ہو۔ عام طور پر اس پر غنودگی سی طاری رہتی تھی جس کی صورت ایسی تھی جیسے وہ اپنی بیوی اور بچوں سے اکتایا ہُوا ہو اور ان سے بے رخی برت رہا ہو۔ کبھی گھر میں آتا تو ذرا سی بات پر بھی بگڑ جاتا اور بیوی یا بڑے بچے پر جو ابھی تین سال کا تھا' غصہ نکالنا شروع کر دیتا۔ وہ جب غصے والی مزاجی کیفیت میں ہوتا تھا تو دودھ پیتے بچے کے رونے پر بھی بھڑک اٹھتا اور بیوی کو بے نقط سنانی شروع کر دیتا۔

"اس گھر میں ایک منٹ گذارنا بھی محال ہے"۔

"بچوں کو تمیز سکھانا ماں کا کام ہے"۔

"اس گھر میں داخل ہونے کو جی نہیں چاہتا"۔

"یہ گھر جہنم ہے"۔

اور ایسے ہی بے شمار طعنے اور کوسنے تھے جو اس کی زبان پر چڑھ گئے تھے اور جب اس کے مزاج میں چڑچڑا پن آ جاتا تو یہ الفاظ تیروں کی طرح وینا پر برسانا شروع کر دیتا تھا۔ پہلے پہل وینا اپنے دفاع میں کچھ بولتی تھی لیکن اس کا بولنا لڑائی جھگڑے کا باعث بن جاتا تھا۔ میجر عثمان کچھ سمجھنے کی بجائے مشتعل ہو کر آگ بگولہ بن جاتا اور کبھی تو اس پر ایسا باؤلا پن طاری ہو جاتا تھا کہ وہ وینا پر حملہ کرنے پر اُتر آتا تھا لیکن اب وینا نے اپنے رویے میں یہ تبدیلی پیدا کر لی تھی کہ وہ عثمان کی ہر کڑوی کسیلی بات بلکہ گالیاں بھی سن کر پی جاتی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس شخص پر اُس لڑکی کا جادو اس حد تک سوار ہے کہ اس کی

شخصیت اور اُس کی سوچیں بھی اُسی کے قبضے میں ہیں۔

وینا نے اپنے رویّے میں یہ تبدیلی اُسی روز پیدا کر لی تھی جس روز عثمان نے اُسے غصے میں کہا تھا کہ تم اپنے گھر دفع کیوں نہیں ہو جاتیں۔ عثمان نے یہ بھی کہا تھا کہ تم میری زندگی سے نکل جاؤ تو مجھے روحانی سکون محسوس ہو گا۔

"عثمان!" ــــ وینا نے غصے کا جواب غصے میں دینے کے بجائے پُرعزم لہجے میں کہا تھا ــــ "میں نے اگر اس گھر سے اور تمہاری زندگی سے نکلنا ہوتا تو کبھی کی نکل گئی ہوتی لیکن عثمان! میں تمہاری اس حیثیت کو کبھی نہیں بھولوں گی کہ تم میرے بچوں کے باپ ہو۔ اگر تم اس اعزاز اور اس سعادت کو قبول نہیں کرتے تو میں تمہیں یہ کہوں گی کہ ہمت کرو اور مجھے اس گھر سے نکال کر دیکھو"۔

"بکواس بند کرو" ــــ عثمان نے دانت پیس کر کہا تھا ــــ "تم نہیں نکلو گی تو میں اپنے ہاتھوں تمہارا گلا گھونٹ کر تمہاری لاش گندے نالے میں پھینک آؤں گا"۔

"یاد رکھو عثمان!" ــــ وینا نے متین سے لہجے میں کہا تھا ــــ "میری جن باتوں کو تم آج بکواس کہہ رہے ہو، کل یہی باتیں تمہارے زخموں پر مرہم کا کام کریں گی، وقت آنے دو"۔

یہ کہہ کر وینا دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

وہ اُس روز کے بعد خاموش ہو گئی تھی۔ میجر عثمان نے اس کے ساتھ بڑھ بڑھ کر بدتمیزیاں، واہی تباہی اور طعنے جاری رکھے تھے۔ وینا سمجھ گئی تھی کہ اس کے خاوند کو ہپناٹائز کر لیا گیا ہے۔ وہ اب خاوند کی بجائے خدا سے ہمکلام ہوتی تھی۔ وہ خاوند کی روز بروز بگڑتی ہوئی حالت دیکھ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ عثمان شراب بھی پیتا ہے لیکن اس پر غنودگی کی جو کیفیت طاری رہنے لگی تھی وہ شراب کا نشہ نہیں تھا۔ وہ جب کبھی خوش باش گھر آتا تھا تو وینا سمجھ جاتی تھی کہ شراب پی کر آیا ہے لیکن یہ غنودگی کسی اور ہی نشے کی تھی اور یہ کوئی بہت ہی بُرا نشہ تھا۔ اس میں شگفتہ مزاجی کی بجائے ڈیپریشن ہوتی تھی۔ اگر ڈیپریشن نہیں ہوتی تھی تو مزاج میں غصہ بھر جاتا تھا۔

وینا روحانی اذیت میں مبتلا تھی۔ اس کی روح ناقابلِ برداشت عذاب کو برداشت کر رہی تھی اور اس نے یہ صورتِ حال قبول کر لی تھی لیکن جب وہ اپنے بڑے بچے کو دیکھتی تھی تو اپنے آنسوؤں کو نہیں روک سکتی تھی۔ بچہ باپ کو پہچانتا تھا۔ اسے معلوم تھا

کہ یہ باپ ہے اور اس سے اسے پیار ملنا چاہئے اور بچہ اپنا حق سمجھتا تھا کہ باپ اسے اٹھائے اور ذرا باہر گھما پھرا لائے مگر باپ کی حالت یہ تھی جیسے اس نے اس بچے کو اپنا سمجھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وینا کو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ جانتی تھی کہ جو بچہ پیار سے محروم ہوتا ہے اور جسے پیار کی بجائے دھتکار یا پھٹکار ملتی ہے وہ اسی عمر میں ابنارمل ہو جاتا ہے۔ اگر باپ مر چکا ہو تو ماں بچے کو یہ کہہ کر بہلا ہی لیا کرتی ہے کہ تمہارے ابّو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں۔

وینا کو یہی غم کھائے جا رہا تھا کہ کپڑے لتّے، کھانے پینے اور تعلیم کے لحاظ سے تو اس کے بچے کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے، شہر کے بہترین اور ہائی کلاس سکولوں اور کالجوں میں پڑھیں گے لیکن باپ کے پیار اور باپ کی شفقت کی محرومی کی وجہ سے ان کی ذہنیت مجرمانہ ہو جائے گی اور یہ اخلاق اور کردار کی بلندی پر نہیں بلکہ عمیق پستیوں میں زندگی گذاریں گے۔

وینا اللہ کے حضور رو رو کر یہی ایک دعا مانگا کرتی تھی ــــ "اللہ، میرے بچوں کو ان کا باپ واپس دے دے"۔

ایک رات عثمان گھر آیا۔ بچے سو گئے تھے۔ وینا جذباتی خلفشار میں اُلجھی ہوئی جاگ رہی تھی۔ ویسے ہی بچوں کے پاس لیٹی ہوئی تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجی تو اس نے دروازہ کھولا۔ وہ عثمان تھا جس کے منہ سے السلام علیکم کے الفاظ بھی نہ نکلے۔ وینا نے السلام علیکم کہی تو عثمان چپ چاپ اس کے قریب سے گزر گیا۔

"کھانا لاؤں؟" ــــ وینا نے کمرے میں جا کر رسمی طور پر پوچھا۔

"نہیں" ــــ عثمان نے ایسی بے رخی سے کہا جس کی وینا عادی ہو چکی تھی۔

"چائے یا کافی؟"

"نہیں"۔

وینا نے فوراً نوٹ کر لیا کہ عثمان کی ذہنی حالت صحیح نہیں۔ وہ تو اب اس کے چہرے کو دیکھ کر ایک سیکنڈ میں پہچان لیتی تھی کہ وہ نشے میں ہے یا نشے سے ٹوٹا ہُوا۔ اُس رات وہ نشے سے ٹوٹا ہُوا لگتا تھا لیکن اس کے مزاج میں غصہ نہیں تھا۔

"پانی لاؤ" ــــ عثمان نے اس طرح کہا جیسے تھکا ہُوا آدمی گھر آ کر نوکر کو کوئی کام کہتا ہے۔

وینا پانی لینے چلی گئی۔ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ عثمان میز کی دراز میں سے کچھ نکال کر دراز بند کر رہا تھا۔ وینا نے اس کے ہاتھوں کی حرکت دیکھی۔ اس کے ہاتھ میں گولیوں کا ایک پتا تھا اور عثمان اس میں سے گولیاں نکال رہا تھا۔ وینا جب اس کے پاس پانی لے کر پہنچی تو عثمان چار گولیاں نکال چکا تھا اور باقی پتا اپنی جیب میں ڈال رہا تھا۔

وینا نے یہ پتا دیکھ لیا اور وہ جان گئی کہ یہ کیسی گولیاں ہیں۔ عثمان جب گولیاں منہ میں ڈالنے لگا تو اس نے دوسرا ہاتھ وینا کی طرف پانی کا گلاس لینے کے لئے کیا۔ وینا نے گلاس پیچھے کر لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جس میں گولیاں تھیں۔

"یہ کیا بیہودہ حرکت ہے؟" ––– عثمان نے ایسے لہجے میں کہا جس میں غصہ نہیں تھا افسردگی سی تھی۔

"عثمان!" ––– وینا نے عثمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے پختہ انداز میں کہا ––– "یہ گولیاں نہیں کھانے دوں گی"۔

"کیوں؟" ––– عثمان نے پوچھا ––– "کیا ہے ان گولیوں میں؟ .... میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے اور یہ سر درد کی گولیاں ہیں"۔

"عثمان!" ––– وینا نے ایسے جرأت مندانہ لہجے میں کہا جیسے ماں اپنے چھوٹے سے بچے کو کسی غلط حرکت سے روک رہی ہو ––– "میں نے کہا ہے میں تمہیں یہ گولیاں نہیں کھانے دوں گی۔ باہر سے کھا کر آ جاتے تو ٹھیک تھا"۔

"کیا مجھے پریشان کر کے تمہیں خوشی ہوتی ہے؟"

"میں نے کہہ دیا ہے یہ گولیاں نہیں کھانے دوں گی" ––– وینا نے کہا۔

"کیا میں اپنے سر درد کا کوئی علاج نہ کروں؟"

"یہ سر درد تمہارا نہیں میرا ہے" ––– وینا نے کہا ––– "میں جاہل اور ان پڑھ نہیں۔ میں کہتی ہوں اس لڑکی کو جو ہمارے درمیان آ گئی ہے' گھر لے آؤ۔ اسے بیڈ روم میں لے جاؤ' خدا کی قسم کھا کر وعدہ کرتی ہوں اُف نہیں کروں گی لیکن یہ گولیاں نہیں کھانے دوں گی"۔

وینا حیران ہو رہی تھی کہ آج اس شخص کا غصہ کہاں گیا۔ عثمان نے بڑے آرام سے اپنا گولیوں والا ہاتھ وینا کے ہاتھ سے چھڑا کر جیب میں ڈال لیا۔

"تم کیا سمجھی ہو؟" ––– عثمان نے پوچھا ––– "یہ کیسی گولیاں ہیں جو تم مجھے کھانے

نہیں دے رہیں؟ .... یہ زہر تو نہیں کہ میں کھا کر مر جاؤں گا"۔

"زہر کھا لو تو وہ اچھا ہے" ––– وینا نے کہا ––– "تم مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پا لو گے اور میں کچھ دن رو پیٹ کر چپ ہو جاؤں گی اور اس صورتِ حال کو قبول کر لوں گی کہ میرے بچے یتیم ہو گئے ہیں لیکن تم وہ زہر کھا رہے ہو جو تمہیں مرنے بھی نہیں دے گا اور جینے بھی نہیں دے گا۔ تم ہر روز ایسی خودکشی کرتے ہو جو تمہاری دماغی صلاحیتوں اور جسمانی توانائی کو آہستہ آہستہ مار رہی ہے .... میں جانتی ہوں یہ ٹرانکولائزر ہیں جو ڈاکٹر کسی کسی مریض کو ذہنی سکون کے لئے دیتے ہیں اور کچھ لوگ یہ نشے کے طور پر کھاتے ہیں۔ مجھے آج پتہ چلا ہے کہ تم غنودگی کی حالت میں کیوں رہتے ہو"۔

"میرا خیال ہے مجھے تمہاری نصیحتوں کی اور تمہارے فلسفے کی ضرورت نہیں" ––– میجر عثمان نے کہا ––– "اور بہتر یہ ہے کہ تم مجھے تنہا چھوڑ دو"۔

"کس چیز کی ضرورت ہے اور کیا غیر ضروری ہے' یہ میں بہتر سمجھتی ہوں" ––– وینا نے کہا ––– "اور میں تمہیں بتا دیتی ہوں میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی"۔

میجر عثمان پلنگ پر جا کر یوں بیٹھا اور لیٹ گیا جیسے گر پڑا ہو۔ وینا کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ عثمان اس کی باتوں پر غصے میں آ جائے گا اور چونکہ وہ نشے سے ٹوٹا ہوا ہے اس لئے ہر اوچھی حرکت کر گزرے گا' پھر بھی وہ عثمان کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ عثمان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ عثمان کے اندر کوئی نفسیاتی خامی ہے جسے دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کمزوری جو کچھ بھی تھی' وہ اُبھر آئی تھی اور عثمان بے بس سا لگتا تھا۔

"یہ مردوں کا شیوہ نہیں عثمان!" ––– وینا نے کہا ––– "کوئی مسئلہ ہے تو مردانہ وار اس کا مقابلہ کرو۔ آج میں تمہارے ساتھ دو ٹوک بات کرنا چاہتی ہوں .... تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم دو عورتوں میں بٹ گئے ہو بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ تم دو عورتوں کے درمیان اس طرح پس رہے ہو جس طرح گندم کا دانہ چکی کے دو پتھروں کے درمیان آ جاتا ہے اور اپنی اصلیت کھو بیٹھتا ہے۔ ایک وہ عورت ہے جسے تم چھوڑ نہیں سکتے اور ایک میں عورت ہوں جو تمہیں چھوڑ نہیں سکتی"۔

"چار نہ سہی وینا!" ––– عثمان نے کہا ––– "دو گولیاں کھا لینے دو"۔

"چلو دو کھا لو" ––– وینا نے کہا ––– "میں تم سے وعدہ کرتی ہوں عثمان! میں

تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔ جو جی میں آئے کرو لیکن خدا کے لئے اور پھر اپنے بچوں کے لئے یہ گولیاں کھانی چھوڑ دو"۔

وینا نے اٹھ کر پانی کا گلاس عثمان کو دیا اور عثمان نے دو گولیاں کھالیں۔ وینا اس کے ساتھ باتیں کرتی رہی اور عثمان پر غنودگی طاری ہوتی گئی۔ وینا کو شاید پہلی بار پتہ چلا تھا کہ عثمان ٹرانکولائزر گولیوں کا عادی ہو چکا ہے۔ اسے کیا پتہ چلتا' یہ تو عثمان کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ گولیوں کا عادی کس طرح ہوا تھا حالانکہ دوستوں نے اسے بتایا تھا کہ لوسی اسے دھوکے میں مشروبات' چائے' کافی وغیرہ میں ٹرانکولائزر پلا رہی ہے۔ عثمان نے صرف اتنا تسلیم کیا تھا کہ وہ جب اس کے ہاں سے اٹھتا ہے تو اس پر نشے جیسی غنودگی طاری ہوتی ہے لیکن وہ اس غنودگی سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ اب لوسی کی جدائی کا غم وہ ان گولیوں کے ذریعے دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ وہ ان گولیوں کا نشئی ہو چکا ہے اور یہ گولیاں اس کے لئے ذہنی بیساکھیاں بنتی جا رہی ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ وینا کی تو وہ ایسی بات بھی برداشت نہیں کیا کرتا تھا جس میں اس کا فائدہ ہی کیوں نہ ہوتا لیکن اُس رات اس نے وینا کی ہر بات برداشت کر لی اور چار گولیاں کھانے کی بجائے دو گولیاں کھائیں۔ وینا اُس وقت وہاں سے اٹھی جب میجر عثمان کپڑے بدلے بغیر سو گیا تھا۔

وینا بہت بڑا بوجھ دل پر لے کر وہاں سے اٹھی۔ اس بوجھ کو تو وہ برداشت کر رہی تھی کہ اس کا خاوند کسی اور لڑکی کے قبضے میں آ گیا تھا لیکن اس بوجھ تلے کہ اس کا خاوند نشہ آور گولیوں کا عادی ہو گیا تھا' اس کی ہڈیاں ٹوٹنے لگیں لیکن وینا بے بس تھی۔

○

اگلی شام میجر سمیع اور کیپٹن آصف میجر عثمان سے ملنے اس کے گھر آئے۔

"یار' آج تم نے اچھا کیا کہ آ گئے ہو" ___ عثمان نے کہا ___ "آج تو میں بہت ہی ڈیپریسڈ ہوں"۔

"یہ کوئی نئی خبر تو نہیں" ___ میجر سمیع نے مسکراتے ہوئے کہا ___ "ایک وہ وقت تھا کہ مجھے ڈیپریشن ہوتی تھی تو میں تمہارے پاس آ جایا کرتا تھا۔ تم کتنے زندہ دل تھے کہ تمہیں دیکھتے ہی ڈیپریشن ہوا ہو جاتی اور دل باغ باغ ہو جاتا تھا مگر اب کسی نے اپنے اوپر ڈیپریشن طاری کرنی ہو تو وہ تمہارے پاس آ بیٹھے"۔

"یہ سب عشق بازی کا نتیجہ ہے" ___ کیپٹن آصف نے کہا ___ "عشق بازی بھی مشکوک لڑکی کے ساتھ .... اس کا کوئی فون آیا؟"

"نہیں یار!" ___ عثمان نے جواب دیا۔

"آئے گا بھی نہیں" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "وہ جہاں ہے وہاں اس نے تم جیسا کوئی اور پھانس لیا ہے"۔

"میں تمہیں کس طرح بتاؤں یار!" ___ میجر عثمان نے جھنجھلا کر کہا ___ "وہ ایسی نہیں' اس کی کوئی مجبوری ہوگی کہ وہ فون نہیں کر سکی۔ میں جانتا ہوں میرے بغیر وہ کس طرح زندہ ہوگی"۔

"اگر یہ جاننا چاہتے ہو کہ وہ کس طرح زندہ ہوگی تو میں تمہیں کراچی کی ایک کوٹھی کا ایڈریس دیتا ہوں" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "خود جا کر دیکھ لو کہ تمہارے بغیر اس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے"۔

"کیسا ایڈریس؟" ___ عثمان نے پوچھا۔

"یہ لو" ___ میجر سمیع نے کاغذ کا ایک ٹکڑا میجر عثمان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ___ "خود کراچی چلے جاؤ اور چھُپ کر اس کوٹھی پر نظر رکھنا۔ تمہیں اپنی محبوبہ نظر آ جائے گی"۔

"اسے کس نے دیکھا ہے وہاں؟" ___ عثمان نے پوچھا۔

"یہ بتانے کی ضرورت نہیں" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "ہم تمہیں بتا چکے ہیں کہ یہ لڑکی انٹیلی جنس کی نظر میں ہے اور مجھے پل پل کی خبر مل رہی ہے"۔

"میجر امتیاز نے بتایا ہوگا؟" ___ میجر عثمان نے کہا۔

"کسی نے بھی بتایا ہو" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہاں اسے تم جیسے ایک اور آدمی کے ساتھ شاپنگ کرتے اور پھر اس کوٹھی میں جاتے دیکھا گیا ہے"۔

میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے عثمان کو یہ سوچ کر نہ بتایا کہ یہ خبر وینا کے بڑے بھائی امجد نے دی ہے۔ اگر امجد کا حوالہ دیا جاتا تو عثمان فوراً بگڑ جاتا اور کہتا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔

"عثمان!" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "ہم دونوں کو یقین ہے کہ تم ہمیں اپنا ہمدرد

سمجھتے ہو اور سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم تمہیں دھوکہ دیں گے"۔

"ایسی بات کیوں کہتے ہو جو سو فیصد سے بھی زیادہ صحیح ہے" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "میں نے تمہارے خلوص اور تمہاری محبت پر کبھی شک نہیں کیا۔ ہماری محبت اور بے تکلفی کی مثال یہ ہے کہ آصف کیپٹن ہے اور ویسے بھی یہ مجھ سے اور تم سے بہت جونیئر ہے لیکن یہ ہمیں تم اور تُو کہہ کر بات کرتا ہے۔ کیا آرمی میں اس طرح ہوتا ہے؟ بعض جونیئر کیپٹن سینئر کیپٹنوں کو سر کہہ کر بات کرتے ہیں لیکن ہماری بے تکلفی کچھ اور ہے"۔

"عثمان یار!" ـــــ کیپٹن آصف نے کہا ـــــ "ایک طرف تم ہماری محبت کو اور ہمارے خلوص کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرتے ہو اور دوسری طرف تم ہم پر عجیب و غریب شُبے کرتے ہو۔ ہماری ہر اس بات کا جس کا تعلق اس مشکوک لڑکی کے ساتھ ہو بُرا مانتے ہو"۔

"دیکھ آصف!" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "میرے دل میں اپنے خلاف شُبے تم نے خود پیدا کئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی کو اغوا کیا گیا تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اغوا تم نے اور میرے سالوں نے کیا تھا۔ اگر میں لڑکی کے اس الزام کو جھوٹ سمجھ لوں کہ تم نے اس کی آبرو ریزی کی تھی تو یہ میرے لئے کوئی مسئلہ نہ رہتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگوں نے اسے اغوا کیوں کیا؟ .... اس کے جسم کے ساتھ کھیلنے کے لئے یا کسی اور مقصد کے لئے؟ امجد اور اختر نے تو اسے اس لئے اغوا کیا تھا کہ وہ میری زندگی سے نکل جائے اور ان کی بہن کی ازدواجی زندگی مضبوط ہو جائے لیکن لڑکی وہاں سے بھاگ آئی۔ مجھے افسوس تم دونوں پر آتا ہے"۔

"یہ معمّہ حل ہو سکتا ہے" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "صرف اس صورت میں کہ لڑکی ہمارے درمیان موجود ہو .... لیکن عثمان! تم ہماری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے۔ ہم بھابی وینا اور تمہارے بچوں کو دیکھتے ہیں اور پھر یہ دیکھتے ہیں کہ تم ایک مشکوک لڑکی کے جال میں پھنسے ہوئے پاگل ہوئے جا رہے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے تم ایک سرسبز نخلستان میں جس میں شفاف پانی کا چشمہ ہے' بیٹھے ہوئے تھے اور بیٹھے بٹھائے ایک سراب کے پیچھے چل پڑے۔ ہماری باتوں پر ذرا غور کرو...."

"میں جاہل تو نہیں سمیع بھائی!" ـــــ میجر عثمان نے کہا ـــــ "یہ نصیحتیں اور یہ لیکچر

میں خود دوسروں کو دے سکتا ہوں۔ تم جو کہنا چاہتے ہو وہ میں بڑی اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ آج میں تمہیں اپنی ذہنی کیفیت بتانا چاہتا ہوں" ـــــ عثمان کی آواز دب سی گئی اور اس نے سر جھکا لیا۔ سر اٹھایا تو اس کے دوستوں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اس کے منہ سے سِسکی سی نکلی ـــــ "میرے پیارے دوستو! میری مدد کرو" ـــــ اور اس نے پھر سر جھکا لیا۔

"ہوش میں آ یار!" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "اپنی اسی حالت کو دیکھو عثمان! تم جیسا مضبوط اعصاب والا اور اتنا انٹیلی جنٹ کس ذہنی حالت تک پہنچ گیا ہے .... صرف ایک غیر عورت کے پیچھے .... اپنی اتنی خوبصورت بیوی اور پھولوں جیسے دو بچوں کو دھتکار کر تم کس پاگل پن میں جا پہنچے ہو۔ اسے کہتے ہیں اصل راستے سے ہٹ کر غلاظت میں اوندھے منہ گرنا"۔

"میجر عثمان!" ـــــ کیپٹن آصف بولا۔

"اوہ شٹ اَپ آصف!" ـــــ عثمان نے آصف کو ڈانٹتے ہوئے کہا ـــــ "پرائیویٹ محفل میں مجھے میجر نہ کہا کرو جس طرح میں تمہیں کیپٹن نہیں سمجھتا .... پلیز .... فار گاڈ سیک!"

"تھینک یو عثمان!" ـــــ آصف بولا ـــــ "آئی ایم ساری .... میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ تمہاری یہ حالت اس لڑکی کے ساتھ صرف عشق و محبت کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ تم مانو یا نہ مانو' ہم جانتے ہیں کہ تمہاری اس ذہنی تباہی میں ٹرانکولائزر گولیوں کا ہاتھ زیادہ ہے۔ وہ بدبخت تمہیں دھوکے میں نیند کی یہ گولیاں گھول گھول کر پلاتی رہی اور پھر تم خود بھی ان کے عادی ہو گئے۔ کیا تم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ یہ گولیاں ذہنی مریضوں اور پاگلوں کو دی جاتی ہیں یا اُن مریضوں کو دی جاتی ہیں جنہیں کسی وجہ سے نیند نہیں آتی لیکن ڈاکٹر چند دنوں بعد یہ گولیاں بند کر دیتے ہیں"۔

ہاں یار!" ـــــ عثمان نے کچھ بے بسی کے عالم میں کہا ـــــ "میں آج یہ اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ میں ان گولیوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ ذرا سی پریشانی ہوتی ہے یا اس لڑکی کا خیال آ جاتا ہے تو میں دو تین گولیاں منہ میں ڈال کر پانی پی لیتا ہوں۔ میں اندر سے بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے میں مر ہی گیا ہوں"۔

"جانتے ہو کیوں؟" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "اس لئے کہ تم نے اس لڑکی کو ا آپ پر آسیب کی طرح سوار کر رکھا ہے، اپنی شخصیت اور اپنا آپ اس کے قدموں م رکھ دیا ہے اور وہ وہی رول ادا کر رہی ہے جو قلو پطرہ نے جولیئس سیزر اور انتونی زندگی میں کیا تھا۔ وہ رومن جنگجو جن کے قدموں تلے زمین کانپتی تھی، ایک عورت قدموں تلے آکر ریت کی ڈھیریاں بن گئے تھے۔ تمہارا حال وہی ہُوا"۔

"بلکہ تم نے اپنا حال وہی کیا" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "اگر تم صرف محسوس کر لو کہ تم وہ نہیں رہے جو ہُوا کرتے تھے تو تم واپس آ سکتے ہو"۔

"ہاں یار!" ــــ عثمان نے شکست خوردہ لہجے میں کہا ــــ "میں اپنی اس کمزوری تسلیم کرتا ہوں لیکن اس کا جب خیال آتا ہے تو میری تمام قوتیں مفلوج ہو کے رہ جا ہیں اور پھر یہ کہتے ہوئے مجھے شرم بھی آتی ہے کہ میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے عثمان نہیں، میں لوسی ہوں"۔

میجر عثمان کے دوست اسے پہلی بار اس کیفیت میں دیکھ رہے تھے کہ وہ اتنی زبا شکست خوردگی کی باتیں کر رہا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھے، سب کچھ سمجھتے تھے۔ انہوں سوچا کہ لوہا گرم ہے اس لئے ابھی ضربیں لگا کر اسے اپنی مطلوبہ شکل میں لایا جائے، چنا انہوں نے اس کی حوصلہ افزائی شروع کر دی اور کچھ اس کے غلط خیالوں کی بھی تائ کرتے گئے۔ وہی عثمان جو اس قسم کی باتوں سے غصے میں آ جاتا تھا، اب بڑے تحمل او اطمینان سے سن رہا تھا۔ یہاں وہ بات سچ ثابت ہو رہی تھی جو ہمارے مفکر شاعر نے ک تھی ــــ "بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!" ــــ لیکن یہاں دشواری یہ تھی ک عثمان کے دوستوں کے دل تو عثمان کے سینے میں دھڑک رہے تھے لیکن عثمان کے دل ایک خوبصورت اور عیار لڑکی کا قبضہ تھا۔

"گزشتہ رات عجیب بات ہوئی" ــــ عثمان نے کہا ــــ "میں چار خواب آور گولیاں کھانے لگا تھا تو وینا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے دل میں وینا کی وہ محبت رہی ہی نہیں جو ہُوا کرتی تھی، پھر بھی میں اس کے سامنے بے بس ہو گیا اور صاف طور پر محسو کیا کہ میں وینا کا سامنا نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے دل کو یہ سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وینا محبت کے قابل نہیں اور یہ لوسی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں لیکن وینا میرے ذہن اور دل پر ایسی غالب آئی کہ میں نے گولیاں نہ لیں مگر اُس وقت مجھے ان گولیوں کی

شدید ضرورت تھی۔ میرے دل میں آتی تھی کہ وینا کو ڈانٹ ڈپٹ کر کمرے سے نکال دوں لیکن میں اپنے آپ کو اتنا کمزور سمجھ رہا تھا کہ میں پلنگ پر جا گرا اور اس کی منت سماجت کی کہ مجھے ایک دو گولیاں لے لینے دو۔ آخر اس نے مجھے دو گولیاں کھانے کی اجازت دے دی.... ایسا کیوں ہُوا ہے یار؟...."

"کیونکہ تم نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر مفلوج کر لیا ہے" ــــ کیپٹن آصف نے کہا

"میں نے ایسا ہی ایک کیس پہلے بھی دیکھا تھا" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "مجھے ڈر ہے تم بھی اُس حد تک نہ پہنچ جاؤ۔ وہ حد یہ ہے کہ ذہن کسی اور وجہ سے اُکھڑا ہُوا ہوتا ہے یا غصہ کسی اور وجہ سے آتا ہے تو یہ بیوی بچوں پر، اپنے ماتحتوں پر، حد یہ کہ اپنے ماں باپ اور بزرگوں پر نکالا جاتا ہے۔ ایسے خاوند اکثر اپنی بیویوں اور بچوں کی پٹائی بھی کرتے رہتے ہیں اور لوگ اصل وجہ سمجھے بغیر یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو پاگل ہے"۔

"مجھے بھی یہی ڈر ہے سمیع!" ــــ عثمان نے کہا ــــ "میں اُس حد تک پہنچنے والا ہوں.... لیکن میں اس لڑکی کو ایک بار دیکھنا یا ملنا ضرور چاہتا ہوں"۔

"دیکھ لو، مل لو اسے" ــــ سمیع نے کہا ــــ "میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ اسے کہاں دیکھا گیا ہے"۔

"لیکن ایک خطرہ ہے عثمان!" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "تم اسے دیکھ کر پھر اس کے جال میں پھنس جاؤ گے.... وہ تمہیں مل بھی گئی تو کیا کرو گے؟ کیا کہو گے اسے؟"

"وہ تمہیں پھر گمراہ کر دے گی" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "پھر ہمارے خلاف زہر اُگلے گی اور تم پھر ہمیں اپنا دشمن سمجھنے لگو گے.... لیکن چاہتا میں بھی یہی ہوں کہ کراچی جاؤ اور اسے دیکھو"۔

عثمان تو جانا ہی چاہتا تھا۔ اس کا مقصد اور ارادہ جو کچھ بھی تھا، اس نے جانے کا ارادہ پکا کر لیا۔ دراصل میجر سمیع اور کیپٹن آصف بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ کراچی جائے اور اس لڑکی کو دیکھے۔ ان دونوں کو خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ عثمان لڑکی کو دیکھتے ہی اس کے جال میں جا پھنسے گا۔ اس خطرے کو کم کرنے کے لئے دونوں نے عثمان کو بڑی اچھی طرح سمجھا دیا اور قائل کر لیا کہ وہ اُسے دیکھتے ہی دوڑ کر اس تک نہ پہنچے بلکہ کسی طرح اپنے آپ کو

چھپا کر ایک دو دن دیکھے کہ وہ کہاں جاتی ہے، کیا کرتی ہے اور اس کے شب و روز کس طرح گزرتے ہیں۔

○

پاکستان کی جڑوں میں اُترے ہوئے جاسوسوں کی سرگرمیاں بڑی ہی پُراسرار اور پُرخطر تھیں۔ لُوسی کراچی میں موجود تھی۔ اس کے متعلق پاکستان میں مقیم انڈیا کے سفیر نے بڑی سختی سے یہ حکم جاری کیا تھا کہ اس لڑکی کو اس جگہ سے دور رکھا جائے جہاں یہ پہچانی گئی تھی اور اگر خطرہ ہو تو کراچی میں ہی چھپا کر رکھا جائے یا اندرون سندھ بھیج دیا جائے، اور اگر ضرورت پڑی تو اسے واپس انڈیا بھیج دیا جائے گا۔

لوسی کوئی عجیب و غریب لڑکی نہیں تھی نہ ہی یہ کوئی طلسماتی چیز تھی۔ ایسی نہ جانے کتنی لڑکیاں ہمارے سامنے ہمارے معاشرے میں گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ سول اور فوج کے افسر انہیں پھانسنے کے جتن کرتے رہتے ہیں۔ یہ لڑکیاں سرحد پار سے اسی مقصد کے لئے بھیجی گئی تھیں کہ وہ افسروں کے ہاں پھنس جائیں مگر ظاہر یہ کریں کہ وہ ہائی کلاس سوسائٹی کے معزز خاندانوں کی لڑکیاں ہیں اور پھنسنے پھنسانے کو اپنے خاندان کی توہین سمجھتی ہیں۔ انہیں خاص طور پر ٹریننگ دی گئی تھی کہ اپنے مطلب کے افسر کے لئے خوبصورت اور دلکش سراب بن جاؤ، اس کے آگے آگے چلو، اسے اپنے پیچھے پیچھے چلاؤ اور جب وہ اپنی سفلی خواہشات کی تپش اور حیوانی جذبات کی تشنگی سے مجبور ہو کر گرنے لگے تو اس کے سینے سے راز نکال لو اور اسے اپنے حسن و جوانی کے دو گھونٹ پلا کر اس قابل بنا دو کہ اٹھ کر تمہارے پیچھے چلنے اور لپکنے کے قابل ہو جائے۔

ایسی لڑکیاں سرحد پار سے ہی نہیں آتی تھیں۔ پاکستان میں ایسے میٹھے زہر اور دلنشیں سراب کی کوئی کمی نہیں تھی۔ راتوں رات امیر بننے کی خواہش نے، شہزادیوں جیسی زندگی بسر کرنے کی ہوس نے اور ڈسکو طرزِ زیست نے اخلاقیات اور کردار کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ دین و ایمان جل کر راکھ ہو گئے تھے اور یہ لڑکیاں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر انڈیا کے جاسوسی اور تخریب کاری کے گروہوں میں شامل ہو جاتی تھیں۔

لُوسی کراچی میں تھی۔ وہاں کا رِنگ زیادہ مضبوط اور زیادہ محفوظ تھا۔ اس رِنگ کے پنجے کراچی اور اندرونِ سندھ میں گہرے اُترے ہوئے تھے۔ رنگ لیڈر کوئی ہندو نہیں تھا بلکہ وہ اسی علاقے کا رہنے والا خدا بخش نامی ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جس نے اپنا نام

دلیپ کمار مشہور کر رکھا تھا۔ وہ علیحدگی پسند سندھیوں کے لیڈروں میں شمار ہوتا تھا اور جئے سندھ تحریک کا سرگرم ورکر تھا۔ اندرون سندھ میں وہ خاص طور پر مشہور اور مقبول تھا۔ دشمن کے جاسوس اور تخریب کار اس علاقے میں کامیاب ہوتے ہیں جس علاقے کے رہنے والوں میں سے کچھ بااثر لوگ ان کے ساتھ مل جائیں۔

"راؤ!" ــــ لُوسی نے ایک روز اپنے رِنگ کے ایک ساتھی راما راؤ سے کہا ــــ "میں پاکستان کے دو شہروں، لاہور اور اسلام آباد میں رہی ہوں۔ رہی تو میں آزادی سے ہوں لیکن یہ خوف کبھی کم کبھی زیادہ دل میں موجود رہا کہ میں پکڑی جاؤں گی، حالانکہ میں دیکھ رہی تھی کہ پاکستان کے بڑے آدمیوں کو عورت کی جھلک چاہئے خواہ وہ عورت ان کی جانی دشمن ہی کیوں نہ ہو، لیکن کراچی اور سندھ میں آ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں انڈیا میں آ گئی ہوں"۔

"اری بے وقوف!" ــــ راما راؤ نے کہا ــــ "یہ علاقہ ہے ہی انڈیا کا۔ مشرقی پاکستان تو ہمیں لڑ جھگڑ کر اور زمین دوز کارروائیاں کر کر کے ملا تھا، سندھ کو لینا اتنا مشکل نہیں ہو گا۔ بھگوان پاکستان کے لیڈروں اور حکمرانوں کی عقل اور آنکھوں پر اسی طرح پردہ ڈالے رکھے تو ہماری حکومت جب چاہے سندھ پر ہاتھ صاف کر سکتی ہے"۔

"اور کرے گی" ــــ لُوسی نے کہا ــــ "میں کہنا یہ چاہتی تھی کہ میں نے پاکستان کے صرف شہر اور شہری زندگی دیکھی ہے، دل چاہتا ہے سندھ کا دیہاتی علاقہ دیکھوں۔ ابھی میرا کوئی کام تو ہے نہیں نہ ابھی کوئی ذمہ داری دی گئی ہے۔ یہاں کے کرتا دھرتا تم ہی ہو۔ مجھے سندھ کی سیر کرا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں" ــــ راما راؤ نے کہا ــــ "یہ تو تمہارا حق ہے .... تم نے ذمہ داری کی بات کی ہے۔ میں تمہیں ایک مشن پر لگاؤں گا۔ تم جانتی ہو یہاں پاکستان کی نیوی ہے۔ دو افسر ہمارے ہاتھ آئے ہیں۔ معلوم ہُوا ہے کہ پاکستان نیوی کہیں سے نئے میزائل لے رہی ہے لیکن ابھی یہ کام شروع کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ میں تمہیں اندرون سندھ گھما پھرا لاؤں گا"۔

"جانتے ہو میں کیا دیکھنا چاہتی ہوں؟" ــــ لُوسی نے کہا اور خود ہی جواب دیا ــــ "سندھ کے ڈاکو بہت مشہور ہو گئے ہیں۔ میں انہیں یا ان میں سے کسی ایک بڑے گروہ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان تک پہنچنا آسان نہیں ہو گا۔ اتنے بڑے ڈاکو

سامنے گھومتے پھرتے تو نظر نہیں آتے"۔

"یہ وہ کتابوں اور افسانوں والے ڈاکو نہیں لُوسی!" ــــ راما راؤ نے اسے بتایا۔ "وہ ڈاکو کبھی کے ختم ہو چکے ہیں جو انگریزوں کے زمانے میں ہُوا کرتے تھے۔ یہ جو سندھ میں ڈاکے ڈالتے پھرتے ہیں' کوئی پیشہ ور ڈاکو نہیں' ڈکیتی اور اغوا کا سلسلہ ہم نے یہاں کے سٹوڈنٹس اور دوسرے لوگوں سے شروع کروایا ہے۔ مشرقی پاکستان میں تو ہم نے اسّی نوّے ہزار کمانڈو داخل کر دیئے تھے جو وہاں کے بنگالیوں میں گھل مل گئے تھے' یہاں ہم نے ڈاکے اور اغوا کا سلسلہ شروع کروادیا ہے۔ جب یہ وارداتیں بڑھنے لگیں اور کوئی پکڑ دھکڑ نہ ہوئی تو کچھ لوگوں نے ڈکیتی کو پیشہ اور شغل بنالیا۔ یہ سب اپنے آدمی ہیں۔ میں تمہیں ان میں سے ایک ایسے آدمی سے ملواؤں گا جو اُن سب کا لیڈر اور پیرو مرشد ہے"۔

"یہ دیکھ لو راؤ!" ــــ لُوسی نے کہا ــــ "میرا وہاں جانا میرے لئے خطرناک تو نہیں!؟"

"نہیں" ــــ راؤ نے جواب دیا ــــ "میں تمہیں کسی ڈاکو یا کسی اور آدمی کے پاس اکیلا چھوڑ آؤں' وہ آدمی خواہ کتنا ہی بڑا اور کتنی ہی بڑی حیثیت کا کیوں نہ ہو' میں صرف یہ کہہ دوں کہ اس لڑکی کا خیال رکھنا' انڈیا کی ہے اور یہ ہماری لڑکی ہے تو وہ آدمی تمہیں مذہبی کتاب کی طرح سنبھال کر رکھے گا۔ دوسری طرف ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ اپنے ہی کسی رشتہ دار کی بیٹی کو اغوا کرکے اس کے ماں باپ کو اطلاع بھجوائیں گے کہ اتنے لاکھ روپیہ دو اور بیٹی کو چھڑوا لو۔ لڑکی کو جو خراب کریں گے وہ الگ معاوضہ ہو گا.... ہاں لُوسی! ایک بات ذہن میں آ گئی ہے۔ کہنے کی ضرورت تو نہیں۔ تم سب کچھ سمجھتی ہو۔ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا"۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب تمہارے جسم سے ہے" ــــ راما راؤ نے کہا ــــ "اپنے جسم کے استعمال میں محتاط رہنا"۔

"اوہ راؤ!" ــــ لُوسی نے طنزیہ سی ہنسی ہنس کر کہا ــــ "اس احتیاط کی تو مجھے اتنی پریکٹس ہو گئی ہے کہ آدمی کو اپنی مٹھی میں لے لیتی ہوں اور اسے یہ تاثر دیتی ہوں کہ اُس نے مجھے مٹھی میں لے لیا ہے اور جب وہ مکمل طور پر حیوان بن کر مجھ پر لپکتا ہے تو

بڑی خوبی اور کامیابی سے اسے کل کے وعدے پر راضی کر لیتی ہوں۔ اگر میں یہ احتیاط نہ کرتی تو پاکستان کے یہ افسر اور لیڈر مجھے اس وقت تک ٹی بی کا مریض بنا چکے ہوتے۔ لاہور میں میرا آخری شکار پاک آرمی کا ایک میجر تھا۔ اس کی جسمانی ہوس پوری کیئے بغیر میں نے اسے صحیح معنوں میں پاگل بنا دیا ہے' اور اسے جس طرح میں نے دونوں ہاتھوں سے لُوٹا ہے وہ تم تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے۔ وہ میری ہر فرمائش پوری کرنے میں فخر اور دلی سکون محسوس کرتا تھا۔ بدبخت کے پاس پیسے کی بھی کمی نہیں تھی۔ میں اسے ایک سو روپے کا تحفہ دے کر اس کے جواب میں ایک ہزار روپے کا تحفہ لے لیا کرتی تھی۔ اس نے جو کپڑے مجھے دیئے ہیں وہ تو کوئی شہزادی ہی پہنتی ہو گی"۔

"یہ استادوں کی ٹریننگ کا کمال ہے" ــــ راما راؤ نے کہا ــــ "ورنہ تمہاری عمر کی لڑکی جذبات میں آ کر خراب ہو ہی جاتی ہے"۔

"استادوں کا کمال تو ہے" ــــ لُوسی نے کہا ــــ "لیکن میں نے یہ ٹریننگ ایک پاکستانی عورت سے حاصل کی ہے۔ اس کے ساتھ ایک فنکشن میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی عمر چالیس سال کے قریب ہے لیکن کمبخت بیس سال کی لگتی ہے۔ ایسی استاد عورت ہے کہ ایک آدمی کو پھنسائے رکھتی ہے۔ اس نے مجھے صاف الفاظ میں بتایا تھا کہ وہ جسے پھانستی ہے' اس کی ایک دو نفسیاتی کمزوریاں بھانپ لیتی ہے پھر ان کمزوریوں کو اپنی مٹھی میں لے لیتی ہے اور پھر باتوں اور ایکٹنگ سے اس کی ان کمزوریوں کو محرومیوں کا رنگ دے کر اس کی تسکین کرتی رہتی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ باتوں سے اپنے شکار کو ہپناٹائز کر لیتی ہے' اپنے جسم کو بچا کر رکھتی ہے' پیار و محبت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی لیکن اس سے آگے بات بڑھنے بھی نہیں دیتی اور اپنے شکار کا وہی حال کر دیتی ہے جو جالے میں آئی ہوئی مکھی کا مکڑی کرتی ہے....

"اس نے اپنے خاوند کو بھی انگلیوں پر نچا رکھا ہے۔ میرے ساتھ اس کی دوستی بڑی گہری ہو گئی۔ میری استادی دیکھ کہ میں نے اسے شک تک نہیں ہونے دیا کہ میری اصلیت کیا ہے۔ کردار اور اخلاق کے لحاظ سے وہ اونچے درجے کی طوائف کی مانند ہے یعنی ایسی طوائف جو صرف دو تین مستقل گاہک بنا کر رکھتی ہے۔ میں نے اُس سے کام کے گُر سیکھے تھے.... یہ عورت دراصل ہمارے کام کی ہے لیکن میں نے اس سے بچ کر رہنا ہی بہتر سمجھا کیونکہ اس قسم کی عورتیں ڈبل کراس شروع کر دیتی ہیں۔ اس عورت

کی شہرت یہ ہے کہ کئی گھر اور کئی لوگوں کے کاروبار تباہ کر چکی ہے لیکن کیا کمال ہے اس عورت کا کہ جو اس کی اس ہسٹری سے واقف ہیں وہ بھی اس کے جال میں آ جاتے ہیں"۔

پاکستان اور پاکستانیوں کی کمزوریوں اور دکھتی رگوں پر کچھ دیر تبادلۂ خیالات کر کے راما راؤ نے لُوسی کے ساتھ اندرون سندھ کی سیر کا پروگرام طے کیا۔



جاسوسی یا جاسوسوں کی دنیا میں ایک ڈرامہ لاہور کی ایک کوٹھی میں کھیلا جا رہا تھا جس کا تعلق صغیر کے ساتھ تھا۔ صغیر کی برین واشنگ نشہ آور دوائیوں اور ایک بڑی خوبصورت شوخ اور اداکار قسم کی لڑکی کے ذریعے کی جا رہی تھی اور یہ برین واشنگ ہو چکی تھی۔ صغیر ابھی زیرِ نگرانی تھا۔

"اب نگرانی کی بھی ضرورت نہیں" ــــ ایک روز مُنی نے سریش کو رپورٹ دی ــــ "تم خود دیکھ لو' میرا خیال تو یہ ہے کہ اسے کھلا چھوڑ دیا جائے تو گھوم پھر کر یہیں آ جائے گا"۔

"تمہیں زیادہ پریشان تو نہیں کرتا؟" ــــ سریش نے پوچھا۔

"میری پریشانی کی بات کرتے ہو!" ــــ منی نے ہنستے ہوئے کہا ــــ "یہ تو میرا جادو ہے کہ میں ابھی تک اس سے بچی ہوئی ہوں ورنہ اس کا حال یہ ہو جاتا ہے جیسے مجھے کچا کھا لے گا۔ میں نے اس پر سچے عشق کا ایسا بھوت سوار کر رکھا ہے کہ میں اپنے جسم کو بچالیتی ہوں۔ کبھی کبھی خطرہ سا نظر آتا ہے کہ اس نے مجھے کبھی دبوچ لیا تو میں اس سے بچ نہیں سکوں گی۔ ویسے اس بندے کو اپنا ہی بندہ سمجھو"۔

"تم فکر نہ کرو" ــــ سریش نے کہا ــــ "میں نے تمہیں بتانا ہی تھا کہ اس کے متعلق گزشتہ رات فیصلہ ہو چکا ہے کہ اسے انڈیا لے جانا ہے لیکن ایک مشکل پیش آ رہی ہے۔ پاکستان کی انٹیلی جنس کچھ زیادہ ہی چوکنی ہو گئی ہے۔ انہی دنوں ہمارے ایک رنگ کے دو آدمی گرفتار ہو گئے ہیں۔ ریل گاڑی سے جانا ذرا خطرے والی بات ہو گئی ہے۔ پاکستان کے سنٹرل انٹیلی جنس بیورو اور آئی ایس آئی کے آدمی ریلوے سٹیشن پر موجود رہتے ہیں اور چیکنگ بڑی سخت ہو گئی ہے"۔

"تو کچھ دن انتظار کیا جا سکتا ہے" ــــ مُنی نے کہا۔

"نہیں" ــــ سریش نے کہا ــــ "اس شخص کے لئے انتظار مناسب نہیں۔ اس کی ذہنی حالت ایسی ہے کہ اسے فوراً سرحد پار بھیجنا ہے"۔

"کیا یہ آدمی اتنا زیادہ اہم ہے؟" ــــ منی نے پوچھا۔

"اہم ہے یا نہیں" ــــ سریش نے کہا ــــ "یہ اوپر والوں کا فیصلہ ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ شخص ہے بڑے کام کا۔ شاید اس لئے ہمارا چیف اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا"۔



جس وقت یہ دونوں آپس میں صغیر کے متعلق باتیں کر رہے تھے اُس وقت صغیر دو کمرے چھوڑ کر ایک کمرے میں گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ اچانک صغیر کی بڑی بلند آواز سنائی دی۔ وہ مُنی کو بلا رہا تھا۔

"اسے جلدی یہاں سے لے جاؤ سریش!" ــــ مُنی نے اُکتائے ہوئے سے لہجے میں کہا ــــ "اس نے میری تو جان کھالی ہے"۔

"تنخواہ کس کام کی لیتی ہو؟" ــــ سریش نے ہنستے ہوئے کہا ــــ "اور جو عیش موج کرتی ہو.... یہی تو تمہارا کام ہے۔ جاؤ اور اپنے شکار کے ساتھ کھیلو"۔

تپائی پر شراب کی بوتل رکھی تھی۔ مُنی نے دو پیگ گلاس میں ڈالے اور اپنے حلق میں انڈیل لئے۔ اس نے بھی آخر اپنے اعصاب کو مضبوط رکھنا تھا۔ صغیر جیسے شکار کے ساتھ کھیلنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مُنی صغیر کے کمرے میں چلی گئی۔

"کہاں مر جاتی ہو؟" ــــ صغیر نے رُوٹھے ہوئے بچّے کے لہجے میں کہا۔

"تم سو گئے تھے" ــــ مُنی نے اس کے پاس بیٹھ کر اور اس کے گلے میں بازو ڈال کر اور پھر اپنا گال اس کے گال سے لگا کر کہا ــــ "میں تمہیں چھوڑ کر بھلا کہاں جا سکتی ہوں"۔

سچّے عشق کی اداکاری شروع ہو گئی۔ ایک طرف اداکاری تھی اور دوسری طرف نشہ آور دوائیوں کے خمار میں جھومتی جھامتی ہوئی ایک حقیقت تھی۔ مُنی اداکاری تو بڑی کامیابی سے کر رہی تھی لیکن اس کے دل میں وہ تنخواہ اور عیش و عشرت تھی جو اس اداکاری کے عوض اسے یہاں مل جاتی تھی اور اس کا کچھ حصہ معاہدے کے مطابق انڈیا میں اس کے ماں باپ کو مل جاتا تھا۔



"تم شاید پی کر آئی ہو" ـــ صغیر نے اُس کی سانسیں سونگھ کر کہا۔

"تم بھی پیئو گے؟" ـــ مُنی نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"تم نے پی ہے تو میں کیوں نہ پیئوں" ـــ صغیر نے کہا ـــ "تمہارے ہاتھ سے تو میں زہر کا پیالہ بھی پی لوں گا"۔

مُنی اس کے ہونٹ چُوم کر ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا جس میں شراب کے دو پیگ اور کچھ سوڈا تھا اور اس میں تھوڑی سی آمیزش ایک نشہ آور دوائی کی تھی۔ صغیر نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں انڈیا کی سیر کراؤں گی" ـــ مُنی نے کہا ـــ "میں نے انتظام کر لیا ہے"۔

"کب چلیں گے؟" ـــ صغیر نے بے تابی سے پوچھا ـــ "آگرہ کا تاج محل دکھاؤ گی نا؟.... اور قطب مینار تو میں ضرور دیکھوں گا"۔

"سیر کرانے کے لئے ہی تو تمہیں لے جا رہے ہیں" ـــ مُنی نے کہا ـــ "وہاں تمہیں تاج محل اور قطب مینار کے علاوہ ایسی ایسی جگہیں اور چیزیں دکھائیں گے کہ تم حیران رہ جاؤ گے اور واپس آنا ہی نہیں چاہو گے"۔

"دیکھو مُنی!" ـــ صغیر نے بچوں کے سے لہجے میں کہا ـــ "میں واپس آنے کے لئے نہیں جاؤں گا۔ پاکستان میں رکھا ہی کیا ہے۔ اس ملک کا تو میں بیڑہ ہی غرق کر دوں گا"۔

مُنی اس کے لب و لہجے اور انداز سے اندازہ کر رہی تھی کہ نشہ آور دوائی کا اثر شروع ہُوا ہے یا نہیں۔ یہ اثر شروع ہو چکا تھا بلکہ صغیر کے دماغ کو تقریباً" پوری طرح اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔ مُنی نے اسے انڈیا کی خوبیاں اور پاکستان کی خرابیاں سنانی شروع کر دیں۔

یہ تو روز مرّہ کا معمول بن گیا تھا۔ صغیر کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے نشہ آور دوائیاں دی جا رہی ہیں۔ وہ اپنے آپ میں نشے کی جو کیفیت محسوس کرتا تھا اسے وہ مُنی کے عشق کا خمار اور سرور سمجھتا تھا۔ اس ذہنی کیفیت میں مُنی یا سریش جو باتیں اس کے ذہن میں ڈالنا چاہتے تھے وہ بغیر کسی کاوش اور بغیر استدلال کے اُس کے ذہن میں اُتر جاتی

تھیں اور پھر وہ انہیں ذہنی طور پر قبول کر لیتا تھا۔ اُس روز بھی مُنی نے یہی عمل دہرایا اور صغیر اُٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ وہ فوراً" انڈیا پہنچنا چاہتا ہے۔

"لیکن ایک مشکل آ پڑی ہے صغیر!" ـــ مُنی نے کہا ـــ "ہم ریل گاڑی سے نہیں جا سکیں گے۔ ریلوے سٹیشن پر چیکنگ بڑی سخت ہو گئی ہے۔ اس مشکل کو تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ شاید ہمیں رات کے وقت سرحد پار کرنی پڑے گی .... کر لو گے؟"

"تم سرحد کی بات کرتی ہو؟" ـــ صغیر نے مخمور سی آواز میں کہا ـــ "میں آگ میں سے بھی گزر جاؤں گا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ایک بار سرحد پار کر چکا ہوں"۔

"پھر انڈیا میں کہاں تک گئے تھے؟"

"یہی تو افسوس ہے" ـــ صغیر نے کہا ـــ "جالندھر تک گئے۔ تین چار روز رہے پھر انہوں نے واپس بھیج دیا۔ میں تو جالندھر کے سوا انڈیا کا کچھ بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ میرے لئے سرحد پار کرنا کوئی مشکل کام نہیں .... تم ساتھ ہو گی؟.... تمہیں ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔ لڑکی کے لئے اس طرح سرحد پار کرنا بڑا ہی خطرناک ہے"۔

"میں تو گاڑی سے جاؤں گی" ـــ مُنی نے جھوٹ بولا ـــ "میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ ہو سکتا ہے میں تم سے پہلے دِلّی پہنچ جاؤں"۔

مُنی اس کے پاس بیٹھی رہی۔ عشق و محبت کا کھیل چلتا رہا اور رات آ گئی۔

○

مُنی جیسی ہی ایک خوبصورت ناگن کا ڈسا ہُوا میجر عثمان بڑی تکلیف دہ ذہنی کیفیت میں مبتلا تھا۔ وہ تو یوں سمجھئے کہ حُسن و جوانی اور ریاکاری کی تلوار نے اس کے وجود کو اوپر سے نیچے تک دو حصوں میں کاٹ دیا تھا۔ اس کے دونوں حصے زندہ تھے۔ زندہ ہی نہیں بیدار بھی تھے اور دونوں حصے الگ الگ ہو کر پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئے تھے۔

"اب تو مجھے بھی شک ہونے لگا ہے کہ لوسی اصل میں کچھ اور ہے"۔

"میں لوسی کے بغیر شاید زندہ نہ رہ سکوں۔ وہ نہیں تو میں بھی نہیں"۔

"میرے دوست کم از کم میرے ساتھ جھوٹ نہیں بول سکتے"۔

"دوست بھی آخر مجھ جیسے فوجی ہیں۔ لُوسی اس طرح ہاتھ نہ آئی تو اغوا کر کے اُس کی آبروریزی کر لی"۔

"ویتا خوبصورت بھی ہے زندہ مزاج بھی۔ کیا خامی ہے اس میں؟ اور اتنے پیارے بچے؟"

"ویتا میں وہ بات کہاں جو لُوسی میں ہے۔ بچے تو ابھی ہونے ہی نہیں چاہئیں تھے"۔

"میں لُوسی پر لعنت بھیجتا ہوں"۔

"لعنت ان سب پر جو میرے اور لُوسی کے درمیان آنا چاہتے ہیں"۔

"میں اسے دیکھنے کراچی جاؤں گا۔ کسی کے ساتھ دیکھی تو اس کا گلا گھونٹ دوں گا"۔

"لُوسی کو کسی اور کے ساتھ دیکھا تو اسے زبردستی اٹھا کر لے آؤں گا خواہ ویتا کو طلاق دینی پڑے"۔

"لُوسی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں گا..... بھول جاؤں گا"۔

"میں اسے کیسے چھوڑ دوں' وہی تو میری زندگی ہے"۔

اور ایسے ہی متضاد خیالات' سوچیں اور ارادے تھے جو بجلی کی نیگیٹو اور پازیٹو کرنٹ کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے تو میجر عثمان کی ذات میں شعلے چمکتے اور دھماکے ہوتے۔ اس کیفیت میں وہ گھر سے بھاگ جانے کی بھی سوچ لیتا اور ملٹری سروس سے بھی بیزار ہو جاتا۔ اسے اپنا رینک اور سوشل پوزیشن محض بیکار چیزیں نظر آتیں۔ اسے غصہ بھی آ جاتا جو وہ ویتا اور بچوں پر نکال تو لیتا لیکن اب اس میں یہ تبدیلی آ گئی تھی کہ اپنے بیوی بچوں پر غصہ نکال کر پچھتاتا تھا اور یہ اس کے لئے ایک اور روحانی اذیت بن گئی تھی۔

ویتا نے اس میں معمولی سی یہ تبدیلی بھی دیکھی کہ اب وہ اس کے ساتھ ذرا اچھی طرح بولتا تھا اور کبھی بچوں کی بات بھی سن لیتا تھا' پھر بھی وہ جب لوسی کو اپنے دماغ پر سوار کر لیتا تو بیوی بچے اس کے لئے اجنبی بن جاتے تھے۔

اس دوران دوست اسے اکساتے رہے کہ وہ کراچی جائے اور جلدی جائے۔ دوستوں کو یہ خطرہ بھی نظر آ رہا تھا کہ کراچی اگر لُوسی اسے مل گئی تو وہ پھر اسے اپنے طلسم میں گرفتار کر لے گی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سوچتے تھے کہ لُوسی کو اب عثمان کے ساتھ دلچسپی نہیں رہی اور وہ عثمان کو دھتکار دے گی۔ بہرحال میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے یہ خطرہ مول لے لیا اور عثمان کو کراچی جانے پر آمادہ بلکہ تیار کر لیا۔

"ویتا!" ---- ایک روز میجر عثمان گھر آیا اور ویتا سے کہا ---- "میں کل صبح کراچی جا رہا ہوں"۔

"ڈیوٹی پر؟"

"ہاں" ---- عثمان نے جوبادیا ---- "ڈیوٹی پر ہی جا سکتا ہوں"۔

"کتنے دن؟"

"نو دس دن تو لگ جائیں گے" ---- عثمان نے جواب دیا۔

ویتا کے دل پر بڑی زور کی چوٹ پڑی۔ اسے معلوم تھا لُوسی کراچی پہنچ گئی ہے۔ عثمان سے تو وہ پوچھ نہیں سکتی تھی کہ وہ لُوسی کے لئے جا رہا ہے یا واقعی ڈیوٹی پر۔ اسے یہ ڈر بھی محسوس ہُوا کہ لُوسی نے عثمان کو فون کیا ہو گا اور اسی ڈائن نے اسے کہا ہو گا کہ کراچی آؤ۔ ویتا بجھ کے رہ گئی۔

شام کو عثمان باہر نکل گیا تو ویتا نے میجر سمیع سے بات کرنے کے لئے اس کی یونٹ کے آفیسرز میس میں فون کیا۔ میجر سمیع کو کمرے میں اطلاع ملی تو وہ دوڑتا ہُوا فون پر پہنچا۔

"بھائی جان" ---- ویتا نے میجر سمیع سے کہا ---- "اس چڑیل نے تو ہمیں کراچی پہنچ کر بھی نہیں بخشا۔ عثمان کراچی جا رہا ہے اور کہتا ہے کہ ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔ مجھے عثمان کی کسی بات پر یقین نہیں آتا۔ آپ نے بھی دیکھا ہے کہ وہ کس قدر جھوٹ بولتا ہے... کیا آپ اس کے آفس سے معلوم کروا سکتے ہیں کہ وہ واقعی ڈیوٹی پر جا رہا ہے؟"

"میں نے آپ سے بات کرنی تھی بھابی!" ---- میجر سمیع نے کہا ---- "آپ اتنا زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں اور کیپٹن آصف خود عثمان کو کراچی بھیج رہے ہیں۔ امجد صاحب اور اختر صاحب کو بھی معلوم ہے۔ یہ تو آپ جانتی ہیں کہ لُوسی کو امجد صاحب نے کراچی میں کسی کے ساتھ دیکھا تھا۔ میں آپ کو پہلے بتا دیتا لیکن آپ کے ساتھ علیحدگی میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ہم نے عثمان سے کہا ہے کہ خود کراچی جا کر اس ایڈریس پر لُوسی کو دور کھڑے ہو کر اور چھپ کر دیکھے۔ آپ کے ساتھ عثمان نے صرف اتنا سا جھُوٹ بولا ہے کہ وہ ڈیوٹی پر جا رہا ہے درا صل وہ دس دنوں کی چھٹی پر جا رہا ہے"۔

"وہ شیطان عورت عثمان کو پھر اپنی لپیٹ میں لے لے گی" ---- ویتا نے کہا۔

"ہم نے یہ خطرہ مول لیا ہے" ——میجر سمیع نے کہا —— "آپ اللہ کے حضور دعا کریں۔ یہ کیس ایسا ہے جو دعاؤں سے ہی ٹھیک ہو سکتا ہے۔ بہرحال عثمان کا کراچی جانا اور لُوسی کو دیکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے"۔

"میں بھی ساتھ نہ چلی جاؤں؟"

"ہاں' کیوں نہیں" ——میجر سمیع نے کہا —— "اسے یہ نہ پتہ چلے کہ آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ ڈیوٹی پر نہیں بلکہ چھٹی پر جا رہا ہے۔ اب یہ آپ کا کمال ہے کہ اسے منوا لیں کہ وہ آپ کو ساتھ لے جائے"۔

"آپ نے تو بھائی جان' میرے دل سے بوجھ اٹھا دیا ہے" ——وینا نے کہا —— "میں تو ڈر گئی تھی کہ اب عثمان آئے دن کراچی ہی جاتا رہے گا"۔

"مجھے امید ہے کہ اللہ جو کرے گا بہتر ہی ہو گا" —— سمیع نے کہا —— "ہم بھی یہیں ہیں۔ کوئی ناگوار صورتِ حال پیدا ہو گئی تو سنبھالنے کی کوشش کریں گے"۔

رات کو عثمان گھر واپس آیا تو وینا نے کچھ زیادہ ہی پیار سے اس کا استقبال کیا اور عملی طور پر پہلے سے کہیں زیادہ وفاداری کا مظاہرہ کیا۔

"نیند نہ آئے تو دو تین گولیاں کھا لینا عثمان!" ——وینا نے ماؤں جیسے پیار سے کہا۔

"نہیں" —— عثمان نے لاپرواہی کے انداز میں کہا —— "میں ان گولیوں کی عادت توڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شاید آج رات ایک بھی گولی نہ لوں"۔

"ایسے نہیں" —— وینا نے کہا —— "عادت توڑنی ہے تو آہستہ آہستہ توڑیں۔ یکلخت چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ آج میں آپ کو اپنے ہاتھ سے دو گولیاں دوں گی"۔

میجر عثمان نے چونک کر وینا کی طرف دیکھا۔ وینا کے رویے میں یہ تبدیلی اس کے لئے حیران کن تھی۔ وینا نے عثمان کی میز کی دراز سے گولیوں کا پتّا نکالا اور دو گولیاں اس کے ہاتھ میں دے کر پانی لینے چلی گئی۔ عثمان اسے جاتے بڑی غور سے دیکھتا رہا اور جب وینا واپس آئی تو عثمان کی نظریں ابھی تک دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور وینا کو دیکھنے لگیں۔ عثمان نے گولیاں نگل لیں اور پانی پی لیا۔

"ایک بات مانو گے عثمان؟"

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے کون سی بات منوانا چاہتی ہو" —— عثمان نے قدرے شگفتہ لہجے میں کہا —— "یہی کہو گی ناکہ لُوسی کا خیال دل سے نکال دو"۔

"نہیں میرے یار!" ——وینا نے بڑی بے تکلفی سے اس کے پاس بیٹھتے اور بازو اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا —— "تم تو ڈیوٹی پر جا رہے ہو' مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ خدا کی قسم باہر نکلے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ ایک بات تو مان لو"۔

وینا نے کچھ ایسی پیاری اور جذباتی سی حرکتیں کیں کہ عثمان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"چلی چلو" —— عثمان نے کہا —— "میں تو ڈیوٹی پر رہا کروں گا تم بچوں کے ساتھ ہوٹل میں رہ لینا"۔

"تمہاری دونوں وَردیاں تیار کر لوں؟" ——وینا نے پوچھا۔

"نہیں" —— عثمان نے کہا —— "وردی کی ضرورت نہیں۔ یہ ڈیوٹی ایسی ہے کہ سول کپڑوں میں رہنا پڑے گا.... ایک بات کہوں وینا!"

"ایک نہیں سو باتیں کہو" —— وینا نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا اور زیادہ تنگ کرتے ہوئے کہا۔

"تم اگر لُوسی سے بڑھ کر نہیں تو اس جتنی چالاک ضرور ہو" —— عثمان نے مسکراتے ہوئے کہا —— "تم نے ایسے طریقے سے اپنی خواہش ظاہر کی ہے کہ میں انکار نہیں کر سکا"۔

"چالاکی نہیں عثمان!" ——وینا نے کہا —— "اسے محبت کہو"۔

"معلوم ہوتا ہے میرے لئے محبت مر گئی ہے" —— عثمان نے آہستہ سے کہا۔

"محبت نہیں مری عثمان!" ——وینا نے کہا —— "تمہاری وہ نظر مر گئی ہے جس نظر سے تم نے پہلی رات مجھے دیکھا تھا۔ محبت کرنے والوں میں کوئی ایک مر جائے تو اسے دفن کر دیتے ہیں لیکن محبت زندہ رہتی ہے .... میں وعدہ کرتی ہوں عثمان! میں کبھی نہیں کہوں گی کہ لُوسی کو بھول جاؤ۔ نہ بھولو۔ اسے دل میں رکھو۔ میں صرف یہ کہتی ہوں کہ مجھے اور اپنے بچوں کو نہ بھول جانا۔ ایک دن آئے گا کہ تم کھچے ہوئے میرے پاس آؤ گے"۔

"اور تم مجھے طعنہ دو گی کہ کہاں ہے تمہاری وہ" —— عثمان نے کہا —— "اور ایسے ہی طعنے دو گی"۔

"میں ایسی اوچھی نہیں عثمان!" ——وینا نے کہا —— "میرے دل میں تمہاری محبت

نہ ہوتی تو آج میں یہاں نہ ہوتی۔ تمہاری محبت پر میں نے اپنی خودداری کو اور خاندانی وقار کو قربان کر دیا ہے۔ میری عقل حاضر ہے۔ میں جانتی ہوں کہ طعنوں اور کوسنوں سے کبھی کوئی کسی کا نہیں بنا۔ دل میں سچی محبت اور خلوص ہو تو یہ دل اپنے محبوب کو مقناطیس کی طرح کھینچ لیتا ہے“۔

عثمان اپنے آپ میں وہ کمزوری محسوس کرنے لگا جس کا ذکر اس نے میجر سمیع اور کیپٹن آصف کے ساتھ بھی کیا تھا۔ اس میں کھری بات کا اور کسی سچے انسان کا سامنا کرنے کا حوصلہ رہا ہی نہیں تھا۔ لُوسی نے اسے بڑے خوبصورت خواب دکھا کر اور خود ایک خوبصورت خواب بن کر اس کی شخصیت اور اس کی اخلاقی جرأت کو کچل اور مسل ڈالا تھا۔ اسے سوچنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ لوسی نے یہ اس لئے کیا تھا کہ اس کے کام اسی صورت میں نکل سکتے تھے کہ عثمان آزادانہ طور پر کچھ سوچنے کے قابل نہ رہے۔ بات بڑی صاف تھی کہ لُوسی جاسوس تھی اور اس نے عثمان سے راز لینے تھے اور اس کا دوسرا مقصد عیش و عشرت سے تھا جو عثمان اسے حد سے زیادہ کراتا تھا۔ وہ عثمان سے تحفوں اور اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں کھانے کے علاوہ کیش بھی وصول کر لیتی تھی۔

عثمان اپنی بیوی بچوں کے لئے شیر بنا ہُوا تھا لیکن وینا نے جب جذباتی باتیں کیں یا یوں کہئے کہ وینا کے دل سے جب سچے عشق و محبت کی باتیں نکلیں تو عثمان مجبور اور بے بس ہو گیا۔ اس کمزوری نے اسے پریشان سا کر دیا۔ وینا نے اسے جو دو خواب آور گولیاں کھلائی تھیں ان کا اثر بھی شروع ہو گیا تھا۔ وہ جمائیاں لینے لگا تو وینا نے اُسے یوں سلا دیا جیسے ماں بچے کو سلا دیتی ہے۔

○

اگلا دن کراچی جانے کی تیاریوں میں گزر گیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی گاڑی پر کراچی جائیں گے۔ وینا نے اسے کہا کہ سندھ کے علاقے میں سے گزرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ اکثر خبریں آتی ہیں کہ ڈاکوؤں نے ایک کار کو روک لیا اور لُوٹ کر غائب ہو گئے۔

”کوئی ڈاکو ایسی جرأت نہیں کر سکتا“ ـــــ عثمان نے کہا ـــــ ”میں اپنا ریوالور ساتھ لے جا رہا ہوں۔ دو نالی بندوق بھی لے چلتے ہیں۔ ضرورت پڑی تو میں ریوالور فائر کروں گا اور تم بندوق چلانا۔ چلے ہوئے کارتوس نکال کر دونوں بیرلوں کو پھر لوڈ کرنا جانتی

ہو۔ دو تین بار تم میرے ساتھ شکار پر جا چکی ہو“۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے“ ـــــ وینا نے کہا۔

اگلی صبح ابھی تاریک ہی تھی جب ان کی گاڑی گیراج سے نکلی اور پھر لاہور شہر سے نکل گئی۔

وہ ملتان میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ انجن میں کسی گڑبڑ کی وجہ سے گاڑی رک گئی۔ یہ بھی اچھا ہُوا کہ وہ شہر میں داخل ہو چکے تھے ورنہ کہیں جنگل میں خوار ہوتے رہتے۔ عثمان نے ایک تانگہ پکڑا اور جا کر مکینک کو لے آیا۔ کم و بیش اڑھائی گھنٹے گاڑی نے ضائع کر دیئے۔ فائدہ یہ ہُوا کہ خطرناک نقص یہیں ٹھیک ہو گیا۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا ملتان میں کھایا اور چل پڑے۔

بہاولپور پہنچے تو اچھی خاصی شام ہو گئی۔ اس سے آگے رات کا سفر خطرے سے خالی نہ تھا۔ انہوں نے بہاولپور کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ رات گزری اور علی الصبح پھر روانہ ہو گئے۔

○

گاڑی سندھ کے وسط تک پہنچی تو دور دور تک کسی اور گاڑی کا نام و نشان نہیں ملتا تھا۔ کوئی اِکا دُکا ٹریکٹر ٹرالی نظر آتی تھی جو گرد اُڑاتی قریب سے گزر جاتی تھی۔ کاروں والے کراچی سے پشاور تک شوقیہ کاروں پر سفر کیا کرتے تھے لیکن اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ سندھ ڈاکے اور اغوا کی وارداتوں کا صوبہ بن گیا تھا۔ آئے دن خبریں ملتی تھیں کہ گاڑی روک لی گئی، لُوٹی گئی یا گاڑی والوں کو اغوا کر لیا گیا۔

عثمان نے ریوالور لوڈ کر کے اپنے سامنے ڈیش بورڈ پر رکھ لیا۔ وینا نے بندوق کی دونوں نالیوں میں کارتوس ڈال لئے اور بندوق اپنے گھٹنوں کے درمیان کھڑی کر لی۔

اب گاڑی اُس علاقے میں جا رہی تھی جہاں دونوں طرف درختوں کے جنگلات تھے۔ گاڑی ایک موڑ سے مُڑی تو کم و بیش ایک سو گز دور تین آدمی سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ انہوں نے عثمان کی گاڑی کی طرف دیکھا اور تینوں ادھر منہ کر کے سڑک کے درمیان آ گئے۔

ایک آدمی کے کندھے کے ساتھ کلاشنکوف لٹک رہی تھی۔ دوسرے نے رائفل لاٹھی کی طرح ہاتھ میں لے رکھی تھی اور تیسرے کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ان تینوں

ہتھیاروں میں سے کسی ایک کی بھی نالی گاڑی کی طرف نہیں تھی۔ گاڑی اپنی رفتار پر چلی جارہی تھی۔

درمیان والے آدمی نے ہاتھ اوپر کر کے رکنے کا اشارہ کیا۔

"ہوشیار ہو جاؤ وینا!" ـــ عثمان نے وینا سے کہا ـــ "بندوق باہر نکال کر اندھا دھند فائر کر دو۔ پہلے ایک پھر دوسرا کارتوس فائر کرنا۔ پرواہ نہیں بندوق کا منہ کس طرف ہے"۔

ان کے دونوں بچے پچھلی سیٹ پر تھے۔ چھوٹا بچہ سویا ہُوا تھا اور بڑا بچہ پچھلی سیٹ پر کھڑا پیچھے دیکھ رہا تھا۔

گاڑی اور ان تین آدمیوں میں پندرہ بیس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا جب عثمان نے ریوالور باہر کر کے فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی وینا نے ایک نالی کا کارتوس فائر کیا۔ فوراً بعد دوسرا کارتوس بھی فائر کر دیا۔ تینوں آدمی اس قدر تیز دائیں اور بائیں کو بھاگے جیسے وہاں تھے ہی نہیں۔ وینا نے بڑی تیزی سے دو اور کارتوس لوڈ کر لئے۔ عثمان نے اس جگہ سے جس جگہ آدمی کھڑے تھے گزرتے ریوالور کا سلنڈر خالی کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ایکسی لیٹر پر پاؤں دبایا تو رفتار کی سوئی ایک سو تیس کلومیٹر سے بھی آگے نکل گئی اور اس رفتار پر گاڑی نے موڑ جو کاٹا تو پہیوں کی چیخوں نے سندھ کی زمین کو ہلا ڈالا۔

"اللہ کا شکر ادا کرو وینا" ـــ عثمان نے کہا ـــ "اس کی ذاتِ باری نے بال بال بچا لیا ہے"۔

وینا کے ہونٹ تو پہلے ہی ہل رہے تھے اور وہ اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی۔ اس کا تین سالہ بیٹا گولیوں کی آواز پر قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ معصوم یہی سمجھتا ہو گا کہ اس کے ماں باپ نے تفریحاً گولیاں چلائی ہیں۔



عثمان کی کوشش یہ تھی کہ شام تک کراچی پہنچ جائیں۔ وہ راستے میں کہیں رکنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے رکنا پڑا۔ وہ خود نہیں رکا تھا' اسے روکا گیا تھا۔

پچھلے پہر کے چار بج چکے تھے۔ گاڑی پھر ایک ایسے علاقے میں سے گزر رہی تھی جس کے دائیں بائیں سندھ کے مخصوص چھوٹے چھوٹے درختوں کا بڑا گھنا جنگل تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں سے کبھی کسی انسان کا گزر ہُوا ہی نہیں۔ ایک موڑ ایسا تھا کہ

گاڑی کی رفتار بہت ہی کم کرنی پڑی۔

گاڑی اس موڑ سے مُڑی ہی تھی اور ابھی رفتار میں تیزی نہیں آئی تھی کہ اچانک چار آدمی اس حالت میں سڑک پر آ گئے کہ دو نے کلاشنکوفوں کی نالیاں' دو نے رائفلوں کی نالیاں گاڑی کی طرف کر رکھی تھیں اور ہتھیاروں کے بٹ ان کے کندھوں کے ساتھ تھے۔ وہ چاروں باقاعدہ نشانہ باندھے ہوئے تھے۔

"اب کیا کریں عثمان؟" ـــ وینا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"فائر نہ کرنا وینا!" ـــ عثمان نے بڑی تیزی سے کہا ـــ "بندوق دیکھتے ہی وہ ٹریگر دبا دیں گے.... رکنا پڑے گا.... جو اللہ کرے گا"۔

اتنے میں گاڑی ان آدمیوں کے پاس پہنچ گئی۔ ان میں دو تو واضح طور پر سندھی معلوم ہوتے تھے اور دوسرے دو شکل و صورت اور لباس کے لحاظ سے سندھی نہیں تھے۔ دو آدمی کلاشنکوفوں کی نالیاں گاڑی کی طرف کئے کھڑے رہے اور دو گاڑی تک آئے۔

"گاڑی سے باہر آ جاؤ" ـــ ایک نے کہا ـــ "ریوالور اور بندوق وہیں رہنے دو"۔

"کیا بات ہے بھائی!" ـــ عثمان نے کہا ـــ "ہم پاکستانی ہیں اور دیکھو ہمارے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں"۔

"بچوں کی فکر نہ کرو" ـــ اس آدمی نے کہا ـــ "بچوں کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی' ریوالور اور بندوق ادھر مجھے دے دو"۔

وینا نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے لئے یہ صورتِ حال بڑی ہی خوفناک تھی اور زندگی میں پہلی بار وہ اس ہولناک شکنجے میں آئی تھی۔

"مت رو وینا!" ـــ میجر عثمان نے اسے ڈانٹ کر کہا ـــ "ایسی بھی بزدل نہ بنو۔ یہ کیا ہیں! میری تمہاری طرح انسان ہیں' بھیڑیئے تو نہیں" ـــ عثمان ان لوگوں سے مخاطب ہُوا اور بارعب انداز سے پوچھا ـــ "اب کہو بھائی! کیا حکم ہے"۔

"گاڑی تم ہی چلاؤ گے" ـــ ان میں سے ایک آدمی نے کہا۔ وہ بڑی صاف اُردو بول رہا تھا ـــ "دو آدمی تمہارے ساتھ ہوں گے اور گاڑی اُدھر جائے گی جدھر یہ دو آدمی کہیں گے"۔

"تم ہندو ہو" — عثمان نے قدرے حقارت سے اس آدمی سے کہا — "میں جانتا ہوں تم ہندو ہو۔ تمہارے پاس کلاشنکوفیں ہیں اور میں نہتّہ ہوں۔ اگر تم جیسے چار ہندو میری طرح نہتّے ہو کر میرے مقابلے میں آجائیں تو خدا کی قسم' دو منٹ بھی نہ لگیں اور تم چاروں سڑک پر بے ہوش پڑے ہوئے ہو.... چلو بیٹھو گاڑی میں"۔

عثمان کی اس بات پر چاروں آدمی ہنس پڑے۔ یہ طنزیہ ہنسی تھی۔ دو آدمی پچھلی سیٹ پر بچوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ انہوں نے عثمان کو بتایا کہ سڑک سے ہٹ کر کس طرف جانا ہے۔

یہ کچھ کچا کچھ پکّا اور کچھ ریتلا رستہ تھا جس پر گاڑی جا رہی تھی۔ کم و بیش دو میل دور جا کر ان آدمیوں نے گاڑی رُکوا لی۔ پہلے خود اترے پھر عثمان سے کہا کہ وہ اس عورت اور بچوں کے ساتھ اتر آئے۔ سب کو گاڑی سے اتار کر گاڑی کی چابی ایک آدمی نے لے لی۔

"فکر نہ کرنا" — چابی لینے والے آدمی نے کہا — "تمہاری گاڑی بالکل ٹھیک رہے گی اور تمہیں واپس مل جائے گی۔ تم سب ہمارے ساتھ آجاؤ"۔

"دیکھو بھائی!" — عثمان نے انہیں کہا — "میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ میں تم میں اکیلا ہوں اور میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں۔ اگر تم اپنے آپ کو جوانمرد اور دلیر مرد سمجھتے ہو تو اس عورت پر ہاتھ نہ اٹھانا اور اس کی عزت کو اپنی ماں بیٹی کی عزت جیسا سمجھنا.... اور اگر تم ہندو ہو تو پھر میں تمہیں کچھ بھی نہیں کہوں گا کیونکہ میں ہندو کی ذہنیت کو جانتا ہوں۔ ہندو سب سے پہلے عورت پر دست درازی کرتا ہے"۔

ان دونوں میں ایک شاید ہندو ہی تھا اور شاید دونوں ہندو تھے۔ ایک نے عثمان کو مکّا مارا لیکن عثمان نے اپنا بایاں بازو بڑی تیزی سے اوپر کر کے اس کا مکّہ اپنے منہ سے دور ہی روک لیا اور پوری طاقت سے اس شخص کے منہ پر مکّا مارا۔ وہ شخص پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ چند قدم پیچھے ایسا گرا کہ پہلے اس کی پیٹھ زمین پر لگی پھر اس کی دونوں ٹانگیں اٹھ گئیں۔ دوسرے آدمی نے کلاشنکوف کندھے سے لگا کر نالی عثمان کی طرف کی۔

"نہیں" — وینا دوڑ کر عثمان کے آگے جا کھڑی ہوئی اور بولی — "بزدلوں والا کام نہ کرو۔ مُکّے کے جواب میں گولی نہ چلاؤ"۔

"گن نیچے کر لو" — یہ آواز اس شخص کی تھی جو مُکّا کھا کر گرا تھا اور اب اُٹھ رہا

تھا۔ "تم واقعی مرد ہو" — مکّا کھانے والے نے اٹھ کر کہا — "لیکن اپنی یہ مردانگی ہیں تک رہنے دینا' ہم تمہیں جہاں لے جا رہے ہیں وہاں کسی کے ساتھ ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا ورنہ مارے جاؤ گے اور پھر ہم تمہیں تمہاری بیوی کی حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکیں گے.... ہمارے ساتھ چلو"۔

وہ علاقہ بڑا ڈراؤنا سا تھا جس میں عثمان' وینا اور ان کے بچوں کو لے جایا جا رہا تھا۔ درختوں کا جنگل ختم ہو گیا تھا اور ریتیلے ٹیلوں کا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ دُور دُور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ آگے دلدلی علاقہ آگیا جو تھا تو ریتلا لیکن اس میں پاؤں دھنستے نہیں تھے۔ اس علاقے سے نکلے تو کچھ دور کھجور کے درخت نظر آنے لگے۔ عثمان تو فوجی تھا' تھکن کم ہی محسوس کر رہا تھا۔ مشکل وینا کے لئے تھی جو اب قدم گھسیٹ رہی تھی۔ اگر وہ اپنے گھر کو جا رہی ہوتی یا کسی شادی کی محفل کو جا رہی ہوتی تو اتنی تھکن محسوس نہ کرتی۔ دل پر خوف سوار تھا اس لئے جسمانی توانائی جلدی جواب دے گئی تھی۔ بچوں کو عثمان اور وینا باری باری اٹھاتے تھے۔ بچے الگ پریشان تھے کہ گاڑی میں سے نکال کر انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

قدم گھسیٹتے کھجوروں کے درختوں تک پہنچے جو ذرا بلندی پر تھے۔ وہ چھوٹا سا نخلستان تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک گاؤں تھا جس میں پندرہ بیس گھر تھے۔ زیادہ تر گھر گھاس پھونس کے جھونپڑے تھے جیسے سندھ کے علاقے میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان میں گھرے ہوئے دو گھر پختہ تھے یعنی اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔

عثمان اور وینا کو اس گاؤں میں لے گئے۔ گاؤں کی گلیوں میں بچے کھیل رہے تھے۔ کچھ آدمی اِدھر اُدھر آتے جاتے نظر آتے تھے اور اس پارٹی کو رک رک کر دیکھتے تھے۔ ان کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے یہ اجنبی سے لوگ ان کے لئے کوئی نئے اور انوکھے نہیں' ورنہ دیہات میں اور وہ بھی اتنے پسماندہ دیہات میں' دو آدمی کلاشنکوفیں اٹھا کر اور اپنے ساتھ ایک شہری مرد اور ایک عورت کو لے جا رہے ہوں تو گاؤں والے یوں رک کر دیکھتے ہیں جیسے یہ کوئی آسمانی مخلوق ہو۔ اس گاؤں کے لوگوں کے اس انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے یہاں شہر کے لوگ آتے جاتے رہتے ہوں۔

میجر عثمان اور وینا کو ایک پختہ مکان میں لے گئے اور ایک کمرے میں چارپائیوں پر

بٹھادیا۔ یہ کمرہ کسی دیہاتی کا معلوم نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس میں جو دو پلنگ بچھے ہوئے تھے وہ خاصے جدید اور قیمتی تھے اور ان پر بڑے بڑے نفیس پلنگ پوش پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف بڑی اچھی میز تھی۔ تین چار اچھی قسم کی کرسیاں تھیں اور درمیان میں ایک اچھی قسم کی لمبی تپائی رکھی ہوئی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے بھئی؟" ___ ایک آدمی نے عثمان سے پوچھا۔

"عثمان!" ___ عثمان نے جواب دیا ___ "میجر عثمان .... میں پاکستان آرمی کا میجر ہوں اور یہ میری بیوی واجدہ ہے .... یہ سوچ لو کہ آرمی کو پتہ چل گیا کہ ایک میجر کو اس کے بیوی بچوں سمیت اغوا کر لیا گیا ہے تو تمہارا کوئی گاؤں سلامت نہیں رہے گا"۔

"تم بے وقوف ہو میجر صاحب!" ___ ایک آدمی نے جواب دیا ___ "یہاں پاکستان آرمی کا وہی حال ہو گا جو مشرقی پاکستان میں ہوا تھا"۔

"کیسی باتیں کرتے ہو میجر صاحب!" ___ دوسرا آدمی بولا ___ "پاکستان آرمی کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ آرمی وہی کرے گی جو اسے حکومت سے حکم ملے گا اور تم جانتے ہو کہ تمہاری حکومت کیسی ہے۔ مشرقی پاکستان میں تمہاری حکومتوں نے ہی پاکستان آرمی کو ذلیل کروایا تھا"۔

"میجر صاحب!" ___ پہلے آدمی نے کہا ___ "اپنی بات کرو۔ یہاں آرمی کو اور سیاست کو بھول جاؤ"۔

"پھر یہ بتا دو کہ ہمیں یہاں کیوں لائے ہو" ___ میجر عثمان نے پوچھا۔

"یہ فیصلہ ہمارا سائیں کرے گا" ___ عثمان کو جواب ملا ___ "وہ اس وقت یہاں نہیں۔ شاید رات کو آ جائے۔ میں تمہیں یہ بتا سکتا ہوں کہ تمہارا تاوان وصول کیا جائے گا"۔

"یہ بھی ضروری نہیں" ___ دوسرے آدمی نے کہا ___ "چونکہ تم میجر ہو اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ سائیں تمہاری حکومت سے کوئی مطالبہ کرے، مثلاً" یہ کہ ہمارے فلاں فلاں آدمی جو تم نے جیل میں رکھے ہوئے ہیں انہیں رہا کر دو"۔

"جو کچھ بھی کرو، کر سکتے ہو" ___ میجر عثمان نے کہا ___ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری بیوی کو پریشان نہ کیا جائے"۔

"میجر صاحب!" ___ ایک آدمی نے کہا ___ "اگر ہم اتنے ظالم اور بد اخلاق ہوتے تو

جس طرح تم نے مجھے مکا مارا تھا، میں تمہیں کبھی معاف نہ کرتا اور وہیں تمہیں یا تمہارے ایک بچے کو گولی مار دیتا .... باقی باتیں ہمارے سائیں سے کر لینا۔ ہم تمہارے کھانے کا بندوبست کرتے ہیں"۔

تھوڑی ہی دیر بعد عثمان اور ویتا کے آگے کھانا رکھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر عثمان کو کچھ حیرت سی ہوئی کہ اس کھانے میں گوشت تھا، سبزی الگ اور دال الگ تھی اور تازی پکی ہوئی روٹیاں تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس مکان میں رہنے والا شخص جسے یہ لوگ سائیں کہتے تھے، کوئی صاحب حیثیت آدمی ہے ورنہ اتنے دور افتادہ صحرائی گاؤں میں اتنا اچھا کھانا کوئی خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ عثمان کا چھوٹا بچہ تو ابھی ماں کا دودھ پیتا تھا، بڑے بچے کے لئے گلاس میں دودھ آ گیا۔

کھانا کھاتے ہوئے عثمان ویتا کو تسلی دلاسہ دیتا رہا اور اسے بتاتا رہا کہ یہ لوگ تاوان مانگیں گے۔ اگر بے تحاشا مانگا تو میرے گھر سے انہیں مل جائے گا۔



سورج غروب ہو جانے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی اس کمرے میں داخل ہوا جس میں عثمان اور ویتا کو بٹھایا گیا تھا۔ چھوٹا بچہ جو ابھی دودھ پینے کی عمر میں تھا، کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا لیکن بڑا بچہ محسوس کر رہا تھا کہ انہیں کسی غلط جگہ لے آئے ہیں، وہ بار بار کہتا تھا، امی گھر چلو۔ یہ ایک اور پریشانی تھی۔ بچے کو سمجھایا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ یہاں آئے نہیں بلکہ لائے گئے ہیں اور اب گھر جانا انہی لوگوں کے اختیار میں ہے۔

یہ شخص جو کمرے میں داخل ہوا تھا، تقریباً" پچاس کی عمر کا آدمی تھا۔ اس کے سر پر سندھی ٹوپی اور کندھوں پر پھولدار چادر تھی اور اس کا باقی لباس بھی سندھی تھا اور چال ڈھال اور بولنے کے انداز سے بارعب اور معزز آدمی لگتا تھا۔ اس نے عثمان کے ساتھ ہاتھ ملایا اور بیٹھ گیا۔

"میرا نام خدا بخش ہے" ___ اس نے عثمان سے اپنا تعارف کروایا اور بولا ___ "تم نے شاید میرا نام کبھی سنا ہو گا"۔

"میں نے آپ کا نام کبھی نہیں سنا" ___ عثمان نے اسے آگے نہ بولنے دیا اور کہنے لگا ___ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہمیں کیوں پکڑ لیا گیا ہے۔ آپ مسلمان ہیں اور

میں آپ کو اپنا باپ سمجھتا ہوں۔ ہمارے متعلق آپ نے جو فیصلہ کرنا ہے وہ ذرا جلدی کر دیں"۔

"جلدی کر دیں گے سائیں!" —— خدا بخش نے کہا —— "جلدی کر دیں گے کیوں گھبراتے ہو' اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے ہو"۔

یہ وہی خُدا بخش تھا جس کے متعلق لُوسی کو راما راؤ نے بتایا تھا کہ ان کے گروہ کا کر دھرتا ایک سندھی ہے جس کا نام خدا بخش ہے۔ خدا بخش کوئی وڈیرا تو نہیں تھا نہ ہ وڈیرے اس طرح میدان میں آتے ہیں۔ یہ شخص مجرمانہ ذہنیت رکھتا تھا اور یہی اس ک طاقت تھی۔ سندھ کی سرحد کے ساتھ ساتھ دونوں طرف کے ڈاکو اور سمگلر اس کے مر تھے اور دوست بھی تھے۔ وہ جسے چاہتا قتل کروا سکتا تھا' اس کے گھر میں ڈاکہ ڈلوا سکتا اور اغوا بھی کرا سکتا تھا۔ اس کی اس طاقت سے وڈیرے بھی ڈرتے تھے لیکن وہ ایسا وقوف نہیں تھا کہ کسی وڈیرے کی دشمنی مول لے لیتا۔ وڈیروں کے ساتھ اس کی یاری تھی اور جب سے سندھ میں علیحدگی پسندوں نے اپنی بے تاج بادشاہی قائم کر تھی' خدا بخش اس محاذ میں شامل ہو گیا تھا۔

"اب اس طرح ہو گا میجر عثمان!" —— خدا بخش نے کہا —— "تم الگ کمرے م رہو گے اور تمہاری بیوی اور دونوں بچوں کو الگ کمرے میں رکھا جائے گا"۔

"یہ کیوں؟" —— میجر عثمان نے پوچھا اور کہنے لگا —— "میرے بیوی بچوں کو میر ساتھ رہنے دیں ورنہ یہ الگ روتی رہے گی اور میں الگ پریشان رہوں گا.... دیکھا جا تو میری اور آپ کی کوئی ذاتی دشمنی تو نہیں"۔

"نہیں عثمان!" —— خدا بخش نے کہا —— "میں تمہاری اصل پریشانی سمجھتا ہوں تمہیں یہ ڈر ہے کہ تمہاری بیوی کو الگ رکھا گیا تو اس کی عزت پر کوئی ہاتھ ڈالے گ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو گا۔ تمہاری عزت کو میں اپنی عزت سمجھو گا۔ تم نے ٹھیک کہا ہے کہ میری اور تمہاری کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ تمہاری بیوی ک طرح کی میری ایک بیٹی جوان ہے اور ایک بیوی بھی اتنی ہی جوان ہے' دوسری ذ بوڑھی ہو گئی ہے۔ تم اگر مجھ پر یہ شک کرو گے کہ میرے گھر میں تمہاری بیوی کی عز پر کوئی ہاتھ ڈالے گا تو میں کہوں گا کہ تم نے مجھے بڑی گندی گالی دی ہے"۔

خُدا بخش کی اس بات سے عثمان کے دل سے کم از کم ایک بوجھ تو اتر گیا لیکن اصل

پریشانی ابھی موجود تھی۔ ایک سوال تھا جو اس کے ذہن اور دل کو بچھو کی طرح ڈنک مار رہا تھا کہ انہیں کب تک قید میں رکھا جائے گا۔

"سائیں! ایک بات پوچھتا ہوں" —— عثمان نے کہا —— "آپ مسلمان ہیں۔ پاکستانی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ سندھ میں وہی حالات پیدا ہو گئے ہیں...."

"نہ.... نہ.... نہ عثمان!" —— خدا بخش نے میجر عثمان کی بات کاٹتے ہوئے کہا —— "ادھر سیاست کی بات مت کرو۔ یہ بات پاکستان اور ہندوستان کی ہے' اور پھر یہ بات اپنے لیڈروں کے ساتھ کرو۔ میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ بنگالیوں کو تمہارے لیڈروں نے چُوہڑہ چمار سمجھ لیا تھا۔ تم نے اس کا نتیجہ دیکھ لیا ہے لیکن تمہارے لیڈروں نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ وہ اب سندھیوں کو وہی کچھ سمجھتے ہیں جو بنگالیوں کو سمجھتے تھے۔ ادھر مشرقی پاکستان میں ہندوستان نے موقع دیکھا تو اپنی فوج بھیج دی۔ اب تمہارے لیڈروں نے سندھ میں وہی حالات پیدا کر دیئے ہیں تو ہندوستان نے اِدھر بھی آدمی بھیج دیئے ہیں"۔

"لیکن سائیں!" —— عثمان نے کہا —— "آپ تو مسلمان ہیں...."

"میں گناہگار آدمی ہوں بھائی!" —— خدا بخش نے اسے آگے بولنے نہ دیا اور کہا —— "چھوڑو ان باتوں کو"۔

"پھر یہی بتا دیں" —— عثمان نے پوچھا —— "ہمارا کیا بنے گا؟ کب تک قید میں رکھو گے؟"

"میں صاف بات بتا دیتا ہوں" —— خدا بخش نے جواب دیا —— "ہم نے تمہیں اور تمہاری بیوی کو اس لئے پکڑا ہے کہ تمہارے عوض رقم مانگیں گے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تم فوج کے افسر ہو۔ اب میں کراچی سے اپنے بڑوں سے حکم لوں گا کہ تمہارا کیا کیا جائے"۔

"کیا آپ لوگ فوج سے ڈرتے ہیں؟"

"ڈرتے نہیں بھائی!" —— خدا بخش نے ایسے لہجے میں کہا جس میں ہلکی سی طنز بھی تھی —— "تم ہمارے لئے بہت قیمتی ہو۔ ہو سکتا ہے ہمارے بڑے یہ فیصلہ کریں کہ تمہارا تاوان وصول نہ کیا جائے بلکہ تمہارے عوض ہمارے چار آدمی رہا کر دیئے جائیں جو کراچی جیل میں بند ہیں.... کیا تمہارا باپ امیر آدمی ہے؟ جائیداد کتنی ہے؟"

"میرا باپ غریب آدمی ہے" ـــــ عثمان نے جھوٹ بولا ـــــ "اگر اسے آپ کہ
کہ پانچ ہزار روپیہ دو اور اپنے بیٹے اور بہو کو رہا کروا لو تو اسے پانچ ہزار روپیہ قرض ا
پڑے گا"۔

رات کو بھی عثمان اور وینا کو پہلے کی طرح اچھا کھانا کھلایا گیا۔ اس کے بعد وہ صبر آ
اور جگر پاش وقت آیا جب عثمان اور وینا کو الگ کیا گیا۔ عثمان وینا کو تسلی دے رہا تھا کہ
نہیں ہو گا اور وینا رو رہی تھی۔ دونوں بے بس اور مجبور تھے۔ انہیں الگ ہونا ہی تھا
وہ الگ کر دیئے گئے۔



عثمان کو جس کمرے میں رکھا گیا اس میں اچھی قسم کی ایک چارپائی اور اس پر صا
ستھرا بستر تھا اور ایک چھوٹی میز اور کرسی بھی پڑی ہوئی تھی۔ عثمان کو اپنے آرام و سکو
کوئی غم نہ تھا۔ وہ صرف وینا کے لئے پریشان تھا۔ وہ سوچوں اور خیالوں میں الجھ گیا۔
تو اسے پاکستان کے لیڈروں اور آتی جاتی حکومتوں پر غصہ آتا جنہوں نے یہ حالات پیدا
دیئے تھے کہ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا تھا اور کبھی اس کے دل میں پاکستان کی محبت آ
اور انڈیا کی ایسی نفرت ابھرتی کہ وہ مٹھیاں بھینچ لیتا اور کمرے میں اس طرح غضب نا
طریقے سے ٹہلنے لگتا جیسے کوئی ہندوستانی اس کے سامنے آیا تو وہ اس کا گلا گھونٹ د
گا۔

اسے لُوسی یاد آئی اور پھر لُوسی کے دونوں روپ باری باری اس کے سامنے آ۔
کبھی یوں محسوس کرتا جیسے اس کی روح کی راحت اور دل کی خوشیاں لُوسی سے وا
ہیں اور کبھی یوں سوچتا کہ لُوسی نے اسے وینا سے متنفّر کر دیا ہے اور اس کی اتنی پیا
ازدواجی زندگی تباہ کر دی ہے۔

سوچوں اور خیالوں کی آندھیاں اور جھکڑ تھے جو کبھی صحرائی آندھیوں کی طرح گ
ہو جاتے اور کبھی یہ جھکڑ اتنے سرد ہو جاتے کہ عثمان کی اندر کی دنیا سکڑنے اور ٹھٹھر
لگتی۔

ادھر وینا کا حال اور زیادہ بُرا تھا۔ بچے اسے پریشان کرتے تھے' البتہ اسے کچھ سا
مل گیا۔ یہ ساتھ اس گھر کی دو عورتیں تھیں جو خاصی دیر وینا کے پاس بیٹھی رہیں اور ا
اُدھر کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ وہ دیہاتی اور اَن پڑھ عورتیں تھیں اس لئے وینا ان

ساتھ کوئی سیاسی یا عقل کی دیگر بات نہیں کر سکتی تھی۔ ان عورتوں سے اسے اتنا ہی
فائدہ پہنچا کہ وہ عثمان کی طرح سوچوں اور خیالوں میں الجھنے اور اپنے آپ کو پریشان کرنے
سے بچی رہی۔

مسلسل تین دن عثمان اپنے کمرے میں اور وینا اپنے کمرے میں بند رہی۔ انہیں
ناشتہ اور کھانا وغیرہ صاف ستھرا اور اچھا ملتا رہا۔ کمروں میں سے انہیں صرف بیت الخلاء
ک جانے کے لئے نکالتے تھے۔ وینا کو عثمان کا اور عثمان کو وینا کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ
س حال میں ہے۔

ایک روز اجنبی سے دو تین آدمی جو کوئی شریف آدمی نہیں لگتے تھے عثمان کے پاس
ئے تھے۔ وہ سندھی نوجوان تھے اور پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے لیکن چھچھورے اور
چھے سے تھے۔ عثمان کے ساتھ وہ فضول سی باتیں کرتے رہے تھے۔ ان کی باتوں میں
اق اُڑانے کا رنگ زیادہ تھا۔ انہوں نے پاکستان کا مذاق زیادہ اُڑایا تھا۔ عثمان ان کی باتیں
ن کر جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ پاکستانی ہے اور پاکستان کے
تھ بہت ہی پیار ہے اور وہ پاکستان کے نام پر مر مٹے گا۔



ایک دو دن اور گزر گئے۔ پچھلے پہر کے تین بج رہے تھے جب عثمان کے کمرے کا
وازہ کھلا اور ایک آدمی اندر آیا۔ اس آدمی کو وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ کوئی شہری آدمی
جس نے پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک جوان لڑکی کمرے
آئی۔ عثمان نے اسے دیکھا تو اس نے اپنے جسم میں ایسا جھٹکا محسوس کیا جیسے بجلی کے
تار اس کے جسم کے ساتھ لگا دیئے گئے ہوں۔

وہ لڑکی لُوسی تھی۔

عثمان کو دیکھ کر لُوسی کا ردِّ عمل بھی ویسا ہی تھا جیسا عثمان کا تھا۔ لُوسی کا تو رنگ ہی پیلا
یا۔ عثمان کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ پہلے تو اس نے یہ ارادہ کیا کہ اس لڑکی کا گلا گھونٹ
ے لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ لُوسی یہاں کس طرح آئی
ہے اور یہ کیا گورکھ دھندہ ہے۔

"تم یہاں کیسے؟" ـــــ عثمان نے سکوت توڑا۔

"یہ بھی بتا دوں گی" ـــــ لُوسی نے دبی دبی سی آواز میں جواب دیا ـــــ "پہلے میں

تمہیں یہاں سے رہا کراؤں گی۔ اس وقت تک مجھ سے کچھ نہ پوچھنا"۔

عثمان خاموش ہو گیا اور لوسی اس آدمی کے ساتھ باہر نکل گئی جس کے ساتھ کر[ے] میں آئی تھی۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ سوچ سوچ کر عثمان کو چکر آنے لگے۔ لُوسی کا اس جگہ آنا ایک [ا]یسا معمہ تھا جس کا حل عثمان کو نہیں مل رہا تھا البتہ لُوسی کے متعلق میجر سمیع اور کیپٹن احمد نے اسے جو باتیں بتائی تھیں اور جنہیں وہ تسلیم نہیں کرتا تھا وہ صحیح معلوم ہونے لگیں۔ کمرے کا دروازہ ایک بار پھر کھُلا۔ لُوسی اور اس کا ساتھی جو راما راؤ تھا کمرے میں داخل ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے وینا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کمرے میں آئی۔

"اب تم دونوں اکٹھے رہو گے" ــــ لوسی نے عثمان سے کہا۔

"یہ سب کیا ہے لُوسی؟" ــــ عثمان نے مضطرب لہجے میں پوچھا ــــ "کیا تم نے اپنے اغوا کا انتقام اس طرح لیا ہے کہ مجھے میرے بیوی بچوں کے ساتھ اغوا کرایا ہے۔ میرا شک ہے کہ تم نے وینا سے انتقام لیا ہے کیونکہ تمہیں اس کے بھائیوں نے اغوا کرایا تھا"۔

"نہیں عثمان!" ــــ لُوسی نے کہا ــــ "اس وہم میں مت پڑو۔ میں تمہیں یہاں سے نکلوا دوں گی اور پھر تفصیل سے بتاؤں گی کہ تمہیں یہاں کس طرح لایا گیا ہے۔ ابھی میں اتنا ہی بتاتی ہوں کہ یہ اغوا کی انہی وارداتوں میں سے ایک واردات ہے جن کی خبریں دوسرے تیسرے روز اخباروں میں پڑھتے رہتے ہو۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ تم ان لوگوں کے ہاتھ لگ گئے۔ تمہاری جگہ کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔ اسے انتقامی کارروائی نہ سمجھو میں کراچی جا رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ آج کی رات اور ہو سکتا ہے کل کا دن یہاں رہو۔ تمہاری گاڑی تمہیں واپس مل جائے گی۔ ریوالور اور بندوق بھی مل جائے گی اور تم بڑے آرام سے کراچی پہنچ جاؤ گے، یہاں مجھ سے کوئی فالتو بات پوچھنا نہ کہنا"۔

لُوسی راما راؤ کے ساتھ کمرے سے نکل گئی اور کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

"یہ کون ہے؟" ــــ وینا نے عثمان سے پوچھا۔

"یہ وہی ہے" ــــ عثمان نے کہا ــــ "اور مجھے امید ہے یہ ہمیں چھڑوا لے گی"۔

"یہ یہاں کیسے پہنچی؟" ــــ وینا نے پوچھا۔

"میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ یہاں پہنچ گئی ہے" ــــ عثمان نے کہا۔

"اس لئے کہ یہ ہمیں رہا کرا دے گی؟" ــــ وینا نے پوچھا۔

"ہاں" ــــ عثمان نے جواب دیا ــــ "اللہ کا شکر ادا کرنے کی یہ ایک وجہ ہے کہ یہ ہمیں شاید چھڑوائے گی لیکن دوسری وجہ یہ ہے کہ مجھے اس کے متعلق جو کچھ بھی بتایا جاتا رہا ہے، میں اسے غلط سمجھتا رہا ہوں۔ آج اسے یہاں دیکھ کر سب شکوک اور میری خوش فہمیاں دور ہو گئی ہیں۔ اب اس سے پوچھنے کی یا کسی سے کچھ اور معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کا یہاں آنا اور کہنا کہ یہ ہمیں رہا کرا لے گی، واضح طور پر بتاتا ہے کہ اس کی اصلیت کیا ہے"۔

"مجھے تو اب بھی شک ہے عثمان!" ــــ وینا نے کہا ــــ "کہ ہمیں اسی نے اغوا کرایا ہے اور یہ اس کی انتقامی کارروائی ہے"۔

"ہو سکتا ہے" ــــ عثمان نے کہا ــــ "لیکن میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس نے ہمیں رہا کرانے کی جو بات کہی ہے وہ غلط معلوم نہیں ہوتی۔ میں اس کا انداز جانتا ہوں"۔

لُوسی کا وہاں پہنچنا محض اتفاقی امر تھا۔ اس نے راما راؤ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اندرون سندھ کی سیر کرنا چاہتی ہے۔ راما راؤ نے خدا بخش سے پوچھا تھا تو خدا بخش نے کہا تھا کہ اسے راما راؤ لے آئے۔ راما راؤ اسے لے گیا اور یہ دونوں سیدھے خدا بخش کے گھر پہنچے تھے۔ خدا بخش نے اپنا ایک آدمی ان کے ساتھ کر دیا تھا اور ان دونوں نے کچھ دیہاتی علاقہ گھوم پھر کر دیکھنا تھا۔

یہ دونوں جب خدا بخش کے ہاں پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ ایک پنجابی فیملی کو گاڑی سمیت اغوا کیا گیا ہے۔ لُوسی نے تفریح کے موڈ میں کہا کہ وہ اس فیملی کو دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اغوا ہونے والے اس کی جان پہچان کے افراد ہیں۔ جان پہچان بھی ایسی کہ عثمان اس کا عاشقِ زار تھا۔

جس وقت عثمان اور وینا اس وہم اور وسوسوں میں اُلجھے ہوئے تھے کہ انہیں لوسی نے انتقاماً اغوا کرایا ہے اُس وقت لُوسی اور راما راؤ خدا بخش کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے دو تین آدمیوں کو دوڑا دیا تھا کہ جہاں جہاں اس کے جانے کا امکان ہے وہاں اسے دیکھیں۔

وینا کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ قرآن کی آیات کا ورد کر رہی تھی اور اللہ سے مانگ رہی تھی۔ اس نے عبادت اور دعا کا سلسلہ تھوڑے ہی عرصے سے شروع کیا تھا۔ اللہ سے صرف یہ دعا مانگتی تھی کہ اسے اس کا خاوند واپس مل جائے۔ اب اس قید میں بھی اس کی زبان پر اور اس کے دل میں اللہ ہی کا نام تھا۔ اگر وہ عثمان کی طرح مرد ہوتی تو اس کا یہ حال نہ ہوتا۔ اس قید میں جہاں کوئی قانون نہیں تھا اور اگر کوئی قانون تھا تو وہ خدا بخش جیسے مجرمانہ ذہن کے آدمیوں کے ہاتھ میں تھا، وہاں وینا کی سب سے بڑی بدنصیبی تھی کہ وہ جواں سال لڑکی تھی اور خوبصورت تھی۔ وہ اپنی جان دے سکتی تھی، آبرو نہیں۔

"وینا!" — عثمان نے کہا — "تمہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں آج اللہ کے حضور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں اور گناہوں کی بخشش بھی مانگتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ خدا اُس وقت توبہ قبول نہیں کیا کرتا جب گناہوں کی سزا شروع ہو جاتی ہے لیکن یہاں صورت کچھ اور ہے۔ میں اپنے گناہوں کا کفّارہ ادا کروں گا"۔

وینا نے عثمان کے منہ کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتی رہی۔ عثمان کا چہرہ اس کے آنسوؤں میں جھلملانے لگا۔ وینا جو چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی، یکلخت اٹھی اور عثمان کے سامنے دو زانو ہو گئی۔ سر اس کی گود میں پھینکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ روئی کہ اس کا بڑا بچہ اسے دیکھ کر رونے لگا۔ اگر بچہ نہ روتا تو وینا عثمان سے اتنی جلدی الگ نہ ہوتی۔ اس نے عثمان کی گود سے سر اٹھایا اور پھر لپک کر بچے کو اٹھایا اور اسے گلے لگا لیا۔

عثمان نے بچے کی طرف بازو پھیلائے۔ وینا نے بچے کو اس کی گود میں بٹھا دیا۔ عثمان نے اپنے دونوں بازو بچے کے گرد لپیٹ دیئے۔ اس کے ساتھ ہی عثمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے یہ بچہ اس سے چھین لیا گیا تھا اور بڑے عرصے بعد اسے واپس ملا ہو۔

عثمان اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے پاس آ گیا تھا۔

"عثمان!" — وینا نے دوپٹے سے آنسو پونچھ کر کہا — "اس لڑکی نے اگر ہمیں رہا کرا دیا تو تم پھر اس کے قبضے میں آ جاؤ گے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ اتنی حسین لڑکی تمہاری

کمزوری بن گئی ہو؟"

"میں ایسا احمق تو نہیں" — عثمان نے کہا — "یہ لڑکی ہمیں بلا مقصد رہا نہیں کرائے گی۔ رہا کرا کے اپنا کوئی نہ کوئی مطالبہ کرے گی۔ یہ مجھے اپنا شکار سمجھتی ہے لیکن میں اب اسے اپنا شکار سمجھتا ہوں۔ تم مطمئن رہو۔ مجھ سے تو اللہ ناراض ہو گا، تم اللہ سے خیر مانگتی رہو"۔



رات کا پہلا پہر تھا جب خدا بخش آ گیا۔ لُوسی اور راما راؤ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے انہیں بتایا کہ وہ کسی کام سے ذرا دور چلا گیا تھا اس لئے ان کے استقبال کے لئے گھر میں ہی نہ رُک سکا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

"آج ہم نے ایک شکار مارا ہے" — خدا بخش نے خوشخبری سنانے کے انداز میں انہیں بتایا — "پتہ چلا کہ یہ شکار تو بہت ہی قیمتی ہے۔ یہ آدمی فوج میں میجر ہے۔ دوسری بات یہ کہ لڑکی بڑی خوبصورت ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ ان کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کے عوض ہم جو کچھ بھی مانگیں گے وہ حکومت کی طرف سے مل جائے گا۔ تم لوگ بھی مجھے مشورہ دو۔ ہم نے اپنے چار آدمی جیل سے رہا کرانے ہیں۔ اگر ان کے خلاف مقدمہ شروع ہو گیا تو چودہ چودہ سال سے کم سزا نہیں ملے گی"۔

"ہمارا مشورہ کچھ اور ہے" — لُوسی نے کہا — "ہم ان قیدیوں کو دیکھ چکے ہیں۔ اس میجر کو میں اچھی طرح جانتی ہوں اور یہ میرا آدمی ہے۔ آپ اس کے عوض صرف چار آدمی چھڑوانا چاہتے ہیں لیکن میں اس کے عوض پورا پاکستان لے لوں گی، آپ اسے فوراً چھوڑ دیں"۔

لُوسی اور راما راؤ نے خدا بخش کو تفصیل سے بتایا کہ اس آدمی کو لُوسی نے کس طرح اپنے جال میں لے رکھا تھا لیکن درمیان میں ایک واقعہ ہو گیا جس کے نتیجہ میں لُوسی اور عثمان الگ ہو گئے۔ اب عثمان کو پھر یہاں دیکھ کر لُوسی بہت خوش ہے کہ اس کی محنت ضائع نہیں گئی اور یہ آدمی پھر اس کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔

"یہ میجر لاہور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں ہوتا ہے" — لُوسی نے کہا اور تھوڑا سا جھوٹ بھی بولا — "میں اس سے بڑے بڑے قیمتی راز لے چکی ہوں اور آگے چل کر اور زیادہ قیمتی راز حاصل ہوں گے۔ ان میں بعض راز کی باتیں ایسی ہیں جن کا تعلق سندھ کے ساتھ

ہے۔ میں آپ کو یہ ساری باتیں بتا نہیں سکتی۔ آپ یہ کرم کریں کہ انہیں چھوڑ دیں۔ آگے میرا کام ہے کہ میں انہیں کراچی کس طرح پہنچاتی ہوں۔ مجھے ایک فائدہ اور مل رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس کی بیوی میری دشمن بنی ہوئی تھی۔ اب وہ بھی میری احسان مند ہوگی اور میں اسے بھی اپنی لائن پر چلا لوں گی"۔

خدا بخش لُوسی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اسے سوائے لُوسی کے اور کسی چیز کے ساتھ دلچسپی نہیں۔ لُوسی کے لئے وہ اگر پورا پاکستان نہیں تو سندھ کا صوبہ دینے کو تیار تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ راما راؤ اور لُوسی کس حیثیت کے لوگ ہیں اور اگر ان کے ساتھ بگڑ گئی تو اس کا کیا حشر ہو گا۔ عثمان اور وینا کو چھوڑ دینا اس کے اختیار میں تھا۔ ان کا اغوا اس کا ذاتی فعل تھا۔ لُوسی اور راما راؤ کی بات نہ ماننے کا مطلب یہ تھا کہ اس نے انڈیا کو ناراض کر دیا ہے۔ وہ انڈیا کی ناراضگی بلکہ انڈیا کی انٹیلی جنس کی ناراضگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ اَن پڑھ آدمی تھا۔ اس کا اثر و رسوخ اور رعب داب ایک خاص علاقے اور خاص ماحول میں چلتا تھا۔

"اگر یہ لوگ تمہارے کام کے ہیں تو میں انہیں کیسے روک سکتا ہوں" ـــ خدا بخش نے کہا ـــ "لے جائیں انہیں۔ یہ خیال رکھنا کہ آپ نے میرے ہاتھ سے بڑا موٹا شکار لے لیا ہے"۔

"ہم آپ کو اس سے بڑا شکار دے دیں گے" ـــ راما راؤ نے کہا۔



لُوسی نے رات کو ہی عثمان اور وینا کو یہ خوشخبری سنا دی کہ انہیں صبح چھوڑ دیا جائے گا۔

"تم جا کہاں رہے تھے؟" ـــ لُوسی نے عثمان سے پوچھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ایک بازو وینا کے گلے میں ڈال کر اس کا گال چوم لیا۔

"یہ تو اکیلے ریل گاڑی پر یا بائی ایئر کراچی جا رہے تھے" ـــ وینا نے کہا ـــ "میری ضد پر انہوں نے دس دنوں کی چھٹی لے لی اور مجھے بھی کراچی سیر کرانے کے لئے اپنی گاڑی پر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ میں تو اس گھڑی کو کوستی ہوں جب میں نے ضد کی اور انہوں نے میری بات مان لی تھی"۔

"آدھی چھٹی تو یہاں گزر گئی ہے" ـــ عثمان بولا ـــ "پانچ دن باقی رہ گئے ہیں۔ یہیں سے واپس چلے جائیں گے"۔

"واپس کیوں چلے جائیں گے؟" ـــ راما راؤ نے کہا ـــ "کراچی چلیں، ہمارے ساتھ ٹھہریں"۔

"ہاں عثمان!" ـــ لُوسی نے کہا ـــ "یہیں سے واپس نہ جانا۔ وینا کو مایوسی ہو گی۔ اسے کراچی کی سیر کرا لاؤ"۔

"بہتر یہی ہے" ـــ عثمان نے کہا ـــ "پہلے بھی ہوٹل میں ٹھہرنے کا ارادہ تھا، اب بھی ہوٹل میں ہی ٹھہریں گے اور میں کوشش کروں گا کہ وہاں سے اپنے بریگیڈ کمانڈر کو فون کر کے چھٹی میں دو تین دنوں کا اضافہ کرا لوں .... لیکن میں واپس گاڑی پر تو نہیں جاؤں گا"۔

"پھر کیسے آئیں گے؟" ـــ وینا نے پوچھا۔

"بائی ایئر آئیں گے" ـــ عثمان نے جواب دیا ـــ "بائی ایئر آئیں گے اور گاڑی ریل گاڑی سے بُک کرا دیں گے"۔

اگلی صبح سورج کی کرنیں ابھی زرد ہی تھیں جب دو کاریں کراچی کی طرف جا رہی تھیں۔ اگلی کار راما راؤ چلا رہا تھا اور لُوسی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ پچھلی کار عثمان کی تھی جو اسے صحیح و سلامت واپس مل گئی تھی۔ بندوق بھی مل گئی اور ریوالور بھی مل گیا تھا۔

"یہ شکار ہاتھ سے جانا نہیں چاہئے" ـــ لُوسی راما راؤ سے کہہ رہی تھی ـــ "صاف پتہ چلتا ہے کہ میں نے اس شخص سے کوئی بہت ہی بڑا کام لینا ہے۔ اسے تو میں ذہن سے اتار رہی تھی لیکن کس طرح غیر متوقع طور پر یہ پھر میرے جال میں آ گیا"۔

"وینا!" ـــ عثمان کہہ رہا تھا ـــ "لُوسی کے ساتھ میری ایسی باتیں ہوں گی جو تمہیں پھر پہلے جیسے شک میں ڈال دیں گی لیکن دل مضبوط رکھنا۔ میں اس کا زر خرید غلام بن جاؤں گا اور تم میری تائید کرنا جیسے تم مجھے اسی حالت میں دیکھ کر خوش ہو۔ یہ دونوں سمجھتے ہیں کہ انہوں نے مجھے پھر اپنے جال میں پھانس لیا ہے لیکن انہیں معلوم نہیں کہ اب یہ میرے جال میں آئے ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے شاید یہ نیکی میرے کھاتے میں لکھ دی ہے۔ تم دیکھتی رہنا میں بے وقوف بن کر انہیں کس طرح بے وقوف بناتا ہوں"۔

"ذرا سنبھل کر عثمان!" ـــ وینا نے التجا کے لہجے میں کہا ـــ "مجھ پر تو خوف طاری

ہو گیا ہے۔ یہ لوگ تو کسی بھی حد تک پہنچ سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو بچا کر رکھنا"۔

"اور خیال رکھنا راما!" ___ لوسی راما راؤ سے کہہ رہی تھی ___ "میں جب [عثمان] کے ساتھ باتیں کر رہی ہوں گی تو تم چپ ہی رہنا کیونکہ اس شخص کو میں ہی سمجھ [سکتی] ہوں"۔

"تم چپ ہی رہنا وینا!" ___ عثمان وینا سے کہہ رہا تھا ___ "ہو سکتا ہے کوئی ایسی بات ہو جائے جو تمہیں بہت ہی بُری لگے۔ دل پر پتھر رکھ لینا"۔

دونوں کاریں کراچی کی طرف دوڑی جا رہی تھیں۔ شام چار بجے کے درمیان [یہ] لوگ کراچی پہنچ گئے۔ عثمان نے درمیانہ درجے کے ایک اچھے ہوٹل کا انتخاب کیا اور ایک کمرہ لے لیا۔

"اچھا عثمان!" ___ لُوسی نے کہا ___ "ہم چلتے ہیں، کل صبح دس بجے تک آ [جائیں] گے"۔

لُوسی نے وینا کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اُس کا گال چُوم کر بولی ___ "تم سے مل کر تو مجھے بہت ہی خوشی ہوئی ہے"۔

لُوسی اور عثمان نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ دونوں کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آیا اور لُوسی راما راؤ کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

رات تاریک تھی۔

پاکستان اور بھارت کی سرحد کی فضا خاموش تھی۔ ستارے کچھ زیادہ ہی روشن لگتے تھے۔ ٹمٹماتے ہوئے یہ ستارے تاریکی کے پردے چاک کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

سرحد کوئی ایسی دیوار نہیں تھی جو دن کو نظر آتی یا اندھیرے میں نظر نہ آتی تو کوئی اس سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ جاتا کہ یہ تو دیوار ہے۔ سرحد ایک لکیر ہوتی ہے جو صرف نقشے پر نظر آتی ہے لیکن دو ملکوں کے درمیان اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ لکیر دلوں میں کھنچی ہوئی ہوتی ہے اور یہ صرف اُنہیں نظر آتی ہے جو اپنے ملک کی سرحد کی حُرمت اور عظمت کو پہچانتے ہیں اور یہ لکیر تاریکی میں بھی وطن کے اُن سرفروشوں اور جانبازوں کو نظر آ جاتی ہے جو سرحد کی لکیر کو اپنی کنواری بہن کی مانگ سمجھتے ہیں۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان جو نظر نہ آنے والی ٹیڑھی میڑھی لکیر کھنچی ہوئی ہے وہ اپنے اندر لہو کے دریا جذب کر چکی ہے۔ سرحد وطن کی قربان گاہ ہے جس پر ماؤں نے اپنے سجیلے بیٹے، بہنوں نے اپنے گبھرو بھائی اور سہاگنوں نے اپنے سہاگ قربان کر دیئے ہیں۔ وطن سے محبت کرنے والے جانتے ہیں کہ سرحد خون مانگتی ہے اور اگر اس کا مطالبہ پورا نہ کیا جائے تو پورے وطن کی آبروریزی ہو جاتی ہے۔

پاکستان کی سرحد پر 1947ء میں لاکھوں مسلمانوں، ان کی مستورات اور ان کے بچوں کا خون بہہ گیا تھا۔ اس سرحد نے لاکھوں بچوں کی قربانی لی تھی، پھر پاکستان کے جیالے جوان اس خون کا خراج اپنے خون سے دیتے رہے۔

پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ جو ہری بھری کھیتیاں ہیں اور جو بنجر زمین ہے وہاں کہیں بھی کھدائی کریں تو اس میں سے ہڈیوں کے ڈھانچے برآمد ہوں گے۔ یہ مردوں' عورتوں اور بچوں کی ہڈیاں ہیں جو سرحد پار سے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر پاکستان میں آئے تھے۔ وہ صرف سرحد تک پہنچ سکے اور ایسے گرے کہ اُٹھ نہ سکے' پھر انہیں سرحد کے ساتھ ہی گڑھے کھود کر دفن کر دیا گیا۔ وہ بے کفن دفن ہوئے تھے۔

بھارت کے بڑے ہی شدید اور طاقتور حملوں کو سہہ کر پاکستان ابھی تک جو زندہ ہے تو وہ پاکستان کے نام پر قربان ہونے والے انہی شہیدوں کی ہڈیوں کے صدقے زندہ ہے۔ ایک بزرگ نے سچ کہا تھا کہ پاکستان کا تحفظ شہید کر رہے ہیں۔

واہگہ کے قریب پاکستان کے دو کھیت ہیں۔ اگر ان دونوں کھیتوں کو کھودا جائے تو کم و بیش ہڈیوں کے اڑھائی سو ڈھانچے پہلو بہ پہلو پڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ مہاجرین کے ایک قافلے کے شہید تھے۔ اتنی زیادہ قبریں کھودنا ممکن نہ تھا۔ کالج کے لڑکوں نے لاہور شہر سے بلڈوزر منگوائے اور وسیع و عریض گڑھا کھود کر ان شہیدوں کو پہلو بہ پہلو لٹا دیا اور اوپر مٹی ڈال دی۔

آج وہاں سرسبز کھیتیاں لہرا رہی ہیں۔ شہیدوں کی ہڈیوں پر لوگوں نے دو دو تین منزلہ مکان بنا لئے ہیں .... اور ان ہڈیوں کے اوپر سے سمگلروں کی کاریں اور ٹرک گزرتے ہیں اور انہی ہڈیوں کے اوپر ملک کی عصمت و آبرو کا سودا ہوتا ہے۔



پاکستان کے نام پر شہید ہونے والوں کو پاکستانی اپنے ذہن اور دل سے کھرچ چکے تھے۔ پاکستان جوان ہو چکا تھا۔ ہمارا دشمن پاکستان کو اسی طرح دیکھ رہا تھا جس طرح بھیڑیا بھیڑ کے بچے کو دیکھتا ہے لیکن بھیڑیا جانتا تھا کہ یہ بچہ اب جوان ہو چکا ہے اور اس پر حملہ خطرے سے خالی نہیں۔ بھیڑیا جھپٹا بھی مگر اپنے دانت تڑوا کر سرحد پار جا بیٹھا اور اپنے زخم چاٹنے لگا۔ اب اس بھیڑیئے نے زمین کے نیچے جا کر اپنے پنجے پاکستان کی جڑوں میں ڈال دیئے تھے اور ان جڑوں کو کھوکھلا کر رہا تھا۔

سرحد کی وہ رات جتنی تاریک تھی اس سے کہیں زیادہ خاموش تھی۔ کسی وقت اونچی گھاس اور فصل میں بڑی زور کی سرسراہٹ اٹھتی اور خاموشی میں تحلیل

ہو جاتی۔ یہ جنگلی سور تھے جو رات کے وقت سرحد کے اِدھر اُدھر اپنی خوراک کی تلاش میں آتے جاتے ہیں' یا کہیں دور سے اُلّو کی آواز ابھرتی اور دب جاتی تھی۔

سرحد کی راتیں بڑی پراسرار اور خطرناک ہوتی ہیں۔ اُن کی خاموشی طوفان سے پہلے والی خاموشی کی مانند ہوتی ہے۔ سرحد کے رکھوالے کہتے ہیں کہ سرحد کی رات جتنی خاموش ہو اتنی ہی زیادہ پُرخطر ہوتی ہے۔ اس خاموشی میں ہلکی سی سرسراہٹ بھی سرحد کے رکھوالوں کو چوکنا کر دیتی ہے۔ اکثر ایسے بھی ہوتا ہے کہ کسی جنگلی سؤر کے پاؤں کے نیچے درخت کی خشک ٹہنی ٹوٹنے کی آواز پیدا ہو تو رینجر کا سپاہی اس طرف گولی چلا دیتا ہے۔

اُس رات پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں تین سائے سے چلے جا رہے تھے۔ وہ کچھ جھکے جھکے سے تھے اور قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔ وہ سرحد کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔

"بس پہنچ ہی گئے ہیں" ___ ان میں سے ایک کی سرگوشی ابھری ___ "تھوڑا سا ہی فاصلہ ہے"۔

"فاصلہ زیادہ ہُوا تو کیا!" ___ ایک اور سرگوشی ابھری جو کچھ زیادہ ہی پُرعزم تھی ___ "میں پہلی بار یہاں نہیں آیا۔ پہلے ایک بار اس پُل صراط سے گزر چکا ہوں۔ گھبراؤ نہیں"۔

"ہم گھبرانے والے لوگ نہیں صغیر بھائی!" ___ ان میں سے ایک نے کہا ___ "بارڈر پر ہر روز ایک جیسے حالات نہیں رہتے۔ کبھی ہم یوں گزر جاتے ہیں جیسے یہ اپنے شہر کی گلی ہو اور کبھی ایسے حالات ہو جاتے ہیں کہ قدم قدم پر موت نظر آتی ہے .... ہوشیار رہنا"۔

"وہ آئے ہوئے ہوں گے" ___ ایک اور سرگوشی ابھری۔

ان میں ایک صغیر تھا اور دو اس کے ساتھی تھے۔ دونوں ہندو تھے جو صغیر کو سرحد پار لے جا رہے تھے۔ صغیر کے ساتھ زبردستی نہیں کی جا رہی تھی بلکہ یہ اس کی شدید خواہش تھی کہ انڈیا کی سیر کرے۔ اس کے دل میں یہ خواہش مُنی نے پیدا کی تھی۔ مُنی نے اس پر اپنے حُسن و جوانی کا نشہ طاری کر رکھا تھا اور اسے خاص قسم کے ٹرانکولائزر دیئے جاتے رہے تھے۔ مُنی اور ان دوائیوں نے مل کر اس کی برین واشنگ کا عمل مکمل

کر دیا تھا۔ مکمل بھی ایسا کہ صغیر اپنی ذات کو، اپنے دین و ایمان کو اور اپنی اصلیت کو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ اس کے ذہن پر انڈیا جنّت کی صورت سا گیا تھا اور اس کے لئے وہ ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

اُس کی اصل برین واشنگ تو مُنی نے کی تھی جو اتنی زیادہ پُرکشش اور خوبصورت تھی یا نہیں، اس نے اداکاری ایسی پُرکشش کی تھی کہ صغیر اُسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔ مرد کی سب سے بڑی کمزوری کا تیکھا پنجہ صغیر کی عقل و ہوش میں اُتر گیا تھا۔ یہ وہی صغیر تھا جس کا بھائی انہی تخریب کاروں کے ایک دھماکے میں مارا گیا تھا اور صغیر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ان کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ اُس نے ایذا رسانی کے ان مرحلوں میں بھی اپنے جسم کو پتھر بنا لیا تھا جن مرحلوں میں سے کوئی زندہ نہیں نکل سکتا۔ اس کی زبان پر انکار ہی رہا اور وہ غیر انسانی اور مہلک اذیتیں برداشت کرتا رہا لیکن اسی پتھر کو ایک حسین و جمیل لڑکی نے اپنی دلکش اداکاری سے موم کر لیا اور اس موم کو اپنے سانچے میں بلکہ اپنے ملک اور اپنے دین کے ازلی دشمن کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔

وہ صغیر اب دو ہندوؤں کے ساتھ اُس دیس کو جا رہا تھا جس دیس میں گنگا بہتی ہے۔

صغیر اپنے مرے ہوئے بھائی کو ہی نہیں بلکہ اپنے مقدس وطن کو ہی دل سے اُتار چکا تھا۔



جاسوس اور سمگلر سرحد پار کرتے ہی رہتے ہیں۔ سرحد پر رینجرز بھی ہوتے ہیں اور اُس طرف بارڈر سیکورٹی فورس بھی ہوتی ہے۔ جاسوس اور سمگلر دونوں طرف کے پہریداروں کو اور سرحد کے رکھوالوں کو جل دے کر اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سرحد کے پہریدار اور بارڈر کراس کرنے والے اچانک آمنے سامنے آ گئے اور گولی چل گئی۔

صغیر اور اس کے ساتھی سرحد کے اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے گزرنا کوئی زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ انڈیا کی زمین دس بارہ قدم کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ یہ ایک برساتی نالہ تھا جو خشک پڑا تھا۔ یہ تینوں اس نالے میں اس کے اونچے کنارے کی اوٹ میں چلے جا رہے تھے۔ صغیر خالی ہاتھ تھا۔ اس کے دونوں ساتھیوں کے پاس ریوالور تھے۔ صغیر کو مصلحتاً خالی ہاتھ رکھا گیا تھا کیونکہ کسی بھی لمحے اس کے بگڑ جانے کا خطرہ موجود تھا۔

اس نالے نے انہیں سرحد پار لے جانا تھا۔ اچانک دو تین سؤر بڑے تیز دوڑتے آئے۔ وہ شاید آپس میں لڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک اونچے کنارے سے پھسل کر نیچے آ پڑا۔ نیچے یہ تینوں جا رہے تھے۔ اوپر سے دو تین اور سؤر جو شاید گرنے والے سؤر کے تعاقب میں تھے، وہ بھی نیچے کو کود آئے اور ان تینوں پر گرے۔ اندھیرا اتنا سیاہ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ایک ہندو کی چیخ نکل گئی۔ دوسرے ہندو نے اسے چُپ رہنے کو کہا لیکن بڑی بلند آواز سے کہا۔

رات کی خاموشی میں یہ آوازیں لاؤڈ سپیکر کی آوازوں جیسی بلند سنائی دیں۔ ایک ہی بار دو یا تین رائفلیں فائر ہوئیں یا کلاشنکوف کا مختصر سا برسٹ فائر ہُوا۔ یہ پاکستان کے رینجرز نے ان آوازوں پر فائر کیا تھا۔ یہ رینجرز کا گشتی پہرہ تھا جو کہیں قریب ہی سے گزر رہا تھا۔ ان کی چلائی ہوئی گولیاں ان تینوں کے درمیان سامنے والے کنارے پر لگیں۔

"بھاگو" —— ایک ہندو نے کہا۔

"انڈیا کی طرف بھاگنا" —— دوسرا ہندو بولا —— "پیچھے کو نہ دوڑنا۔ ہم پہنچ گئے ہیں"۔

"مجھے گولی لگ گئی ہے" —— صغیر نے کہا۔

"کہاں؟"

"گولی ران میں سے گزر گئی ہے" —— صغیر نے جواب دیا —— "فکر نہ کرو، میں گروں گا نہیں"۔

رینجرز کی طرف سے چند اور گولیاں آئیں لیکن وہ دُور دُور گریں۔ رینجر تاریکی میں اپنے ٹارگٹ کو دیکھے بغیر گولیاں چلا رہے تھے۔ دونوں ہندو خاصے تیز دوڑ رہے تھے اور صغیر ران میں سے گولی گزر جانے کے باوجود اُن کا ساتھ دے رہا تھا۔ یہ نالہ مڑ کر سرحد کے ساتھ ہو گیا تھا۔ گولیاں بند ہو گئی تھیں۔ صغیر کی رفتار خاصی کم ہو گئی تھی۔ ٹانگ کا درد اس پر غالب آ گیا تھا اور خون بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔

اس کے ہندو ساتھی ڈھلانی کنارے سے اوپر چڑھنے لگے اور صغیر نے بھی چڑھنے کی کوشش کی لیکن گر پڑا۔ دونوں ہندوؤں نے اسے کچھ اٹھایا، کچھ دھکیلا، کچھ گھسیٹا اور اوپر لے گئے۔ وہ اب انڈیا میں تھے۔

وہاں سے کچھ دور آگے لے جا کر صغیر کے ساتھیوں نے اسے ایک درخت کے ساتھ بٹھا دیا۔ ان میں سے ایک نے اپنا رومال نکالا اور اسے اچھی طرح تہہ کر کے صغیر کے زخم پر رکھ دیا۔ تب پتہ چلا کہ زخم تو دونوں طرف ہے۔ گولی ایک طرف سے داخل ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ دوسرے ہندو نے اپنا رومال نکالا اور اس کا پیڈ بنا کر دوسری طرف کے زخم پر رکھ دیا۔ ایک ہندو نے اپنی قمیض کی آستین کندھے تک الگ کر لی اور یہ صغیر کی ران پر کس کر باندھ دی۔

"معلوم نہیں ہم کہاں ہیں" ــــ ایک ہندو نے کہا ــــ "یہ کیسے پتہ چلے کہ بارڈر فورس کی کوئی پوسٹ قریب ہے یا نہیں"۔

"یوں کرتے ہیں" ــــ دوسرے ہندو نے کہا ــــ "تم اس طرف جاؤ اور میں اُدھر طرف جاتا ہوں۔ جسے پوسٹ مل گئی وہ وہاں سے کسی کو ساتھ لے آئے۔ شاید وہاں سے جیپ بھی مل جائے"۔

یہ ہندو اب اپنے ملک میں تھے اور جاسوس تھے اور ایک پاکستانی جاسوس کو ساتھ لائے تھے۔ ان کی حیثیت سرکاری تھی۔ انہیں انڈیا کا وزیراعظم اور صدر بھی نہیں روک سکتا تھا۔ بارڈر سیکیورٹی فورس والے تو ان کے پابند تھے۔ انہیں صغیر کی خاطر مدد کی ضرورت تھی۔ ان دونوں میں سے ایک؛ ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا۔

صغیر درد کی شدت برداشت کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

جسمانی طور پر صغیر شدید درد میں مبتلا تھا۔ گولی کا زخم چھری چاقو کے زخم سے بہت مختلف ہوتا ہے اور اس کا درد بھی مختلف ہوتا ہے۔ وہ اس لئے کہ گولی جسم کو کاٹتی بھی ہے اور جلاتی بھی ہے کیونکہ وہ سخت گرم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اتنی دور سے دوڑتے اور چلتے آنے کی وجہ سے خون بڑی تیزی سے نکل گیا تھا جو ابھی تک رکا نہیں تھا۔ جسم کا آدھے سے زیادہ خون نکل گیا تھا۔ اس وجہ سے وہ نقاہت بھی محسوس کر رہا تھا۔ اندھیرا تو تھا ہی لیکن تھوڑی تھوڑی دیر بعد صغیر کو یوں لگتا تھا جیسے اندھیرا اور زیادہ گہرا ہو گیا ہو۔ جس درخت کے نیچے وہ بیٹھا تھا اس کی شاخوں میں سے اسے ستارے نظر آتے تھے۔ دو تین بار اس نے محسوس کیا جیسے ستارے یا پورے کا پورا آسمان ایک چکر میں چل پڑا ہو۔ آسمان رکتا تھا اور پھر ایک چکر میں چل پڑتا تھا۔

جوں جوں اسے چکر آتے گئے' نقاہت بڑھتی گئی اور درد ناقابلِ برداشت ہوتا گیا

اس کے ذہن میں بیداری سی آتی گئی۔ وہاں ممی بھی نہیں تھی اور وہ ٹرانکولائزر بھی نہیں تھے جو اس کے ذہن کو سُلائے رکھتے تھے۔ جوں ہی اس کا ذہن بیدار ہوتا تھا اور اس کے منہ سے حقیقت کی کوئی بات نکل جاتی تھی تو ممی پہنچ جاتی اور اس کے ساتھ ہی اسے پینے والی کسی چیز میں نشے والی دوائی پلا دی جاتی تھی مگر وہاں انڈیا کی سرحد پر ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے وہ صرف حقیقت کو ہی دیکھ سکتا تھا یا اپنے قریب سے گزرتے ہوئے کسی سؤر کے قدموں کی آہٹ سن سکتا ہے۔

سرحد پر دونوں طرف رات کے وقت سؤر اور سمگلر ہی آتے جاتے ہیں۔

صغیر کو کچھ ایسے محسوس ہونے لگا کہ وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اس کے دل پر خوف سا طاری ہونے لگا۔ اس نے اپنی ران پر بندھے ہوئے کپڑوں پر ہاتھ رکھا تو اس کا ہاتھ خون سے لتھڑ گیا۔ خون بدستور بہہ رہا تھا۔

صغیر کو اپنے عزیز یاد آنے لگے اور پھر اُس کا ذہن اسے اس کمرے میں لے گیا جہاں بند کر کے اسے اذیتیں دی گئی تھیں اور اسے بار بار کہا جاتا تھا کہ مان جاؤ تم ہمارا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ اس یاد نے اس پر کوئی اور ہی تاثر پیدا کر دیا۔ یہ تاثر اُس کی اس خواہش پر غالب آنے لگا کہ وہ انڈیا کی سیر کرے گا۔

"واپس چلے جاؤ صغیر!" ــــ اسے جیسے اپنی آواز سنائی دی ہو ــــ "پاکستان دور نہیں"۔

"پاکستان میں کیا رکھا ہے" ــــ یہ دوسری آواز تھی ــــ "پاکستان نے مجھے دیا ہی کیا ہے"۔

"پاکستان دور نہیں" ــــ اُس کی ذات سے آواز اٹھی ــــ "یہ نالہ اُترو اور سامنے والے کنارے پر چڑھ جاؤ"۔

اسے خیال آیا کہ وہ واپس چلا جائے تو آوازیں دے کر رینجرز کو بلا لے اور انہیں بتائے کہ وہ انڈیا کے دو جاسوسوں کے ساتھ انہیں پکڑوانے کے لئے آیا تھا لیکن خود زخمی ہو کر پیچھے رہ گیا ہے اور وہ نکل گئے ہیں۔ اسے وہ کوٹھی معلوم تھی جس میں اسے قید میں رکھ کر اذیتیں دی گئی تھیں اور پھر برین واشنگ کر کے اسے پھر اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ جا کر اس کوٹھی کی بھی نشاندہی کرے اور اس طرح اس کے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔

درد کی ایسی شدید ٹیس اُٹھی کہ اس کے دانت کٹکٹانے لگے اور اس کے ذہن میں جو خیالات آئے تھے وہ اس طرح نکل گئے جیسے الٹنے سے برتن خالی ہو جاتا ہے۔ اب تو اس پر غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ذرا ہوش ٹھکانے آتے تو اسے اپنے سامنے موت ناچتی نظر آتی۔

اس نے اتنا ہی محسوس کیا کہ وہ ایک طرف کو لڑھک رہا ہے۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے رات اور تاریک ہو گئی اور ذہن پر بھی سیاہ پردہ چھا گیا۔



وہ جب ہوش میں آیا تو اسے خواب کا دھوکا ہُوا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ وہ غشی میں ہے اور اسے واہمے نظر آنے لگے ہیں اور اسے خیال آیا کہ یہ جو کچھ ہے یہ حقیقت نہیں۔ وہ ایک نرم سے بستر پر لیٹا ہُوا تھا۔ زخم کے درد کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کے بازو میں ایک سوئی لگی ہوئی تھی۔ اس نے اوپر دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ اسے گلوکوز اور خون دیا جا رہا ہے۔

وہ جالندھر کے ملٹری ہسپتال کے ایک کمرے میں پڑا ہُوا تھا۔ ایسے کمرے افسروں کے لئے مخصوص ہوتے تھے۔ اس ہسپتال میں وہ اس طرح پہنچا تھا کہ اس کا ایک ہندو ساتھی بارڈر سیکیورٹی فورس کی ایک بڑی پوسٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں اس نے بتایا تھا کہ وہ انٹیلی جنس کا آدمی ہے اور پھر اس نے بتایا کہ اس کے ساتھیوں پر کیا بیتی ہے۔ اس پوسٹ کے کمانڈر نے اپنے کمانڈر کو فون پر بتایا تو ایک جیپ آ گئی۔ اس جیپ پر وہاں پہنچے جہاں صغیر کو بٹھا آئے تھے۔ اُس وقت تک وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے جیپ میں ڈال کر بڑی پوسٹ پر لے گئے جہاں خون روکنے کے لئے اسے فرسٹ ایڈ دی گئی اور صبح تک اسے جالندھر ملٹری ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ ہسپتال کے صرف کمانڈنٹ کو بتایا گیا کہ یہ پاکستانی ہے اور انڈین انٹیلی جنس کا کارندہ ہے۔

صغیر کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے کمرے کے باہر سول کپڑوں میں آرمی کا ایک آدمی پہرے پر موجود ہے۔ صغیر کے ہندو ساتھیوں نے ہسپتال کے کمانڈنٹ کو جو ایک مشہور سرجن تھا' بتایا تھا کہ اس زخمی کو ذرا نشے میں رکھنا ہے۔ چنانچہ صغیر کو گلوکوز کے ساتھ ہی ٹرانکولائزر دیئے جانے لگے۔

اگلے ہی روز دلّی سے انڈین انٹیلی جنس کا ایک کرنل آ گیا۔ وہ صغیر سے اس طرح ملا

جیسے باپ کو ایک عرصے بعد گمشدہ بچہ مل گیا ہو۔ اس کرنل نے صغیر سے کہا کہ اسے یہاں نہیں رہنے دیا جائے گا بلکہ انبالہ کے ملٹری ہسپتال میں رکھا جائے گا۔

اگلے ہی روز صغیر کو ایک وہیل چیئر پر بٹھا کر ایمبولینس تک پہنچایا گیا۔ ایمبولینس اسے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر تک لے گئی جہاں سے اسے پھر وہیل چیئر پر بٹھا کر ہیلی کاپٹر تک لے گئے اور اس میں سوار کرا دیا گیا۔ ہیلی کاپٹر زمین سے اٹھا تو صغیر نے یوں محسوس کیا جیسے اس کی شخصیت پستی سے اُٹھ کر ایسی بلندی پر پہنچ گئی ہو جہاں تک کوئی عام آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ اسے وی آئی پی بنا دیا گیا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں اسے سٹریچر پر لٹایا گیا تھا اور اس کے بازوؤں میں بدستور خون اور گلوکوز لگا ہُوا تھا۔

انسانی فطرت بہت مضبوط بھی ہے اور کمزور اتنی کہ ذرا سی ٹھوکر سے ٹوٹ پھوٹ جائے۔ ضروری نہیں کہ ٹھوکر بڑی ہی سخت ہو۔ کسی دانشمند کو صبح شام یہ کہنے لگو کہ تم احمق ہو اور اس کے کانوں میں یہی الفاظ ڈالتے چلے جاؤ تو وہ احمقوں جیسی حرکتیں کرنے لگے گا اور صغیر جیسے چھوٹے سے آدمی کے کان میں یہ ڈالنا شروع کر دو کہ تم تو بہت بڑے آدمی ہو اور اس کے ساتھ عملاً" اسے ہاتھوں پر اٹھانا شروع کر دو اور اس کے آگے چند آدمی بار بار آ کر جھکیں تو وہ اپنے آپ کو مہاراجہ سمجھ لیتا ہے۔

صغیر کو گولی کا زخم اپنے آپ میں لے آیا تھا لیکن انٹیلی جنس کے کرنل نے جب آ کر اس کا پُرتپاک استقبال کیا اور پھر جب اسے ہیلی کاپٹر میں بٹھایا گیا اور جب ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے اس سے ان الفاظ میں پوچھا ــــ "سر! کوئی تکلیف ہو تو فوراً" بتانا" ــــ تو صغیر غبارے کی طرح پُھول گیا اور ہیلی کاپٹر سے اونچا اُڑنے لگا۔

یہ انٹیلی جنس والے ہی بہتر سمجھتے تھے کہ اسے انبالہ ہسپتال میں کیوں لے جایا گیا۔ ہیلی کاپٹر انبالہ کے ملٹری ہسپتال کے قریب اُترا۔ ہسپتال والوں کو پہلے اطلاع دے دی گئی تھی کہ ایک وی آئی پی زخمی حالت میں آ رہا ہے۔ ایک آدمی صغیر کے ساتھ تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جو جالندھر ملٹری ہسپتال میں صغیر کے کمرے کے باہر موجود رہتا تھا۔

ہیلی کاپٹر انبالہ ہسپتال کے قریب اُترا تو ایمبولینس بڑی تیزی سے ہیلی کاپٹر تک پہنچی۔ چار آدمیوں نے صغیر کا سٹریچر اٹھایا اور ایمبولینس میں ڈال دیا۔ گلوکوز اور خون کے بیگ دو آدمیوں نے اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے۔ ہسپتال کے دو فوجی افسر وہاں موجود تھے۔ دونوں نے صغیر کو سیلوٹ کیا۔ صغیر نے سیلوٹ کا جواب سیلوٹ سے دیا۔

صغیر اپنی اصلیت کو بھلا بیٹھا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ جس اصلیت کو وہ بھلا بیٹھا ہے وہ ان بھارتیوں کی آنکھوں کے سامنے ہے اور وہ اس کی اصلیت کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں اور انہوں نے اسے وی آئی پی اسی لئے بنایا ہے کہ وہ ان کے سانچے میں ڈھل جائے اور ان کی انگلیوں پر ناچے۔ ان بھارتیوں کی نگاہ میں صغیر ایمان فروش اور غدار تھا اس لئے وہ اس پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ وہ انہیں بھی دھوکہ دے سکتا تھا۔

صغیر کو ملٹری ہسپتال کے ایک الگ کمرے میں لے گئے۔ چونکہ اس کا خون بہت ضائع ہو گیا تھا اس لئے اسے مسلسل خون دیا جا رہا تھا۔ زخم بھی کچھ پیچیدہ سا تھا۔ خطرہ تھا کہ ٹانگ کی کوئی اہم رگ کٹ گئی ہو گی۔ ظاہر ہے ہسپتال والوں کو بتایا گیا ہو گا کہ یہ زخمی انٹیلی جنس کے لئے بہت اہم ہے اس لئے ہسپتال کے ڈاکٹر بھی صغیر پر خصوصی توجہ دے رہے تھے۔ ایک نرس بار بار اسے آکر دیکھتی اور حال احوال پوچھتی تھی۔ جس آدمی کو کمرے کے باہر ڈیوٹی پر بٹھایا گیا تھا وہ تھا تو پہرہ دار لیکن اوپر والوں کے حکم کے مطابق وہ صغیر کے ساتھ اس طرح سلوک اور برتاؤ کرتا تھا جیسے وہ اس کا خادم ہو اور اس کی خدمت کے لئے اسے وہاں بھیجا گیا ہو۔ ایک ڈاکٹر دن رات میں کئی بار صغیر کو دیکھنے آتا تھا۔ وہ فوجی نہیں سویلین ڈاکٹر تھا۔ یہ ڈاکٹر گلوکوز یا خون کی نالی میں ایک انجکشن صبح اور ایک انجکشن شام کو ڈالتا تھا۔

صغیر کے ذہن سے ایک بار پھر پاکستان، اپنا مرا ہوا بھائی اور عزیز و اقارب نکل گئے۔ اسے تو جیسے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ کمرے میں کسی کو بھی آنا ہوتا، خواہ وہ ڈاکٹر ہوتا یا کوئی اور افسر، وہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر آتا تھا۔ صغیر کی جذباتی حالت یہ تھی کہ جب بھی دروازے پر دستک ہوتی وہ چونک کر اور بڑے اشتیاق سے دروازے کی طرف اس امید پر دیکھتا کہ مُنی آئی ہے۔ لاہور سے رخصت ہوتے وقت مُنی نے اُسے کہا تھا کہ وہ گاڑی پر انڈیا جائے گی اور اس سے پہلے پہنچ جائے گی اور اس کا استقبال کرے گی۔

کچھ دنوں بعد صغیر خون اور گلوکوز کی ان نالیوں اور سُوئیوں سے جو اُس کے بازو میں اُتری رہتی تھیں، آزاد ہو گیا۔ اب اسے زخم نے پابند کر رکھا تھا۔ گولی کا زخم اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہُوا کرتا۔ اسے اب باتھ روم تک جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ باتھ روم کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ صغیر چل تو سکتا تھا لیکن ذرا زیادہ چلنے سے ران کے اندر

درد شروع ہو جاتا تھا۔

صغیر کے کمرے کے دروازے پر جو آدمی موجود رہتا تھا وہ سویلین تھا اور اس کا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ تھا۔ وہ صغیر کے پاس جا بیٹھتا اور گپ شپ لگاتا تھا۔ وہ دراصل یہ جائزہ لیتا رہتا تھا کہ صغیر ذہنی طور پر بیدار ہے یا اس کے احساسات سوئے ہوئے ہیں۔

صغیر کی ذہنی بیداری انجکشنوں سے ختم کر دی گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جسمانی طور پر بیدار رہتا تھا۔ وہ نشے والی ان دوائیوں کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ بظاہر جاگتا رہتا تھا لیکن اس کا ذہن سویا ہُوا ہوتا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ اس کی عقل اور ہوش پر پردہ پڑا ہُوا تھا۔

اس کا پہرہ دار اس کے ساتھ خاصا بے تکلف ہو گیا۔ ایک روز پہرہ دار اس خیال سے کچھ دیر کے لئے کسی کام سے چلا گیا کہ صغیر چل پھر تو سکتا نہیں، اس نے کہاں بھاگ جانا ہے۔ جو سویلین ڈاکٹر صغیر کو انجکشن وغیرہ دینے آتا تھا، وہ آیا تو اس نے بھی حسبِ معمول صغیر کے ساتھ بے تکلفی کے انداز میں باتیں کیں۔ ڈاکٹر کی عمر تیس بتیس سال تھی اور وہ جسم اور دماغ کے لحاظ سے خاصا مستعد اور سمارٹ تھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" ___ صغیر نے پوچھا ___ "چھُٹی کب ملے گی؟"

"چھُٹی کا انحصار آپ کے زخم پر ہے" ___ ڈاکٹر نے دوستانہ انداز میں کہا ___ "کیا جلدی ہے آپ کو؟ کچھ دن اور ہمارے مہمان رہیں اور ہمیں مزید خدمت کا موقع دیں"۔

"آپ شاید مسلمان ہیں" ___ صغیر نے کہا ___ "آپ کا انداز اور آپ کی باتیں بتاتی ہیں کہ آپ مسلمان ہیں"۔

"آپ کا اندازہ صحیح ہے" ___ ڈاکٹر نے کہا ___ "میرا نام عبدالرشید ہے .... کیا آپ بھی ...."

"جی ہاں" ___ صغیر درمیان میں بول پڑا ___ "میں بھی مسلمان ہوں اور میرا نام صغیر احمد ہے"۔

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"میرٹھ!" ___ صغیر نے جھوٹ بولا۔

ڈاکٹر صغیر کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بار بار دروازے کی طرف دیکھتا تھا جیسے وہ کوئی خطرہ محسوس کر رہا ہو۔ یہ تو اسے بتا دیا گیا تھا کہ یہ خاص قسم کا مریض ہے اور یہ تو ڈاکٹر نے دیکھ ہی لیا تھا کہ اسے فوجی یہاں لائے تھے اور ڈاکٹر کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس مریض کا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔ اب اسے پتہ چلا کہ یہ مریض مسلمان ہے تو اس کا تجسس بڑھ گیا۔ یہ دراصل تجسس نہیں تھا بلکہ یہ ایک جذبہ سا تھا لیکن اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اس جذبے کا اظہار کرنے سے گھبراتا ہے۔



صغیر کی دیکھ بھال کے لئے ایک نرس بھی تھی جس کی عمر پچیس چھبیس سال تھی۔ شکل و صورت میں کشش تھی اور اس کا جسم سمارٹ تھا اور رنگ بھی کچھ گورا گورا سا تھا۔ اپنی ڈیوٹی کے دوران وہ سات آٹھ مرتبہ صغیر کو دیکھنے آتی' اس کا ٹمپریچر' نبض اور بلڈ پریشر چیک کرتی اور جس دوائی کا وقت ہوتا وہ اسے دے دیتی تھی۔ وہ خود تو صغیر کے ساتھ بے تکلف نہ ہوئی' صغیر نے اسے اپنے ساتھ ذرا کھول لیا تھا۔

"تم میری اتنی زیادہ خدمت کرتی ہو" —— ایک روز صغیر نے اس نرس سے کہا اور پوچھا —— "تمہارا نام کیا ہے؟"

"خالدہ" —— نرس نے جواب دیا۔

"اور یہ جو دوسری نرس تمہاری ڈیوٹی کے بعد آتی ہے" —— صغیر نے پوچھا — "ہندو ہے یا کرسچین؟ .... ویسے وہ بھی تمہاری طرح میرا بہت خیال رکھتی ہے"۔

"وہ کرسچین ہے" —— خالدہ نے کہا۔

دوسری نرس جو کرسچین تھی شام کی ڈیوٹی پر آیا کرتی تھی۔ خالدہ کی ڈیوٹی ان دنوں صرف دن کی تھی۔ کرسچین نرس کی عمر کم و بیش پینتیس سال تھی اور اس کا رنگ گہرا سانولا اور جسم خاصا فربہ تھا۔

"میرا خیال ہے آپ بھی مسلمان ہیں" —— خالدہ نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا — "آپ کا بیڈ کارڈ یہاں ہونا چاہئے تھا۔ معلوم نہیں آپ کا بیڈ کارڈ یہاں کیوں نہیں رکھا گیا۔ بہرحال میں نے ایک جگہ آپ کا نام پڑھ لیا تھا"۔

"ہاں خالدہ!" —— صغیر نے کہا —— "میں مسلمان ہوں اور میں میرٹھ کا رہنے والا ہوں"۔

"میرٹھ میں مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے؟" —— خالدہ نے پوچھا اور اسے بتایا —— "وہاں تو آئے دن دنگا فساد ہوتا رہتا ہے اور مسلمان بیچارے قتل ہوتے رہتے ہیں' ہندو ان کے گھروں کو لوٹ لیتے ہیں اور ان کی عورتوں کی بے حرمتی کرتے ہیں"۔

"ہاں خالدہ!" —— صغیر نے کہا —— "ہوتا تو یہی ہے .... کیا یہاں کے ہندو مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے؟"

"آپ کے اس سوال کا جواب دیتے ڈر لگتا ہے" —— خالدہ نے کہا —— "یہاں کے مسلمان نام کے مسلمان ہیں۔ خوف و ہراس میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ہندوؤں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ مسجدیں تو ہیں لیکن نمازی نہیں۔ میں یہیں انبالہ کی رہنے والی ہوں .... معاف رکھنا صغیر صاحب! میں نے فضول باتیں شروع کر دی ہیں۔ خدا کے لئے یہاں کسی کو یہ نہ بتا دیجئے گا کہ میں نے آپ کے ساتھ یہ باتیں کی ہیں"۔

"کیا تمہیں مجھ پر اتنا بھی اعتبار نہیں خالدہ!" —— صغیر نے پوچھا —— "کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھتی ہو کہ میں تمہاری شکایت کر کے تمہیں سزا دلواؤں گا؟"

خالدہ کا سر جھک گیا۔

"کیا بات ہے خالدہ!" —— صغیر نے اپنائیت کے لہجے میں پوچھا۔

خالدہ نے سر اٹھایا تو صغیر نے دیکھا کہ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے جو اس نے فوراً ہاتھ سے پونچھ ڈالے۔

"بیٹھ جاؤ خالدہ!" —— صغیر نے اپنے بیڈ پر پرے کو سرکتے ہوئے کہا —— "یہاں بیٹھو"۔

خالدہ نے کچھ کہنے کی بجائے سر ہلایا جس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے پاس نہیں بیٹھے گی کیونکہ کسی نرس کو کسی مرد مریض کے پاس بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔

"میں جاؤں؟" —— خالدہ نے غمزدہ سی آواز میں پوچھا۔

"میں تمہیں روک نہیں سکتا" —— صغیر نے کہا —— "لیکن یہ سوچ لو کہ تمہارے آنسو مجھے پریشان کر رہے ہیں اور تم چلی جاؤ گی تو میں اور زیادہ پریشان ہوں گا"۔

"ان آنسوؤں کی بات سنانے سے تو ڈرتی ہوں" —— خالدہ نے کہا۔

"کیوں ڈرتی ہو؟"

"غور فرمائیں صغیر صاحب!" —— خالدہ نے دبی دبی سی آواز میں کہا —— "ہم

مسلمان اتنے مجبور ہیں کہ ایک دوسرے کو اپنا دکھ بھی نہیں سنا سکتے۔ اگر آپ اجنبی ہوتے تو میں کھُل کر بات کرتی .... لیکن صغیر صاحب! آپ خود مسلمان ہیں اور انڈیا میں رہتے ہیں، کیا آپ نہیں جانتے کہ مسلمان یہاں کتنے مجبور اور بے بس ہیں؟"

"جانتا ہوں خالدہ!" —— صغیر نے کہا۔

"اچھا میں چلتی ہوں" —— خالدہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

صغیر کی نظریں دروازے کے ان کواڑوں پر لگی رہیں جو خالدہ بند کر کے چلی گئی تھی۔



صغیر کے شب و روز اس کمرے میں اسی بیڈ پر گزر رہے تھے۔

خالدہ کے جانے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ڈاکٹر عبدالرشید آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سرنج تھی جس میں دوائی بھری ہوئی تھی۔ یہ اس نے صغیر کو انجکشن دینا تھا۔

"بیٹھیں ڈاکٹر صاحب!" —— صغیر نے کہا —— "انجکشن لگتے ہی رہتے ہیں تھوڑی دیر بعد سہی .... میرٹھ میں تو مسلمانوں کا جینا حرام ہو رہا ہے، میرا خیال ہے آپ لوگ یہاں انبالہ میں پر سکون زندگی گذار رہے ہیں"۔

"ہاں صغیر بھائی!" —— ڈاکٹر رشید نے کہا —— "غلام جب غلامی کو ذہنی طور پر قبول کر لیتے ہیں تو اُن کی زندگی پر سکون ہو جاتی ہے۔ جس دل سے آزادی کی تڑپ نکل جاتی ہے اور وہ اپنے آقا کو اَن داتا سمجھ لیتا ہے، وہ دل بہت خوش رہتا ہے .... میرٹھ میں آپ لوگ ہندوؤں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اکثریت میں تو ہندو ہی ہیں۔ حکومت بھی ہندوؤں کی ہی ہے۔ پولیس ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ مسلمان قتل اور زخمی ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے لیکن ہم لوگ بہت بُری اقلیت میں ہیں اس لئے دبے دبے رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہاں وہ دنگا فساد نہیں ہوتا جو میرٹھ میں ہوتا ہے"۔

خالدہ تو بات کرتے ڈر گئی تھی، ڈاکٹر عبدالرشید کے انداز میں وہ ڈر نہیں تھا۔ وہ بھی بھول گیا کہ صغیر کا تعلق فوج اور انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔ اس نے صرف یہ ذہن میں رکھا کہ صغیر مسلمان ہے۔ وہ دونوں خاصی دیر باتیں کرتے رہے۔

"ایک بات بتائیں صغیر صاحب!" —— ڈاکٹر رشید نے پوچھا —— "آپ کو یہ انجکشن کیوں دیئے جا رہے ہیں؟"

"ڈاکٹر آپ ہیں!" —— صغیر نے کہا —— "یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مجھے کیا اور کیوں دیا جا رہا ہے"۔

"آپ کا نسخہ میں نے نہیں لکھا" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا —— "صبح کے وقت وہ میجر ڈاکٹر راؤنڈ پر آتا ہے، آپ کا نسخہ وہ لکھتا ہے اور یہ انجکشن اسی نے لکھے ہیں .... کیا آپ کو نیند نہیں آتی؟"

"آتی ہے" —— صغیر نے جواب دیا۔

"کیا آپ ذہنی یا جسمانی طور پر بے چینی محسوس کرتے ہیں؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" —— صغیر نے جواب دیا۔

"کیا آپ نے یہاں آتے ہی ڈاکٹر سے نیند نہ آنے کی یا بے چینی کی شکایت کی تھی؟" —— ڈاکٹر رشید نے پوچھا۔

"نہیں" —— صغیر نے جواب دیا اور پوچھا —— "کیوں ڈاکٹر صاحب کیا بات ہے؟ .. آپ کے پوچھنے کے انداز سے مجھے کچھ شک سا ہوتا ہے"۔

"صغیر بھائی!" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا —— "میں پہلی درخواست آپ سے یہ کروں گا کہ میں آپ کے ساتھ جو بھی بات کروں وہ خدا کے سوا کسی تک نہ پہنچے۔ یہ سمجھ لیں کہ میں مسلمان ہوں۔ اگر مجھ پر ذرا سا بھی شک ہو گیا کہ میں نے آپ کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات کی ہے تو میں مارا جاؤں گا"۔

"بات کریں ڈاکٹر صاحب!" —— صغیر نے کہا —— "مسلمان ہو کر میں کسی مسلمان کو نہیں مرواؤں گا"۔

"بات یہ ہے صغیر بھائی!" —— ڈاکٹر نے کہا —— "یہ انجکشن کسی پاگل کو پاگل خانے میں دیئے جاتے ہیں یا کسی ایسے آدمی کو دیئے جاتے ہیں جس کے ذہن کو اپنے سانچے میں ڈھالنا مقصود ہوتا ہے"۔

"ڈاکٹر صاحب!" —— صغیر نے بڑی گہری سنجیدگی سے کہا —— "میں پاگل نہیں اور میں نے یہاں کے کسی بھی بڑے ڈاکٹر سے نہیں کہا تھا کہ میں اپنے جسم میں کوئی بے چینی یا ذہن میں کوئی تلخی یا نیند میں کمی محسوس کرتا ہوں۔ معلوم نہیں یہ لوگ مجھے یہ انجکشن کیوں دے رہے ہیں"۔

"اگر آپ کہیں تو میں ڈاکٹر کی حیثیت سے آپ کو اپنے دل کی بات بتا دوں" ——

ڈاکٹر نے کہا۔

"کہیں ڈاکٹر صاحب!" ــــ صغیر نے کہا ــــ "ضرور کہیں۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں کسی اور کے ساتھ بات نہیں کروں گا"۔

"راز کی کوئی بات نہیں صغیر بھائی!" ــــ ڈاکٹر رشید نے کہا ــــ "میں مسلمان ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ میرے ہاتھوں یا میرے سامنے کسی مسلمان کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ آپ کو یہ انجکشن بلاوجہ اور بلا ضرورت دیئے جا رہے ہیں۔ خطرہ یہ ہے کہ کچھ دن اور آپ کو یہ انجکشن ملتے رہے تو آپ ان کے عادی ہو جائیں گے۔ پھر جب آپ ہسپتال سے ٹھیک ہو کر نکلیں گے تو آپ کا ذہن ان دوائیوں کا مطالبہ کرے گا اور جب آپ کو نشے والی یہ دوائیاں نہیں ملیں گی تو آپ کی حالت پاگلوں جیسی ہو جائے گی۔ یہ انجکشن آپ کو میرے ہاتھ سے دلوائے جا رہے ہیں اور میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے مجھ سے ایک گناہ کروایا جا رہا ہو"۔

"اگر آپ یہ انجکشن مجھے نہ دیں تو کیا ہو گا؟" ــــ صغیر نے پوچھا۔

"ہو گا یہ" ــــ ڈاکٹر رشید نے کہا ــــ "کہ میجر یا کرنل ڈاکٹر کو پتہ چل گیا کہ میں نے آپ کو انجکشن نہیں لگایا تو مجھے صرف نوکری سے ہی برطرف نہیں کر دیا جائے گا بلکہ باقاعدہ مقدمہ چلا کر مجھے دو چار سالوں کے لئے جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ مسلمانوں کے خلاف تو یہ لوگ بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں"۔

"میں آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے یہ انجکشن نہ لگائیں" ــــ صغیر نے کہا ــــ "ڈاکٹر ہر صبح آ کر پوچھتا ہے کہ انجکشن لگ رہے ہیں؟ میں اسے بتاؤں گا کہ لگ رہے ہیں"۔

"اگر آپ میرے ساتھ یہ تعاون کریں تو یہ ایک نیکی ہو گی" ــــ ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا ــــ "میں آج سے ہی یہ کام شروع کر دیتا ہوں۔ یہ انجکشن آپ کو نہیں لگاؤں گا۔ انجکشن لے آیا کروں گا اور یہاں آ کر غسل خانے میں گرا دیا کروں گا۔۔۔ لیکن صغیر بھائی میں صرف یہی کام نہیں کروں گا بلکہ میں یہ بھی دیکھتا رہوں گا کہ ان انجکشنوں کے بغیر آپ کو کوئی ذہنی تلخی تو محسوس نہیں ہوتی۔ اگر ہوئی تو میں اپنے طور پر اس کا بندوبست کروں گا"۔

ڈاکٹر عبدالرشید کے ہاتھ میں سرنج تھی جس میں ایک دو سی سی ٹرانکولائزر دوائی

بھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے باتھ روم میں جا کر یہ دوائی ضائع کر دی۔ اسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ صغیر کو کس مقصد کے تحت یہ انجکشن دیئے جا رہے ہیں۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا تو شاید وہ صغیر کو انجکشن نہ دینے کا خطرہ مول نہ لیتا۔



اگلی صبح میجر ڈاکٹر راؤنڈ پر آیا۔ وہ ہندو تھا۔ اس نے حسب معمول صغیر سے حال احوال پوچھا اور پھر پوچھا کہ دوائیاں ٹھیک مل رہی ہیں؟ انجکشن لگ رہے ہیں؟ صغیر نے جواب دیا کہ دوائیاں اور انجکشن باقاعدگی سے مل رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرشید بھی اس کے ساتھ تھا۔ صغیر کا جواب سن کر ڈاکٹر رشید کا چہرہ چمک اٹھا۔

ڈاکٹر کے راؤنڈ کے کوئی ایک گھنٹہ بعد خالدہ آ گئی۔ صغیر نے اس طرح بے تکلفی اور پیار سے اس کا استقبال کیا جیسے اس کی اپنی کوئی قریبی عزیزہ آ گئی ہو۔ خالدہ نے اس کا بلڈ پریشر، نبض اور ٹمپریچر چیک کرنا شروع کر دیا۔

"رات نیند ٹھیک آئی؟" ــــ خالدہ نے صغیر سے پوچھا۔

"ٹھیک ہی سمجھو" ــــ صغیر نے جواب دیا ــــ "پہلے جیسی نہیں آئی۔ دو تین بار آنکھ کھلی اور ذہن بھٹکتا رہا"۔

"ذہن کہاں بھٹکتا رہا؟" ــــ خالدہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے کل کے آنسوؤں میں!" ــــ صغیر نے کہا ــــ "ڈاکٹر عبدالرشید صاحب بھی چونکہ مسلمان ہیں اس لئے کل ان کے ساتھ بہت باتیں ہوئی ہیں۔ تم ڈرتی تھیں کہ میں تمہاری کوئی بات کسی اور کو نہ بتاؤں۔ یقین کرو خالدہ! میں نے ڈاکٹر رشید صاحب کو بھی نہیں بتایا کہ تم نے میرے ساتھ ذاتی قسم کی کوئی بات کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں مسلمان بڑی مجبوری اور بے کسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تم یہ باتیں زبان پر کیوں نہیں لاتیں؟"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟" ــــ خالدہ نے پوچھا ــــ "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت کیا رہ گئی ہے؟ کیا آپ انڈین مسلم نہیں ہیں؟"

"یہی سمجھ لو کہ میں انڈین مسلم نہیں ہوں اور کہیں باہر سے آیا ہوں" ــــ صغیر نے کہا ــــ "میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ انبالہ کے مسلمان باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرشید کو اس ہسپتال میں نوکری ملی ہوئی

ہے اور تم بھی یہاں سروس کر رہی ہو.... اور کیا چاہئے!"

"صغیر صاحب!" ــــ خالدہ نے آہستہ سے کہا ــــ "زندگی کا مقصد صرف نوکری اور پیسے کمانا ہی نہیں ہوتا۔ عزت اور آبرو بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میری نوکری ایک میں نہیں ایک منٹ میں ختم ہو سکتی ہے اگر میں اس میجر ڈاکٹر کو جو راؤنڈ پر آیا کرتا ہے ناراض کر دوں"۔

"خواہ مخواہ اسے ناراض کرو گی!" ــــ صغیر نے کہا ــــ "اپنا کام باقاعدگی اور دلجمعی سے کرتی رہو شکایت کا موقع نہ دو اور اوپر والوں کا ہر حکم مانو"۔

"لیکن مجھے اس میجر کا ایک ناجائز حکم بھی ماننا پڑتا ہے" ــــ خالدہ نے کہا ــــ "وہ مجھے دن میں دو مرتبہ اپنے کمرے میں بلاتا ہے اور اپنی گود میں بٹھا لیتا ہے۔ آگے آپ خود سمجھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم میرے ساتھ لگ جاتی ہو تو میرا ذہن اور میرے اعصاب ریلیکس ہو جاتے ہیں.... اگر میں کسی ایک وقت اس کی یہ فرمائش پوری نہ کروں تو اسی وقت مجھے نوکری سے جواب مل جائے"۔

"پھر تم اس نوکری پر لعنت کیوں نہیں بھیجتیں؟"

"میں جانتی تھی آپ یہی فیصلہ دیں گے" ــــ خالدہ نے کہا ــــ "اور آپ یہی نصیحت کریں گے۔ صغیر صاحب! میں نوکری پر لعنت بھیج سکتی ہوں لیکن میں اپنی بیمار ماں پر لعنت نہیں بھیج سکتی جس کا پرسانِ حال کوئی بھی نہیں۔ میں اپنے دو چھوٹے بھائیوں پر لعنت نہیں بھیج سکتی جن کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے والا میرے سوا اور کوئی نہیں۔ میں اپنے بوڑھے باپ پر لعنت نہیں بھیج سکتی جس کی پنشن ناکافی ہے اور جو دمے کا مریض ہے۔ میں تو خدا سے بھی شکوہ نہیں کرتی جس نے مجھ سے میرا بڑا بھائی ہمیشہ کے لئے چھین لیا تھا۔ میرے خاندان کی تمام تر ذمہ داریاں میرے کندھوں پر ہیں۔ میں اس امید پر اپنی امنگیں اور ارمان قربان کر رہی ہوں کہ چھوٹے بھائی پڑھ لکھ کر جوان ہو جائیں گے تو کہیں اچھی نوکری کر لیں گے"۔

صغیر کی نظریں خالدہ کے پُرشباب چہرے پر جم کے رہ گئی تھیں۔ خالدہ کے چہرے پر شباب تو تھا لیکن جوانی کی رونق اداسیوں کی تہہ میں چھپی ہوئی تھی۔ صغیر کو آٹھ دس گھنٹوں بعد ٹرانکولائزر دوائی کا انجکشن دیا جاتا تھا۔ سولہ سترہ گھنٹوں سے اسے ایک بھی انجکشن نہیں ملا تھا اس لئے وہ ذہنی طور پر بیدار تھا۔ وہ نشے سے ٹوٹا ہُوا نہیں لگتا تھا۔ وہ

خود محسوس کر رہا تھا جیسے وہ سب کچھ سمجھ رہا ہے اور اس کی تمام حسیّں بیدار ہیں۔

"1947ء میں تمہارے والدین دوسرے مسلمانوں کے ساتھ پاکستان کیوں نہیں چلے گئے؟" ــــ صغیر نے پوچھا۔

"جا نہیں سکے" ــــ خالدہ نے جواب دیا ــــ "میں تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ ابّا بتاتے ہیں کہ وہ یہاں پھنس کے رہ گئے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنا سب کچھ یہاں چھوڑ کر چلے جانے پر ان کا دل آمادہ نہ ہُوا۔ میں اپنی اس خواہش کو کبھی بھی دبا نہیں سکی کہ ایک بار پاکستان جاؤں اور دیکھوں کہ مسلمان کس طرح آزادی سے رہتے ہیں"۔

"تم پاکستان آؤ" ــــ صغیر نے کہا ــــ "میں تمہیں اپنے گھر رکھوں گا۔ تم نے میری جو خدمت کی ہے' میرا جی چاہتا ہے کہ تم اپنے پورے خاندان کے ساتھ پاکستان آ جاؤ"۔

"کیا آپ پاکستانی ہیں؟" ــــ خالدہ نے پوچھا اور کہا ــــ "آپ تو کہتے تھے کہ آپ میرٹھ کے رہنے والے ہیں"۔

صغیر یک لخت سنجیدہ ہو گیا اور کچھ گھبرایا بھی۔ فوراً ہی وہ ہنس پڑا۔ خالدہ کوئی ایسی بچّی تو نہیں تھی کہ اس کی سنجیدگی اور پھر ہنسی کو نہ سمجھ سکتی۔

"صغیر صاحب!" ــــ خالدہ نے کہا ــــ "حقیقت کو آپ ہنسی سے چھپا نہیں سکتے۔ میں شروع سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا لب و لہجہ میرٹھ اور دِلّی وغیرہ والا ہے ہی نہیں۔ بے شک آپ اردو ہی بولتے ہیں لیکن آپ کا لب و لہجہ پنجاب کے لوگوں جیسا ہے۔ آپ پنجابی ہیں۔ یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں کہ آپ انڈیا کے پنجاب کے رہنے والے ہیں یا پاکستان کے پنجاب کے۔ اب آپ نے پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے خود ہی کہہ دیا ہے کہ آپ مجھے اور میرے خاندان کو اپنے گھر میں رکھیں گے .... سچ بتائیں آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ مجھ سے کوئی قسم لے لیں' میں کسی کو نہیں بتاؤں گی"۔

"ہاں خالدہ!" ــــ صغیر نے کہا ــــ "میں پاکستانی ہوں۔ میں تم سے کوئی قسم نہیں لیتا۔ اسلام کے ناطے سے یہ امید رکھوں گا کہ کسی کے ساتھ یہ بات نہیں کرو گی.... میں ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق اتنا ہی جانتا ہوں کہ ہندو انہیں قتل کرتے رہتے ہیں اور ویسے بھی ان کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتے ہیں۔ تم یہ سمجھ لو کہ میں اس ملک کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ مجھے بتاؤ کہ یہاں مسلمان کس طرح زندگی گذار رہے ہیں"۔

ان دونوں کے درمیان مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ خالدہ تفصیل سے بات کرنے ڈرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ صغیر کوئی خاص اور خفیہ قسم کی شخصیت ہے ورنہ بڑے بڑے فوجی افسروں کے ساتھ بھی یہاں اس قسم کا خاص اور اتنا اعلیٰ سلوک نہیں ہوتا تھا۔ صغیر کو ٹرانکولائزر نہیں مل رہے تھے اس لئے اس کی اصل شخصیت اور اصل کردار بیدار ہو گیا تھا۔ وہ خالدہ کے پیچھے پوری طرح پڑ گیا اور اس نے خالدہ کو بولنے پر آمادہ کر لیا۔

"صرف ایک بات سے آپ کو پتہ چل جانا چاہئے کہ مسلمان یہاں کس طرح جی رہے ہیں" — خالدہ نے کہا — "وہ بات یہ ہے کہ میں آپ کو بتانے سے ڈرتی ہوں کہ یہاں مسلمانوں کی حالت کیا ہے اور روز بروز کس طرح بگڑ رہی ہے۔ میں آپ کو پہلے بتا چکی ہوں کہ مسلمان یہاں خوف و ہراس میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمیں یہاں کی سوسائٹی میں اچھوتوں جیسا درجہ حاصل ہے۔ ہم مسلمان انسانی حقوق کی بات کرنے کا بھی حق نہیں رکھتے۔ کسی مسلمان لڑکی پر ہندو دست درازی کریں اور اس کی آبرو سے بھی کھیل جائیں تو تھانے والے بھی مظلوم لڑکی کی بات نہیں سنتے۔ اگر لڑکی کے لواحقین شور شرابا یا قانونی چارہ جوئی کریں تو ہندو ان کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ ہندو جس وقت چاہیں اور جہاں چاہیں مسلمانوں پر یلغار کر دیتے ہیں جس میں کئی مسلمان مارے جاتے اور زخمی ہوتے ہیں اور ان کے گھر اور ان کی عزتیں بھی لوٹ لی جاتی ہیں۔ خوف و ہراس کا یہ عالم ہے کہ مسلمان کسی اجنبی ہندو کو یہ بتاتے ہوئے بھی ڈرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ یہاں بعض جگہوں پر ہندوؤں نے مسلمانوں پر اتنا خوف طاری کر رکھا ہے کہ مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنا مذہب چھوڑ کر ہندو ہو جائیں تو شاید سکھ چین سے رہیں گے۔ کوئی بتا نہیں سکتا کہ دیہات میں کتنے مسلمان ہندو ہو چکے ہیں۔ ان پر مسلسل خوف طاری کیا جاتا رہا ہے اور ان کا سوشل بائیکاٹ بھی کر دیا جاتا ہے"۔

خالدہ جوں جوں بھارتی مسلمانوں کی حالتِ زار کی تفصیلات سناتی جا رہی تھی، صغیر کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ دو تین مرتبہ تو اس نے اپنے ایک ہاتھ پر دوسرے ہاتھ کا مکہ مارا جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ غصے سے بے قابو ہوا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت اس کے سامنے ناچنے لگی تھی کہ وہ بھی مسلمان ہے اور اس کے ہم مذہب یہاں مجبوری اور بے کسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

"صغیر صاحب!" — خالدہ نے کہا — "میرے محلے میں دو سکھ عورتیں ہیں جن کے بچے جوان ہو گئے ہیں۔ وہ اصل میں سکھ نہیں تھیں۔ انہیں 1947ء میں سکھوں نے اغوا کیا تھا۔ پہلے تو انہیں بہت خراب کیا گیا پھر دو سکھوں نے ان کے ساتھ شادیاں کر لیں۔ ان کی مجبوری تھی کہ باوقار گھرانوں کی مسلمان لڑکیاں تھیں اور اپنے آپ کو سکھوں سے بچا نہ سکیں۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود انہوں نے سکھ مذہب کو قبول نہیں کیا۔ آج بھی وہ اپنی اُس زندگی کو یاد کرتی ہیں جو انہوں نے اغوا سے پہلے تک گزاری تھی۔ وہ اپنے مذہب کو نہیں بھولیں۔ ان میں سے ایک نے میری موجودگی میں میری امی کو بتایا تھا کہ وہ کبھی کبھی چوری چھپے نماز پڑھ لیتی ہے اور اللہ سے معافی مانگتی ہے .... یہاں یہ دو عورتیں ہی نہیں جنہیں مسلمان سے سکھ بنا کر بیویاں بنا لیا گیا تھا اور انہوں نے سکھ پیدا کئے۔ بعض ہندوؤں کے گھروں میں بھی مسلمان عورتیں ہیں۔ انہیں بھی 1947ء میں اغوا کیا گیا تھا"۔

کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ آدمی آیا تھا جو صغیر کے کمرے کے باہر بیٹھا رہتا تھا۔ خالدہ نے اپنا سامان اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔ وہ محسوس نہ کر سکی کہ صغیر کس قدر مشتعل ہو گیا ہے۔ صغیر دراصل کمزور شخصیت کا آدمی تھا جس پر جذبات کا غلبہ بڑی جلدی ہو جاتا تھا۔ کبھی ہندوؤں کے ایجنٹوں نے پاکستان میں پاکستان کے خلاف اپنے پُراثر انداز میں باتیں کیں تو وہ پاکستان کے ہی خلاف ہو گیا۔ اب ایک مسلمان لڑکی نے انڈیا کے مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا تو وہ ہندوؤں کو اپنا دشمن سمجھنے لگا۔

اپنے ملک کے جاسوسوں کے ہاتھوں میں ایسے ہی نوجوان کھیلنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جو انتہا پسند اور ذہنی طور پر ابنارمل ہوتے ہیں۔ صغیر کا بھی ذہنی توازن بگڑا ہوا تھا۔



اگلے روز ڈاکٹر عبدالرشید صغیر کو نشے والی دوائی کا انجکشن لگانے آیا تو اس نے سرنج باتھ روم میں جا کر فلش میں خالی کر دی اور خالی سرنج بالٹی میں پھینک دی۔

"صغیر بھائی!" — ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا — "یہ تیسرا انجکشن ہے جو میں تمہیں نہیں دے رہا۔ یہ بتاؤ کہ تم کوئی تکلیف تو نہیں محسوس کر رہے؟ .... کسی قسم کی بے چینی یا بے خوابی کی شکایت تو نہیں؟"

"کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب!" — صغیر نے کہا — "لیکن ایسا نہیں کہ

میں اسے برداشت ہی نہ کر سکوں۔ آپ نے ان دوائیوں کے متعلق جو باتیں بتائی تھیں وہ میں نے سمجھ لی تھیں۔ میں تو بیدار ہو گیا ہوں .... ڈاکٹر صاحب! میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کچھ کر سکتا ہوں!؟"

"کیا بات کی ہے آپ نے صغیر صاحب!" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے قدرے طنزیہ سے لہجے میں کہا —— "پورا پاکستان کچھ نہیں کر سکا تو ایک اکیلا بھارتی مسلمان کیا کرے گا۔ ایک وقت تھا کہ ہماری نظریں پاکستان پر لگی ہوئی تھیں۔ پاکستان کی فوج کی بہادری کے بہت چرچے سنے تھے۔ ستمبر 1965ء کی جنگ میں پاکستان کی آرمی' ایئر فورس اور نیوی نے پورے انڈیا میں خوف کی لہر دوڑا دی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہندو ہمیں یعنی انڈیا کے مسلمانوں کو کس طرح جُھک جُھک کر سلام کرتے تھے۔ یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ پاکستان آرمی پورے پنجاب پر چھا گئی ہے اور ایک دو مہینوں بعد دلی پہنچ جائے گی۔ ہندو تو صحیح معنوں میں گیدڑ بن گئے اور یہاں کے مسلمان شیر ہو گئے لیکن اعلان تاشقند کے بعد معاملہ پھر وہیں کا وہیں جا پڑا جہاں پہلے تھا....

"پھر آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ دسمبر 1971ء میں تو ہندوؤں نے ہم پر طعنوں کے وہ تیر برسائے کہ ہم منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ وہی پاکستان جس کی فوج سے پورا انڈیا ڈرتا تھا' ساری دنیا میں ایک کمزور ملک کے روپ میں مشہور ہو گیا۔ آپ نے مجھے کہا تھا کہ تم لوگ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔ میں نے گول مول سا جواب دے دیا تھا لیکن صغیر بھائی! اصل بات یہ ہے کہ پاکستان میں جا کر کیا کریں گے۔ ہمیں یہاں ہندوؤں کے دیس میں اپنی مستورات کی بے حُرمتی کا غم لگا رہتا ہے۔ ہماری عزت محفوظ نہیں۔ مجھے یہ بتائیں' کیا پاکستان میں خود اپنی ہی مستورات کی عزت محفوظ ہے؟ .... ہم اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ بھی ہندوستانی مسلمان ہیں۔ یہاں کے اخبار ضرور پڑھتے ہوں گے۔ کبھی کبھار کسی کا کوئی پاکستانی رشتہ دار یہاں آ جاتا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں نہ کسی کا گھر لٹنے سے محفوظ ہے نہ کسی کی عزت کی کوئی گارنٹی دے سکتا ہے"۔

ڈاکٹر عبدالرشید اور صغیر کچھ دیر اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے ان کے درمیان دوستانہ بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ چونکہ صغیر کا ذہن بیدار ہو گیا تھا اس لئے اس کے جذبات بھڑک اٹھے۔ اس نے ڈاکٹر رشید کو بتایا کہ اس نے سنا ہے کہ ہندو تخریب کار پاکستان میں جا کر کیسی کیسی تباہ کاریاں کرتے ہیں لیکن پاکستان کی حکومت

ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی۔

"ایک بات کہتا ہوں صغیر بھائی!" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا —— "ہر کام حکومت پر ڈال دینا ہی ٹھیک نہیں ہوتا۔ اگر عوام میں سے ہر آدمی اپنے آپ کو پاکستان کا محافظ سمجھے تو وہ بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن ہم جب سنتے ہیں کہ انڈین انٹیلی جنس کے ایجنٹ پاکستانی بھی ہیں اور پاکستانی بڑی آسانی سے ہندوؤں کے ایجنٹ بن جاتے ہیں تو شرم سے ہمارے سر جھک جاتے ہیں اور ہم ایسے پاکستانیوں پر لعنت بھیجتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ ایسے مسلمانوں کو زمین کے تختے سے اٹھا لے جو تیرا نام لے کر تیرے دشمنوں کا ساتھ دیتے ہیں"۔

صغیر کا سر جھک گیا جیسے اسے نیند آ رہی ہو یا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں کھو گیا ہو۔ ڈاکٹر رشید کوئی بات کر رہا تھا لیکن صغیر پر خاموشی طاری تھی۔ اس کے منہ سے ہوں یا ہاں بھی نہیں نکلتی تھی۔ ڈاکٹر رشید نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر سر اوپر اٹھایا تو اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔

"کیوں صغیر صاحب!" —— ڈاکٹر رشید نے پوچھا —— "کیا بات ہے؟ .... میں اچھی طرح جانتا ہوں آپ کیا محسوس کر رہے ہیں۔ آخر آپ بھی ہندوستانی مسلمان ہیں"۔

"نہیں!" —— صغیر نے دبی دبی سی آواز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے —— "ڈاکٹر صاحب! میں اگر آپ سے کہوں کہ میں ہندوستانی نہیں' پاکستانی ہوں تو آپ کیا کہیں گے؟"

"میں کیا کہوں گا؟" —— ڈاکٹر نے کہا —— "ایک تو میں خوشی کا اظہار کروں گا کہ مجھے ایک پاکستانی بھائی کی خدمت کا موقع ملا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ آپ میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور پھر میں آپ سے یہ بھی پوچھوں گا کہ آپ کو وی آئی پی ٹریٹ منٹ کیوں دیا جا رہا ہے۔ یہ میں اس لئے پوچھوں گا کہ یہاں کوئی پاکستانی آ جائے تو اسے مشتبہ اور جاسوس سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ پاکستان میں اس کی سوشل یا سرکاری حیثیت کیا ہے۔ یہاں اس کے پیچھے سی آئی ڈی لگی رہتی ہے۔ آپ کوئی خاص پاکستانی لگتے ہیں۔ صغیر بھائی!...."

"ڈاکٹر صاحب!" —— صغیر نے ہاتھ اٹھا کر ڈاکٹر کو آگے بولنے سے روک دیا —— "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں خاص قسم کا پاکستانی ہوں" —— صغیر کی آواز دب گئی۔ گھونٹ

سنگل کراس نے کہا ـــ "میں جذباتی آدمی ہوں۔ آپ مجھے ذہنی مریض بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی باتیں سنیں تو یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو..... میں آپ کو اپنا مونس اور غمگسار سمجھ کر بتاتا ہوں کہ میرا تعلق انڈین انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔ یوں کہہ لیں کہ میں انڈین انٹیلی جنس کا پاکستانی ایجنٹ ہوں۔ بارڈر کراس کرتے ہوئے پاکستانی رینجرز نے گولی چلا دی تھی اور ایک گولی مجھے لگی"۔

ڈاکٹر عبدالرشید پر سکتہ طاری ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہو اور اس کی آنکھیں جھپکنے سے قاصر رہ گئی ہوں۔ وہ بُت بنا کھڑا رہا اور اس کی نظریں صغیر کے چہرے پر جمی رہیں۔

"کیوں ڈاکٹر صاحب!" ـــ صغیر نے ڈاکٹر کو بیدار کر دیا اور کہا ـــ "میں جانتا ہوں آپ میرے متعلق کیا سوچ رہے ہیں۔ آپ کے دل میں میری محبت پیدا ہو گئی تھی جو آن واحد میں نفرت میں بدل گئی ہے"۔

"نہیں صغیر بھائی!" ـــ ڈاکٹر رشید نے بیدار ہو کر کہا ـــ "محبت' محبت ہی رہے گی' نفرت میں نہیں بدلے گی۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ نے یہ راز مجھے کیوں دیا ہے"۔

"صرف اس لئے ڈاکٹر صاحب!" ـــ صغیر نے کہا ـــ "آپ نے مجھے ٹرانکولائزر انجکشن دینے بند کر دیئے تھے۔ ایک تو یہ وجہ ہوئی کہ میرا دماغ واپس میرے قبضے میں آ گیا۔ پھر آپ نے مجھے یہاں کے مسلمانوں کی حالتِ زار سنائی تو میرے اندر ایمان بیدار ہو گیا۔ اس سے پہلے خالدہ نرس مجھے یہی باتیں سنا چکی تھی اور میرا خون کھول رہا تھا۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے"۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" ـــ ڈاکٹر رشید نے کہا ـــ "میں آپ کی خدمت کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں اور جب تک آپ یہاں ہیں میں اور زیادہ خلوص اور پیار سے آپ کی خدمت کروں گا"۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" ـــ صغیر نے کہا ـــ "یہ نہیں۔ جس مدد کی مجھے ضرورت ہے وہ شاید آپ نہ کر سکیں نہ ہی میں آپ کو اتنے سخت بلکہ اتنے خطرناک امتحان میں ڈالنا چاہتا ہوں"۔

"آپ بات تو کریں" ـــ ڈاکٹر رشید نے کہا ـــ "میں ہوں تو ڈاکٹر لیکن آپ سے

بڑھ کر جذباتی ہوں۔ مجھے بتائیں آپ کو کیسی مدد کی ضرورت ہے"۔

"میں واپس پاکستان جانا چاہتا ہوں" ـــ صغیر نے کہا ـــ "بارڈر کراس کرنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں۔ مجھے کسی طرح بارڈر کے پاس پہنچا دیا جائے۔ بارڈر خود کراس کر لوں گا۔ بہت ہُوا تو یہی ہو گا کہ پاکستانی رینجرز دیکھ لیں گے اور گولی مار دیں گے۔ مجھے خوشی ہو گی۔ میں کسی پاکستانی کی گولی سے مرنا پسند کروں گا اور اگر میں سرحد سے آگے خیریت سے نکل گیا تو میں اپنے گناہوں کا کفارہ اس طرح ادا کروں گا کہ پاکستان میں انڈیا کے جاسوسوں اور تخریب کاروں کا ایک رنگ پکڑوا دوں گا .... مجھے بارڈر تک پہنچا دیں"۔

ڈاکٹر گہری سوچ میں کھو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ صغیر کی نظریں اس کے ساتھ ساتھ گھومتی رہیں۔

"صغیر بھائی!" ـــ ڈاکٹر نے کہا ـــ "یہ صورت حال میرے لئے اتنی مشکل ہے کہ میں اسے ناممکن بھی کہہ سکتا ہوں۔ سرحد انبالہ سے بہت دور ہے لیکن میں آپ کو یہ جواب کبھی نہیں دوں گا کہ میں آپ کی یہ مدد نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی مدد کروں گا۔ میں آپ سے بڑھ کر جذباتی ہوں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ ہم مسلمانوں نے یہاں کے معاشرے کو قبول کر لیا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے دل کی گہرائی سے اس ہندو معاشرے کو قبول کیا ہے تو اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہو گا۔ میں نہیں بھول سکتا کہ میں مسلمان ہوں اور میں یہ بھی نہیں بھول سکتا کہ یہاں مسلمان ہی نہیں بلکہ اسلام بھی غلام ہو گیا ہے۔ میں اکیلا یا ہم بکھرے ہوئے' کچلے اور مسلے ہوئے مسلمان کیا کر سکتے ہیں۔ میں اگر آپ کو سرحد تک پہنچا دوں اور آپ پاکستان جا کر انڈین انٹیلی جنس کو یہ کاری ضرب لگائیں کہ اس کا ایک رِنگ پکڑوا دیں تو اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں اس کارِ خیر میں شامل ہوں گا اور ضرور ہوں گا"۔

"آپ مجھے امرتسر تک تو پہنچا سکتے ہیں؟" ـــ صغیر نے کہا ـــ "میں امرتسر سے پیدل چل پڑوں گا اور راوی میں اُتر جاؤں گا"۔

"میں آپ کو کسی خطرے میں نہیں ڈالوں گا نہ میں آپ کو کوئی مشورہ دوں گا" ـــ ڈاکٹر رشید نے کہا ـــ "مشورہ دینے والے اور آپ کا ساتھ دینے والے آدمی موجود ہیں..... مجھے کچھ سوچنے دیں .... لیکن صغیر بھائی! اس کی کیا گارنٹی ہے کہ میں آپ سے

محفوظ رہوں گا؟"

"آپ سے کا کیا مطلب؟" — صغیر نے پوچھا۔

"مطلب یہ" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "کہ آپ میرے خلاف یہی رپورٹ نہ دے دیں کہ اس ڈاکٹر کو یہاں سے نکالو کیونکہ اس کے دماغ میں پاکستانی جراثیم موجود ہیں"۔

صغیر نے چونک کر ڈاکٹر عبدالرشید کی طرف دیکھا۔ دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر دیکھتے ہی دیکھتے صغیر کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ڈاکٹر اسے چپ چاپ دیکھتا رہا۔

"کیا میں اس قدر ذلیل اور کمینہ سمجھ لیا گیا ہوں؟" — صغیر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا — "آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب! یہ خصلت ہندوؤں کی ہے جو آپ کو شک ہے کہ میری بھی ہوگی۔ مجھے اپنی اس حالت پر افسوس ہو رہا ہے اور شرم بھی آ رہی ہے کہ میں دھتکارا ہوا لعنتی انسان بن گیا ہوں .... میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں آپ کو دھوکا نہیں دے رہا۔ آپ کو دھوکا دے کر مجھے حاصل بھی کیا ہوگا۔ مجھے تو بہت بڑے بڑے ٹارگیٹ دیئے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے ڈاکٹر صاحب! انڈین انٹیلی جنس کا ٹارگیٹ پورا پاکستان ہے۔ میری حالت ایک گولی کی سی ہے جو ہندوؤں کی بندوق سے نکلتی ہے اور پاکستان کے وجود میں اُتر جاتی ہے لیکن میں جاگ اٹھا ہوں ڈاکٹر رشید صاحب! میں جاگ اٹھا ہوں، مجھے پاکستان پہنچا دیں۔ سرحد تک پہنچا دیں"۔

"پہنچا دوں گا" — ڈاکٹر نے کہا — "سرحد تک پہنچانے سے پہلے میں آپ کو اپنے گھر پہنچاؤں گا۔ کچھ دن آپ کو میرے گھر میں چھپا کر رکھا جائے گا۔ یہاں یہ ظاہر کیا جائے گا کہ آپ یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔ میرے تین چار مسلمان دوست ہیں۔ وہ ہماری مدد کریں گے۔ آپ کو میں صرف اپنے گھر ہی نہیں رکھوں گا۔ ایک ایک دو دو راتیں میرے دوست آپ کو اپنے اپنے گھر رکھیں گے .... پہلے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بات کر لوں۔ آپ نے یہ کام کرنا ہے کہ جب بڑے ڈاکٹر آپ کو دیکھنے آئیں تو آپ یہ شکایت کریں کہ زخم میں آپ کو درد مسلسل رہتا ہے اور چلنے میں درد اور بڑھ جاتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہو گا کہ آپ کو ہسپتال میں کچھ دن اور ٹھہرنے کا بہانہ مل جائے گا اور دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ آپ کا تعاقب بہت دیر بعد شروع ہو گا۔ پہلے تو

آپ کو ہسپتال میں ہی ڈھونڈتے رہیں گے۔ کوئی مانے گا ہی نہیں کہ جو مریض اچھی طرح چل نہیں سکتا وہ فرار ہو گیا ہے۔ بہرحال آپ مطمئن رہیں۔ میں آپ کو یہاں سے نکالوں گا.... آپ کو انڈیا میں کیوں لایا گیا ہے؟"

"میری اپنی خواہش تھی کہ میں انڈیا کی سیر کروں" — صغیر نے جواب دیا — "یہ لوگ مجھے خوش کر رہے ہیں اور یہاں میری کچھ اور ٹریننگ کریں گے اور پھر مجھے کوئی بہت بڑا مشن دے کر پاکستان بھیج دیں گے"۔

"کیا آپ نے بہت جاسوسی کی ہے؟" — ڈاکٹر عبدالرشید نے پوچھا۔

"جاسوسی نہیں" — صغیر نے کہا — "میرا کام تخریب کاری ہے۔ میں نے کئی جگہوں پر دھماکے کئے ہیں .... مت پوچھیں ڈاکٹر صاحب! تخریب کاری کی کئی قسمیں ہیں" — صغیر ذرا سا چپ ہو کر جھنجھلایا اور بولا — "مت پوچھیں ڈاکٹر صاحب! میں قاتل ہوں۔ خدا مجھے معاف نہیں کرے گا۔ میرا اپنا سگا بھائی میرے ایک ساتھی تخریب کار کے دھماکے کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ میں اس بھائی کی روح کا سامنا نہیں کر سکتا۔ میں اب گناہوں کا کفارہ ادا کروں گا"۔

ڈاکٹر نے دیکھا کہ صغیر کے چہرے پر اذیت کے بڑے نمایاں اور واضح تاثرات چھا گئے تھے اور اس کے بولنے کے انداز میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ روحانی اذیت میں مبتلا ہے۔ ڈاکٹر نے بہتر سمجھا کہ صغیر کے ساتھ اس موضوع پر باتیں نہ کی جائیں۔

"صغیر بھائی!" — ڈاکٹر نے کہا — "آپ مسلمان ہیں۔ آپ نے قرآن میں پڑھا ہوگا کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے، کریم ہے۔ آپ نے سچے دل سے توبہ کر لی ہے تو میں نے آپ کی کیا مدد کرنی ہے، آپ کی مدد تو اللہ کرے گا۔ میں اللہ سے دعا مانگوں گا کہ آپ کی مدد کا ذریعہ اور سبب مجھے بنائے۔ یہ سعادت مجھے ملے تو میری روح کو سکون آ جائے گا.... میں آج رات اپنے دوستوں سے، اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی سے بات کروں گا۔ وہ یقیناً" مدد کریں گے اور کل رات ہو سکتا ہے، میں آپ کو یہاں سے نکال کر لے جاؤں"۔

"میں ہر مشکل اور مصیبت میں جانے کے لئے تیار ہوں" — صغیر نے کہا — "لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ جہاں میں نے دیکھا کہ آپ یا یہاں کا کوئی بھی مسلمان

میری وجہ سے پھنس رہا ہے تو میں اپنے آپ کو پیش کر کے سب کی سزا اپنے ذمے لے لوں گا"۔

"اللہ مالک ہے صغیر بھائی" ــــ ڈاکٹر نے کہا ــــ "میں نے آپ کے کمرے میں ضرورت سے زیادہ وقت گذار دیا ہے۔ مجھے چلنا چاہیئے"۔

ڈاکٹر کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد خالدہ نرس آگئی اور صغیر کا بلڈ پریشر وغیرہ چیک کرنے لگی۔

"کیا بات ہے صغیر صاحب!" ــــ خالدہ نے پوچھا ــــ "آپ کا بلڈ پریشر تھوڑا سا اوپر ہو گیا ہے"۔

"یہ تو ہونا ہی تھا" ــــ صغیر نے کہا ــــ "تمہاری باتیں سن کر خون کھول اٹھا ہے۔ یہ اسی کا اثر ہے .... ایک بات بتاؤ خالدہ! یہ ڈاکٹر عبدالرشید کیسا آدمی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ ذاتی طور پر کیسا آدمی ہے۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے تو یہ بہت ہی اچھا آدمی ہے"۔

"پہلے یہ بتائیں" ــــ خالدہ نے پوچھا ــــ "کہ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ویسے ہی" ــــ صغیر نے جواب دیا ــــ "ان کا میرے ساتھ سلوک اتنا اچھا ہے کہ میں اس شخص سے بہت ہی متاثر ہُوا ہوں"۔

"رشید بہت اچھا آدمی ہے" ــــ خالدہ نے کہا ــــ "پیارا آدمی ہے۔ میری شادی اسی سے ہو گی"۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے خالدہ!" ــــ صغیر نے کہا ــــ "ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ میجر ڈاکٹر تمہیں اپنے کمرے میں بلا کر پیار و محبت کرتا ہے۔ اگر ڈاکٹر رشید کو اس کا علم ہو گیا تو پھر یہ آپ کے ساتھ شادی نہیں کرے گا"۔

"رشید کو معلوم ہے" ــــ خالدہ نے کہا ــــ "اور رشید اسی وجہ سے میرے ساتھ شادی کر رہا ہے۔ شادی ہوتے ہی میں سروس چھوڑ دوں گی۔ رشید نے مجھے یہاں سے آزاد کرانے اور میری عزت بچانے کا یہ طریقہ سوچا ہے کہ مجھے اپنی بیوی بنا رہا ہے۔ یقین کرنا صغیر صاحب! رشید کو ایک مسلمان لڑکی کے والدین کے پیغام ملے ہیں۔ یہ لڑکی ایم بی بی ایس ہے، مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ آج کل ہاؤس جاب کر رہی ہے لیکن ڈاکٹر رشید نے اسے قبول نہیں کیا اور مجھے میری عزت بچانے کی خاطر قبول کر لیا ہے۔

رشید امیر ماں باپ کا بیٹا ہے۔ یہ جانتا ہے کہ میرے گھر کے مالی حالات کتنے خراب ہیں۔ اگر میں نوکری نہ کروں تو میری ماں کا علاج نہ ہو اور میرے بھائی تعلیم بھی حاصل نہ کر سکیں۔ رشید نے مجھے کہا ہے کہ میرے گھر کی یہ ذمہ داریاں وہ سنبھالے گا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ مسلمانوں اور اسلام کے متعلق رشید کتنا جذباتی ہے اور ہر طرح کی قربانی دے سکتا ہے"۔

○

جب صغیر انبالہ ہسپتال سے فرار کی تیاری کر رہا تھا اُس وقت میجر عثمان کراچی میں ایک کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ لُوسی بیٹھی تھی۔ کچھ دیر پہلے ان کے پاس دو آدمی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ لُوسی نے عثمان کا تعارف ان کے ساتھ کرایا تھا۔ وہ دونوں کراچی کے مسلمان تھے۔ وہ لوسی اور عثمان کو اکیلا چھوڑ کر اٹھ گئے تھے۔

عثمان اپنی بیوی وینا اور بچّوں کے ساتھ کراچی کی سیر کو آیا تھا لیکن راستے میں یہ پوری فیملی اغوا ہو گئی اور لُوسی نے انہیں رہا کروایا اور کراچی پہنچ کر عثمان نے ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا تھا۔ لُوسی اس کمرے تک اس کے ساتھ گئی تھی اور پھر انہوں نے خفیہ طریقے سے اگلے روز ملاقات کا وقت طے کر لیا تھا۔ اس طرح عثمان اگلے روز اُس کوٹھی میں پہنچ گیا تھا جہاں لوسی رہتی تھی۔

"اب بتاؤ لوسی!" ــــ میجر عثمان نے پوچھا ــــ "تم سندھ کے اتنے دور دراز صحرائی علاقے میں کہاں اور کیوں جا پہنچی تھیں؟"

"تم مانو گے نہیں" ــــ لُوسی نے اپنا ایک بازو عثمان کی گردن کے گرد لپیٹ کر اور اپنا ایک گال عثمان کے گال کے ساتھ لگا کر کہا ــــ "میں تمہیں کبھی ایک لمحے کے لئے بھی دل سے نہیں اتار سکی۔ ظاہری طور پر تو یہ ہُوا کہ میں نے یہاں اپنے عزیزوں سے خواہش ظاہر کی کہ میں سندھ کا دیہاتی علاقہ دیکھنا چاہتی ہوں لیکن عثمان! یقین کرنا کہ اس خواہش کے ساتھ تم یوں میرے سامنے آگئے تھے جیسے میں ہاتھ آگے کروں گی تو تمہیں چُھو لوں گی۔ تم تصوّر نہیں بلکہ ایک حقیقت بن کر میرے سامنے آگئے تھے۔ میرا دل کہتا تھا کہ تم کسی مصیبت میں پھنس گئے ہو اور مجھے تمہاری مدد کو پہنچنا چاہیئے۔ اسے کہتے ہیں روحانی محبت۔ تم مانو نہ مانو، میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ تمہاری محبت میری روح میں اتری ہوئی ہے"۔

"میں یہ مان لیتا ہوں کہ تم نے میری محبت کو اپنی روح میں اتار رکھا ہے"۔
عثمان نے کہا ـــــ "لیکن میں یہ نہیں مانوں گا کہ تم سندھ کا اندرونی علاقہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ میری اور تمہاری کلاس کی کوئی لڑکی ایسی خواہش نہیں کرے گی کہ جس علاقے میں ڈاکوؤں کی حکمرانی ہو اور جہاں آئے دن لڑکیاں بھی، بچے اور جوان بھی اغوا ہو رہے ہوں وہاں کی سیر کا پروگرام بنالے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اتنے بڑے ڈاکو نے تمہارا یہ حکم مان لیا کہ وہ مجھے رہا کر دیں اور اس نے ہمیں رہا کر دیا۔ تم اگر صرف سیر کے لئے وہاں گئی ہوتیں تو وہاں تمہارا حکم نہ چلتا بلکہ تم خوف سے کانپ کانپ کر بے ہوش ہو جاتیں... مجھے صحیح بات بتاؤ لُوسی ورنہ میں سمجھوں گا کہ یہ جو تم محبت محبت کی رٹ لگا رہی ہو یہ محض دھوکا ہے"۔

لُوسی نے بہت کوشش کی کہ اپنے اوپر پردہ ڈالے رکھے لیکن عثمان اس کے پیچھے پڑا رہا۔ سندھ کے اندرونی علاقے میں ان کی ملاقات ایسی تھی کہ لوسی اب اپنے آپ پر کوئی پردہ نہیں ڈال سکتی تھی۔ اپنا پردہ اٹھانے کی بجائے لوسی نے پیار و محبت اور عریاں حرکتوں سے عثمان کی عقل پر پردہ ڈالنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ عثمان کو اس طرح چاٹ رہی تھی جیسے کسی ماں کو گمشدہ بچہ مل گیا ہو۔

عثمان کوئی زاہد اور پارسا نہ تھا۔ وہ امیر کبیر باپ کے گھر میں پیدا ہُوا تھا اور ڈسکو سوسائٹی میں پل کر جوان ہُوا اور عیش و عشرت کے سوا اس نے کچھ سیکھا نہ تھا۔ فوج میں اسے صرف افسر بننے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس کی شخصیت میں اتنی قوتِ مدافعت نہیں تھی کہ وہ اتنے زیادہ حسین اور دلکش بلکہ طلسمِ ہوش ربا جیسے فریب کو قبول نہ کرتا۔ اس کی سوئی ہوئی حسیں بیدار ہو گئیں۔ یہ وہی حسیں تھیں جو عثمان کو لوسی کے جال میں لے گئی تھیں۔ وہ بے خود ہوتا چلا گیا۔

"اوہ!" ـــــ لوسی نے چونک کر کہا ـــــ "کافی تو ٹھنڈی ہو رہی ہے"۔
اس وقت عثمان صوفے پر دراز تھا۔ لُوسی اس سے ذرا الگ ہوئی اور اس نے کافی کی ٹرالی اپنی طرف گھسیٹی اور بیٹھ عثمان کی طرف کر لی۔ اس طرح وہ عثمان کی آنکھوں اور ٹرالی کے درمیان آ گئی۔ ٹرالی پر جو نیپکن رکھے تھے، لوسی نے ان میں سے ایک کی تہوں کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ایک گولی اس کے ہاتھ میں آ گئی جو اس نے بڑی تیزی سے ایک پیالی میں رکھ دی اور اس پیالی میں کافی ڈالی پھر ایک اور پیالی میں کافی ڈالی۔

"چینی کتنی پیؤ گے؟" ـــــ لوسی نے عثمان سے پوچھا ـــــ "اتنی ہی پیتے ہو یا کچھ کم کر دی ہے؟"
"اتنی ہی ڈال دو" ـــــ عثمان نے کہا۔
لوسی نے اس پیالی میں چینی ڈالی جس میں اس نے پہلے ایک گولی ڈالی تھی۔ خود ہی چمچے سے ہلا کر اس نے یہ پیالی عثمان کی طرف بڑھائی۔ عثمان جو صوفے پر لیٹا ہُوا تھا، اٹھ بیٹھا اور اس نے پیالی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر دونوں کافی پینے لگے۔
"وینا تو بڑی خوبصورت لڑکی ہے" ـــــ لوسی نے کہا ـــــ "مجھے تو اپنا دشمن سمجھتی ہوگی"۔
"سمجھتی رہے" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "میں اسے دھتکار بھی تو نہیں سکتا"۔
لوسی نے وینا کے متعلق بچ بچ کر باتیں پوچھنی اور کہنی شروع کر دیں۔ کبھی وہ اس کی تعریف کر رہی ہوتی اور کبھی عثمان کو خبردار کر رہی ہوتی کہ وہ وینا پر اتنا زیادہ بھروسہ بھی نہ کرے۔ وہ کہتی تھی کہ اس کے اغوا میں یقیناً" وینا کا ہاتھ بھی تھا۔
میجر عثمان اس کی ان باتوں سے دو حصوں میں کٹتا جا رہا تھا۔ کبھی تو وہ وینا کے حق میں ہو جاتا اور کبھی خود ایک دو باتیں وینا کے خلاف کہہ گزرتا۔ اتنے میں وہ گولی جو لوسی نے کافی میں ڈالی تھی، اثر دکھانے لگی۔ اس کے ساتھ لوسی اپنے حسن و شباب کا جادو چلانے لگی۔ عثمان پر لوسی کا طلسم طاری ہو گیا اور وہ سو فیصد لوسی کے حق میں اور وینا کے خلاف ہو گیا۔
یہ شراب، چرس یا ہیروئن جیسا نشہ نہیں تھا کہ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا۔ اس گولی نے میجر عثمان کے ذہن کو سلا دیا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس گولی کے ذریعے لوسی نے اس کے ذہن پر قبضہ کر لیا تھا۔
"اب بتاؤ" ـــــ عثمان نے لوسی سے پوچھا ـــــ "تم وہاں کیوں گئی تھیں؟"
"دیکھو عثمان!" ـــــ لوسی نے بڑے پیارے انداز میں کہا ـــــ "میں آج تم پر ایک راز فاش کر رہی ہوں۔ یہ راز سن کر تمہیں اندازہ ہو گا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ میں کوئی بات تم سے چھپا نہیں سکتی.... میرا تعلق انڈیا کی انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔ تم نے 'را' کا لفظ تو سنا ہو گا"۔
"ہاں ہاں" ـــــ عثمان نے قدرے چونک کر کہا ـــــ "فوجی افسر ہو کر میں اگر اس نام

سے واقف نہیں تو میں فوجی افسر بھی نہیں۔ کیا تمہارا تعلق را کے ساتھ ہے؟"

"ہاں عثمان!" — لوسی نے جواب دیا — "میرا تعلق را کے ساتھ ہے..... اور تمہارا تعلق بھی را کے ساتھ ہے"۔

"میرا کیوں؟"

"کیا میں اور تم دو انسان ہیں؟" — لوسی نے عثمان کو اپنے قریب کرتے ہوئے — "تمہیں یاد ہو گا کہ ایک دو مرتبہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم شہزادے ہو لیکن تم ملک میں پیدا ہوئے ہو۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں تمہیں صحیح معنوں میں شہزادہ چاہتی ہوں لیکن میں یہ نہ بتا سکی کہ میں تمہیں کس طرح شہزادہ بناؤں گی۔ وہ اب بتا رہی ہوں۔ یہ تو تم نے کئی بار کہا تھا کہ تم کسی جذبے کے تحت فوج میں نہیں گئے تھے تمہارے ڈیڈی تمہیں فوجی افسر بنانا چاہتے تھے کیونکہ وہ خود انگریزوں کی فوج کے اف تھے"۔

"ہاں ہاں" — عثمان نے کہا — "مجھے یہ سب باتیں یاد ہیں۔ تم بتاؤ کہنا کیا چاہتی ہو۔ اپنا مطلب بیان کرو"۔

"تمہارے ہاتھ میں خزانہ ہے" — لوسی نے کہا — "یہ ایسا خزانہ ہے جو کبھی نہیں ہوتا۔ تم اس میں سے جتنا بھی خرچ کرو گے اس سے زیادہ پاؤ گے"۔

لوسی نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ انڈین انٹیلی جنس کا ایجنٹ بن جائے تو اسے کرنا ہو گا اور اسے اس کا کتنا معاوضہ ملے گا۔ دولت کے ساتھ دنیا کی بہترین شراب او انتہائی حسین اور دلکش لڑکیاں ملیں گی۔ لوسی کا ایک ایک لفظ عثمان کے دل میں اتر رہا تھا۔ یہ اس نشے کا اثر تھا جو لوسی نے اس پر طاری کر دیا تھا۔ یہ ایسا نشہ تھا جو میجر عثمان جیسی شخصیتوں پر ہی طاری ہوا کرتا ہے کیونکہ یہ لوگ ایسے ہی نشے کے متلاشی اور ہوتے ہیں۔ یہ ایسی کمزور شخصیتیں ہوتی ہیں جو اس قسم کی دلکش لڑکیوں کی سحر انگیز باتیں سن کر اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول جاتے ہیں۔ لوسی تو اس فن کی ماہر تھی۔ قدرت نے اسے ہر اس ہتھیار سے لیس کر رکھا تھا جو عثمان جیسے آدمیوں کو ذرا سی کوشش میں گھائل کر دیا کرتا ہے۔

لوسی کا حسن کوئی غیر معمولی حسن نہیں تھا۔ اس ملک میں اس سے کہیں زیادہ حسین لڑکیاں موجود تھیں۔ وینا ہی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ لوسی سے کہیں زیادہ حسین

لیکن وینا ایک زنجیر تھی' ایک رکاوٹ تھی اور وہ ایک حقیقت تھی اور پھر اس میں یہ تھی کہ اس نے دو بچے جن کر عثمان کو کچھ ذمہ داریوں میں جکڑ دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں لوسی اس فن کی ماہر تھی جو ایک نظر میں ذمہ داریوں کی بڑی مضبوط زنجیریں توڑ دیا کرتا ہے۔ اس کے پاس لذّت تھی اور فرار کے راستے تھے۔ اداکاری ایسی جس پر حقیقت اور قدرتی بے ساختگی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ جب جذباتی ہوتی تھی تو عثمان تو کچھ بھی نہیں تھا' ریت کی ڈھیری تھی' کسی زاہد اور پارسا کی بھی قسمیں ٹوٹ جاتی تھیں۔

ڈرائنگ روم کے بند دروازے کے اندر نرم و گداز صوفے پر لوسی نے اپنے جسم کا اور اپنی زبان کا جو جادو چلایا اس نے میجر عثمان کو اس کے جسم میں جذب کر دیا۔ عثمان ہپناٹائز ہو چکا تھا۔ لوسی ایک حسین خواب تھا جس سے کوئی بیدار نہیں ہونا چاہتا۔

لوسی پہلے مرحلے میں کامیاب تھی۔ اب اس نے دوسرے مرحلے کا آغاز کیا۔ وہ اس طرح کہ عثمان کو آہستہ آہستہ حقیقت کی طرف لانے لگی۔

"یہ خیال رکھنا عثمان!" — لوسی نے کہا — "وینا کو شک نہ گزرے کہ میں تمہیں کسی اور راستے پر لے جا رہی ہوں۔ اچھا ہوا کہ اس کے ساتھ میرا تعارف ہو گیا ہے۔ تم جتنے دن یہاں ہو میں اسے اپنے قریب کرنے کی پوری کوشش کروں گی لیکن یہ خیال رکھنا کہ وہ تمہیں گمراہ کرے گی"۔

"کیا تم لاہور واپس آ جاؤ گی؟" — میجر عثمان نے لوسی سے پوچھا۔

"آخر وہیں آنا ہے" — لوسی نے جواب دیا — "لیکن اتنی جلدی نہیں آؤں گی کیونکہ وہاں میرے لئے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہاں میں پہچانی گئی ہوں۔ وینا کے بھائی اور تمہارے فوجی دوست مجھے پکڑوا دیں گے"۔

"ایک بات بتاؤ" — عثمان نے پوچھا — "کیا تمہیں واقعی وینا کے بھائیوں اور میرے فوجی دوستوں نے اغوا کیا تھا؟"

"ہاں" — لوسی نے جواب دیا — "انہوں نے ہی اغوا کیا تھا اور وہ اس کمرے میں میرے پاس آئے بھی تھے"۔

"اب یہ بتاؤ" — عثمان نے پوچھا — "کیا انہوں نے واقعی تمہاری آبروریزی کی تھی؟"

"نہیں، عثمان!" — لوسی نے جواب دیا — "اب جبکہ تم میرے ساتھی بن گئے

ہو؛ میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی کوئی بیہودہ حرکت نہیں کی تھی۔ میرے جسم کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا البتہ اس نوکر کو میں نے اپنے جرم رشوت دی تھی جس نے مجھے وہاں سے نکالا تھا۔ اس کے بغیر میں وہاں سے نکل نہیں سکتی تھی"۔

"وہ نوکر کہاں گیا؟"

"اس کی تو ہڈیاں بھی خاک ہو چکی ہوں گی" ـــ لوسی نے جواب دیا ـــ "میرے آدمی اس کی لاش نہر میں پھینک آئے تھے اور یہ قتل اس طرح ہضم ہو گیا جس طرح پاکستان میں لوگ قتل ہوتے ہیں اور قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا.... عثمان! ہم یہ طاقت تمہیں بھی دیں گے۔ تم جسے چاہو قتل کرو گے اور پکڑے نہیں جاؤ گے۔ میں ایک بار تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ اپنے دوستوں سے بچ کے رہنا وہ مخلص اور سچے پاکستانی ہیں کہیں ایسا نہ ہو تم بھولے پن میں انہیں اپنا راز دے دو اور پھنس جاؤ"۔



عثمان جب واپس ہوٹل میں آیا تو اس کی چال ڈھال میں کچھ اور ہی جوش اور کچھ اور ہی انداز تھا۔ وینا کو اس نے گلے لگا لیا لیکن اس پر ایسی کیفیت طاری تھی کہ وینا کے جسم سے اُسے لُوسی کے جسم کی بُو آتی تھی۔ وہ ابھی تک وہی خواب دیکھ رہا تھا جو اسے لُوسی نے دکھائے تھے۔

"کیا کر کے آئے؟" ـــ وینا نے پوچھا ـــ "لوسی ملی؟"

"ہاں" ـــ عثمان نے جواب دیا ـــ "اُسی کے پاس بیٹھا رہا ہوں لیکن اتنی چالاک لڑکی ہے کہ اس نے پتہ نہیں چلنے دیا کہ وہ سندھ کے اتنے دور دراز علاقے میں کیوں گئی تھی لیکن وینا میں اس کی اصلیت معلوم کر کے ہی رہوں گا"۔

میجر عثمان لوسی کے خلاف باتیں کرتا رہا۔ وہ دراصل وینا کو دھوکا دے رہا تھا لیکن ہوا یہ کہ باتیں کرتے کرتے وہ حقیقی طور پر لوسی کے خلاف ہو گیا جیسے وہ اچانک مخلص پاکستانی بن گیا ہو۔ اپنے دشمن ملک کا جاسوس بن جانا ایسا اقدام نہیں کہ ضمیر اسے فوراً قبول کر لیتا۔ ہوٹل کے کمرے میں جب اپنی بیوی اور معصوم بچوں میں وہ بیٹھا ہوا تھا تو اسے محسوس ہوا جیسے یہ معصوم بچے اس پر طنز کر رہے ہوں کہ یہ دیکھو ہندوؤں کا جاسوس بیٹھا ہے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے معصوم بچوں پر بمباری اور توپوں کی گولہ باری کروا رہا

ہے۔ اس کی شخصیت جو دراصل پہلے ہی کٹی پھٹی تھی، دو حصوں میں بٹ گئی اور اس کے اندر ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ ایک حصے پر لوسی غالب تھی اور دوسرے پر وینا اور دو معصوم بچے۔ وہ اپنے آپ میں بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔

"کیوں!" ـــ وینا اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بڑے پیار سے پوچھا ـــ "کچھ پریشان سے دکھائی دیتے ہیں"۔

"نہیں تو!" ـــ عثمان نے سر جھٹک کر جواب دیا اور اپنے چہرے پر خوشگوار سا تاثر پیدا کر لیا۔ وینا کو اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے کر بولا ـــ "تم ہو تو پریشانی کیسی!"

"یہ تو آپ نے ضرور سوچا ہو گا" ـــ وینا نے کہا ـــ "کہ ہمارے ساتھ جو واقعہ ہوا ہے یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ ایک فوجی افسر کا پوری فیملی کے ساتھ اغوا ہو جانا اور وہ بھی اپنے ہی ملک میں۔ یہ اخباروں میں آنے والی خبر ہے اور اس خبر سے جی ایچ کیو اور گورنمنٹ کے حلقوں میں تہلکہ برپا ہو جانا چاہئے۔ سندھ انڈیا کا صوبہ تو نہیں، پاکستانی علاقہ ہے۔ میں اس قسم کے اغوا اور ڈاکوؤں کی خبریں پڑھتی رہی ہوں لیکن جب میں خود اغوا ہوئی تو احساس ہُوا کہ یہ معاملہ کتنا تشویشناک ہے۔ اس کے ساتھ ایک جوان سال لڑکی کا وہاں جانا اور ایک اشارے سے ہمیں رہا کرا لینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ایک روز سندھ بڑے آرام سے انڈیا کا صوبہ بن جائے گا اور یہاں جتنے پاکستانی یعنی غیر سندھی ہوں گے وہ سب مشرقی پاکستان کی طرح انڈیا کے قیدی ہوں گے۔ ذرا غور کرو عثمان! کہ یہ معاملہ کس قدر سنگین ہے۔ اس لوسی کو گرفتار کروانا ہے اور آپ یہ معاملہ اپنے آپ تک ہی محدود نہ رکھیں۔ ہماری جانیں اور عزت تو بچ گئی ہے۔ یہ سوچیں کہ پاکستان کس خطرے میں آیا ہُوا ہے۔ ہم اپنی ذاتی عزت، جان اور مال پاکستان پر قربان کر سکتے ہیں اور کرنا چاہئے"۔

عثمان یوں وینا کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے چھوٹا سا کوئی بچہ جو کچھ سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو بات کرنے والے کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہو یا جیسے کوئی احمق ہو اور دانشور کی بات سمجھنے کی کوشش نہ کرتے ہوئے سن رہا ہو۔

عثمان پر لُوسی نے جو نشہ طاری کر دیا تھا وہ اُتر رہا تھا اور اب اس پر وہ کیفیت طاری ہو رہی تھی جو نشہ اُترنے کے بعد ہُوا کرتی ہے اور جو ڈیپریشن سے ملتی جلتی ہے۔ آہستہ

آہستہ آہستہ عثمان کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہونے لگے۔

"عثمان!" ——— وینا نے عثمان کی اندرونی کیفیت کو سمجھے بغیر کہا ——— "کیا آپ کی غیرت نے یہ گوارہ کر لیا ہے کہ آپ کو آپ کی جوان بیوی اور معصوم بچوں کے ساتھ اغوا کر لیا جائے؟ .... خدا کی قسم میں مرد ہوتی تو نہ جانے کس انتہا تک پہنچ کر انتقام لیتی۔ لوسی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں یہ تو کبھی مشورہ نہیں دوں گی کہ آپ اس لڑکی کا گلا گھونٹ دیں۔ میں جانتی ہوں کہ اس اکیلی کو مار ڈالنے سے اس کا پورا گروہ زمین کے نیچے چلا جائے گا۔ پھر بھی آپ اس لڑکی کو اپنے ہاتھ میں رکھیں اور کسی نہ کسی طرح اس سے اس کے ساتھیوں کی نشاندہی کروائیں"۔

"وہی تو میں کر رہا ہوں" ——— عثمان نے اُکھڑے ہوئے سے لہجے میں کہا جیسے اس کے دل میں کچھ اور ہو اور منہ سے کچھ اور نکل گیا ہو۔

"میں تو سوچ سوچ کر پریشان ہو گئی ہوں" ——— وینا نے کہا ——— "کیا ہندو میں یہ جرأت پیدا ہو گئی ہے کہ اس نے پاکستان کی زمین کو اپنے باپ دادا کی جاگیر سمجھ لیا ہے اور اس ملک کو اپنے جاسوسوں، تخریب کاروں اور لوسی جیسی لڑکیوں سے بھر دیا ہے؟.... آپ کو تو راتوں کو بھی نیند نہیں آنی چاہئے۔ آپ کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو آپ میری طرح اور ہر پاکستانی کی طرح پاکستانی ہیں اور دوسری حیثیت زیادہ اہم ہے۔ وہ یہ کہ آپ فوجی افسر ہیں اور یہ ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے کہ ملک کو دشمن سے بچائیں، دشمن خواہ زمین کے نیچے سے حملہ آور ہو یا اپنی جنگی طاقت سے حملہ کرے"۔

"میں جانتا ہوں وینا!" ——— عثمان نے پہلے سے زیادہ اُکھڑی ہوئی اور ذرا کانپتی ہوئی سی آواز میں کہا ——— "مجھے اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہے .... دیکھو میں کیا کرتا ہوں"۔

"یہ تو آپ بہتر سمجھتے ہیں کیا کرنا چاہئے" ——— وینا نے کہا ——— "میں یہ مشورہ دیتی ہوں کہ یہاں اپنی انٹیلی جنس، آئی ایس آئی کا دفتر تو ضرور ہو گا۔ وہاں جائیں اور انہیں بتا دیں۔ میرا خیال ہے وہ کوئی بہتر طریقہ سوچ سکیں گے"۔

عثمان چونک اٹھا اور اس نے وینا کی طرف دیکھا پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔ پاک آرمی کے ایک میجر کو سب سے پہلے یہی کرنا چاہئے تھا کہ وہ آئی ایس آئی کو اس واقعہ کی تفصیل سناتا اور پھر کہتا کہ یہ لڑکی اس کے ہاتھ میں ہے اور یہ اس لڑکی کو اس کے گروہ کی

نشاندہی کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ عثمان نے سوچا بھی یہی تھا لیکن لوسی نے اسے اپنے طلسم میں گرفتار کر لیا اور عثمان کی عقل پر ایسا پردہ پڑا کہ وہ لوسی کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ وینا نے باتیں کیں تو عثمان الٹے پاؤں پیچھے کو چل پڑا۔ اس نے دیکھا کہ وینا کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ کبھی وہ کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوتی اور باہر دیکھنے لگتی۔ ہوٹل کا یہ کمرہ دوسری منزل پر تھا جس کی کھڑکی سے کراچی کا شہر دور دور تک نظر آتا تھا۔ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر لوگوں کا جم غفیر اِدھر اُدھر آ جا رہا تھا۔ اس ہجوم میں بوڑھے بھی تھے، جوان بھی، عورتیں بھی تھیں بچے بھی۔ وینا اس متحرک ہجوم کو دیکھتی رہی۔ وہ یکلخت پیچھے کو مڑی اور عثمان کو دیکھا۔

"عثمان!" ——— وینا نے جذبات کی شدت سے قدرے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ——— "ہم نے یہ ملک لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر حاصل کیا ہے" ——— وینا نے کمرے میں کھیلتے ہوئے اپنے دونوں بچوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ——— "قوم نے اتنے چھوٹے چھوٹے بچے پاکستان پر قربان کئے ہیں۔ کیا ایک آوارہ اور بدکار لڑکی کی وجہ سے ان معصوموں کی قربانیاں رائیگاں جائیں گی؟ اپنے ان بچوں کو دیکھیں عثمان اور پھر اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر دیکھیں۔ یہ وہ قوم ہے جس نے ضرب کلیمی سے برصغیر کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے لیکن میں ان قربانیوں کو سوچتی ہوں جو قوم نے پاکستان کی خاطر دی تھیں۔ آج اس ملک کے وجود میں ہندو جیسے دشمن کے پنجے گہرے اُتر رہے ہیں .... کچھ کرو عثمان! کچھ کرو اور جلدی کرو"۔

"کر رہا ہوں وینا" ——— عثمان نے کہا ——— "تم دیکھنا میں کیا کرتا ہوں"۔

اُس رات عثمان اچھی طرح سو بھی نہ سکا۔ اس کے ذہن میں شدید کشمکش جاری رہی۔ کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی ذات میں دو انسان لڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ صبح آنکھ کھلی تو سب سے پہلے اسے لوسی کا خیال آیا۔ نیم بیداری کے عالم میں اسے عجیب سا سکون اور سرور سا محسوس ہوا۔

وینا جو کچھ دیر پہلے کی جاگی ہوئی تھی، باتھ روم سے نکل کر کمرے میں آئی تو عثمان کی نظر اس پر پڑی۔ عثمان یوں بجھ کے رہ گیا جیسے کسی نے جلتا چراغ پھونک مار کر بجھا دیا ہو۔ عثمان کے ذہن میں وینا کی باتیں گونجنے لگیں پھر اسے اپنے دونوں بچے نظر آئے۔ بڑا بچہ جس کی عمر تین سال تھی پلنگ پر چھوٹے بچے کے ساتھ کھیل رہا تھا جو ابھی بیٹھ بھی

نہیں سکتا تھا۔ عثمان کو دونوں بچے اتنے پیارے لگے کہ وہ اپنے دل پر جو گرفت سی اور بوجھ سا محسوس کر رہا تھا وہ اتر گیا اور وینا اسے کچھ زیادہ ہی خوبصورت اور دلکش نظر آئی۔ وہ اٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔

"اپنے بچوں کو دیکھیں" ــــ عثمان کے ذہن میں وینا کے گذشتہ شام والے الفاظ گونجنے لگے ــــ "اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھیں۔ یہ وہ قوم ہے جس نے ضربِ کلیمی سے برّصغیر کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے لیکن میں ان قربانیوں کو سوچتی ہوں ...."

عثمان تیزی سے پیچھے کو مڑا۔

"دیکھنا وینا!" ــــ عثمان نے پُرعزم لہجے میں کہا ــــ "ملک کے ان دشمنوں کو میں اپنے ہاتھوں گولی ماروں گا"۔

"جذبات میں آ کر نہیں عثمان!" ــــ وینا نے کہا ــــ "سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا۔ جوش میں آ کر اس کیس کو بگاڑ نہ دینا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں"۔

عثمان کے وجود میں ایک پاکستانی بیدار ہو گیا۔



انبالہ کے ملٹری ہسپتال کے کمرے میں صغیر پہلے کی طرح بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ زخم خاصا بہتر ہو گیا تھا اور صغیر کمرے میں چل پھر بھی سکتا تھا لیکن تیز چلنا ابھی مشکل تھا کیونکہ زخم میں درد شروع ہو جاتا تھا پھر بھی اس نے اپنے فرار کے ارادے کے پیش نظر تیز چلنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ دو بار خالدہ کمرے میں آئی تو اسے چلتے دیکھا۔ خالدہ نے اسے سختی سے منع کیا کہ وہ اتنا زیادہ نہ چلے۔ خالدہ کو خوش کرنے کے لئے وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

اس کے کمرے کے باہر جو آدمی موجود رہتا تھا' وہ پہلے ہی صغیر کے ساتھ بے تکلف ہو گیا تھا لیکن اب صغیر نے اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی بے تکلفی شروع کر دی تھی اور اس کے ساتھ ایسی باتیں کرنے لگا تھا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ وہ انڈیا میں آ کر بہت خوش ہے اور باقی زندگی یہیں گذارے گا۔ بہرحال وہ قیدی تو تھا نہیں پھر بھی صغیر نے اس آدمی کو پہلے سے زیادہ اعتماد میں لے لیا۔

"تمہیں خواہ مخواہ میرے ساتھ باندھ دیا گیا ہے" ــــ گذشتہ رات صغیر نے اس آدمی سے کہا ــــ "رات کو تم اپنے گھر چلے جایا کرو"۔

"یہ تو میں نے دیکھ لیا ہے صغیر صاحب!" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہاں میرے محکمے کا کوئی نہ کوئی افسر آ نکلتا ہے۔ رات کو میں ساتھ والے کمرے میں سوتا ہوں اور دو تین مرتبہ اٹھ کر آپ کو دیکھ لیتا ہوں۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ قیدی نہیں لیکن آپ کی دیکھ بھال کے لئے میرا یہاں رہنا ضروری ہے"۔

صبح پہلے ہندو میجر ڈاکٹر آیا اور صغیر سے حال احوال پوچھا۔ صغیر نے بتایا کہ زخم کا درد کم نہیں ہوا۔ ڈاکٹر نے درد کی گولیاں لکھ دیں اور صغیر کو تسلی دی کہ وہ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ اس میجر ڈاکٹر کے جانے کے بعد ڈاکٹر عبدالرشید آ گیا اور اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"صغیر بھائی!" ــــ ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا ــــ "میں نے رات کو آپ کا سارا انتظام کر دیا ہے۔ میرے گھر والے اور میرے دوست آپ کو اپنے ہاں رکھنے پر نہ صرف آمادہ ہو گئے ہیں بلکہ وہ خوشی محسوس کر رہے ہیں کہ ایک پاکستانی کی مدد کرنے کا انہیں موقع ملا ہے اور جب میں نے انہیں بتایا کہ یہ پاکستانی کس نوعیت کا ہے تو وہ اور زیادہ خوش ہوئے کہ وہ ہندو کے ایک حربے کو بیکار کر دیں گے .... آج رات بارہ بجے کے بعد آپ یہاں سے نکلنے کے لئے تیار رہیں۔ گیٹ تک آپ کو پیدل چلنا پڑے گا۔ آگے گاڑی کا انتظام ہے"۔

"میں بالکل تیار ہوں" ــــ صغیر نے کہا ــــ "اور کوشش کروں گا کہ گیٹ تک اس طرح پیدل چلوں کہ کسی کو شک نہ ہو کہ زخمی یا مریض ہوں"۔



رات ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر عبدالرشید صغیر کے کمرے میں آیا۔ وہ آدمی جو صغیر کے پاس رہتا تھا ساتھ والے کمرے میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس نے صبح تک جاگنا ہی نہیں تھا حالانکہ رات کم از کم تین مرتبہ اٹھ کر صغیر کو دیکھا کرتا تھا۔ اس رات اس کی گہری نیند کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ شام کے کھانے کے بعد ساڑھے آٹھ نو بجے کے درمیان صغیر نے چائے کی دو پیالیاں منگوائیں اور اس آدمی کی نظر بچا کر ایک پیالی میں نیند کی گولی جو ڈاکٹر رشید اسے دے گیا تھا ڈال دی اور اسے اچھی طرح ہلا کر صغیر نے اس آدمی کو بلایا۔

"یہ لو بھائی میرے" ــــ صغیر نے اسے کہا ــــ "آؤ بیٹھو چائے پیو اور گپ شپ

لگاؤ۔ میں تو اکیلے گھبرا جاتا ہوں۔ خدا جانے کب یہاں سے جان چھوٹے گی اور انڈیا کی سیر کرنے کے قابل ہوں گا"۔

اس آدمی نے بڑے مزے لے لے کر چائے پی تھی اور صغیر کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ زیادہ تر پاکستان کے متعلق باتیں پوچھتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ پاکستان دیکھنا چاہتا ہے۔ باتیں کرتے کرتے اس نے اونگھ محسوس کی۔

"آج تو مجھے بھی کچھ جلدی ہی نیند آنے لگی ہے" —— اس آدمی نے جمائی لیتے ہوئے کہا اور اٹھ کر چل پڑا۔

اسے بڑی تیز خواب آور گولی دی گئی تھی۔ صبح سورج نکلنے تک اس کی آنکھ کھلنے کا خطرہ نہیں تھا۔

ڈاکٹر رشید صغیر کو ایک اوور کوٹ اور ایک جناح کیپ اور شلوار قمیض دے کر اور اسے یہ بتا کر کہ اس نے کیا کرنا ہے کمرے سے نکل گیا تھا۔ صغیر نے ہسپتال کے کپڑے اتار کر شلوار قمیض پہنی۔ اوپر اوور کوٹ پہنا اور سر پر ٹوپی رکھی۔ اُس کے اپنے شوز بھی تھے جو پلنگ کے نیچے رکھے تھے۔ اس نے یہ شوز پہن لئے اور آہستہ آہستہ کمرے سے نکل گیا۔ وہ یوں ٹہلتا ہوا چل رہا تھا جیسے کسی کام سے کوئی اجنبی ہسپتال میں آیا ہو۔ اس نے یہ بھی خیال رکھا کہ لنگڑا کر نہ چلے۔

خراماں خراماں چلتا وہ ہسپتال کی بلڈنگ سے نکلا اور گیٹ کی طرف چلنے لگا۔ وہ خاصے عرصے سے انڈین انٹیلی جنس میں تھا۔ اسے خاص قسم کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی جو اس موقع پر اس کی مدد کر رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے رُکتا اور اِدھر اُدھر دیکھتا اور پھر چل پڑتا۔ کسی کو شک تک نہیں ہوتا تھا کہ یہ کوئی مریض ہے اور ہسپتال سے فرار ہو رہا ہے۔ ہسپتال کی علیل فضا میں خاموشی تھی۔ گیٹ پر ایک چوکیدار سٹول پر بیٹھا ہوا تھا اور فوجی سنتری گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ رات کے اُس وقت اُس کا کوئی کام نہ تھا۔

صغیر گیٹ تک پہنچ گیا۔ گیٹ بند تھا۔ صغیر نے چوکیدار کو اشارے سے بلایا۔

"باہر دیکھو" —— صغیر نے اسے افسرانہ لہجے میں کہا —— "ایک سفید سوزوکی کار آئی ہو گی۔ ڈرائیور سے کہو میں آگیا ہوں" —— صغیر نے ذرا درشت لہجے میں کہا —— "کمبخت اتنی دیر سے گاڑی لایا ہے"۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا اور باہر نکلا۔ صغیر بھی آہستہ آہستہ چلتا گیٹ سے نکل گیا۔ ٹ سے کچھ دور ایک طرف سوزوکی کار کھڑی تھی۔ چوکیدار نے اس کار کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ صغیر اس کار کی طرف چل پڑا اور چلتے چلتے چوکیدار سے کہا کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر بیٹھ جائے۔ کار سٹارٹ ہوئی اور صغیر کی طرف آئی۔ صغیر کار کی طرف جا رہا تھا۔ کار اس کے قریب آکر رکی۔ پچھلا دروازہ کھلا اور صغیر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اگلی سیٹ پر ایک اور آدمی اور اس کے ساتھ ایک آدمی سٹیئرنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان تینوں نے صغیر کو السلام علیکم کہی اور گاڑی چل پڑی۔ گاڑی کے آگے اور پیچھے کوئی نمبر پلیٹ نہیں تھی۔

گاڑی چھاؤنی کے علاقے سے نکل کر انبالہ شہر کی طرف چلی گئی اور پھر شہر کے گنجان علاقے میں داخل ہو گئی۔ ایک گلی کے سامنے رک گئی۔ دو آدمی صغیر کے ساتھ گاڑی سے نکلے اور گلی میں داخل ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق گاڑی چلانے والا گاڑی لے گیا۔

"آپ کو چلنے میں دشواری تو محسوس نہیں ہو رہی؟" —— ایک آدمی نے صغیر سے پوچھا۔

"اگر دشواری ہو بھی رہی ہے تو آپ فکر نہ کریں" —— صغیر نے کہا —— ضرورت پڑی تو میں دوڑ بھی پڑوں گا"۔

"نہیں صغیر صاحب!" —— ایک آدمی نے اسے کہا —— "ایسی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ بیشک آہستہ آہستہ چلیں"۔

آہستہ آہستہ چلتے وہ ایک گلی کا موڑ مڑے اور تین چار گھر آگے جا کر ایک گھر کے دروازے کے سامنے جا رکے۔ دستک پر دروازہ کھلا اور وہ تینوں اس گھر میں داخل ہو گئے۔ اندر جا کر وہ صغیر کو ایک کمرے میں لے گئے۔ کمرے میں ایک اچھی قسم کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ ایک بڑی تپائی اور اچھی قسم کی چار پانچ کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ صاف ستھرا اور سجا سجایا کمرہ تھا۔ ہر چیز سلیقے اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ صغیر کو پلنگ پر بٹھا دیا گیا۔ وہ زخم میں درد محسوس کر رہا تھا۔

"کیا یہ ڈاکٹر صاحب کا گھر ہے؟" —— صغیر نے پوچھا۔

"نہیں" —— ایک آدمی نے جواب دیا —— "ڈاکٹر صاحب کا گھر نئی آبادی میں ہے۔ یہ ان کے چچا کا گھر ہے اور ہم دونوں ان کے چچا زاد بھائی ہیں .... آپ اوور کوٹ

اتاریں اور بے خوف و خطر آرام کریں۔ صبح ڈاکٹر رشید آکر آپ کو دیکھے گا اور یہیں آپ کا علاج ہو گا"۔

ڈاکٹر عبدالرشید ہسپتال میں موجود رہا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ صغیر جا رہا ہے پھر اس دیکھا کہ صغیر گاڑی میں بیٹھ گیا ہے۔ وہ دور برآمدے میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جب اس دیکھا کہ گاڑی صغیر کو لے گئی ہے تو وہ آہستہ آہستہ ہسپتال کی بلڈنگ سے نکلا اور وہا تک پہنچا جہاں اس کا موٹر سائیکل کھڑا تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھا اور موٹر سائیکل ا گیٹ سے نکال کر لے گیا۔

ڈاکٹر عبدالرشید نے اپنا فرض خوش اسلوبی سے ادا کر دیا تھا۔

"کیا زخم ٹھیک ہونے تک میں یہیں رہوں گا؟" —— صغیر اپنے میزبانوں سے پو رہا تھا۔

"ہاں صغیر صاحب!" —— اس کے ایک میزبان نے جواب دیا —— "ہم آپ کو ا حالت میں تو نہیں جانے دیں گے۔ جب آپ بھاگنے دوڑنے کے قابل ہو جائیں گے آپ کی روانگی ہو گی۔ یہاں سے نکلنا اور سرحد تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہم آپ بہت بڑا خطرہ اپنے سر لے رہے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے، پھر بھی اللہ کی بارگاہ اچھی امید رکھنی چاہئے"۔

کچھ دیر بعد صغیر کی آنکھ لگ گئی۔

صغیر کی آنکھ کھلی۔ روشن دان سے صبح کی روشنی آ رہی تھی۔ صغیر کو رات کے واقعات یاد آنے لگے۔ وہ اپنے آپ میں ہیجانی سی کیفیت محسوس کر رہا تھا جس میں اطمینان کی جھلک بھی تھی۔ اسے ٹانگ میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا

صغیر کی آنکھ کھلنے سے پہلے اس ملٹری ہسپتال والوں کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھل گئی تھیں جہاں سے صغیر فرار ہوا تھا۔ سب سے پہلے وہ آدمی کمرے میں آیا جو صغیر پر ڈیوٹی دیتا تھا۔ اس نے صغیر کو کمرے میں نہ پا کر باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ صغیر وہاں بھی نہیں تھا۔ باہر دیکھا۔ نرس اور نوکروں وغیرہ سے پوچھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کمرے میں جو زخمی داخل تھا وہ کہاں چلا گیا ہے۔

کوئی ایک گھنٹہ ہر طرف دیکھنے کے بعد رپورٹ میجر ڈاکٹر تک پہنچی۔

"وہ واپس آئے تو اسے بیڈ کے ساتھ باندھ دو" —— میجر ڈاکٹر نے کہا —— "نہیں آتا تو جائے بھٹے میں۔ وہ ہمارا مریض تھا۔ علاج نہیں کرانا چاہتا تو نہ کرائے" —— اچانک ڈاکٹر چونک اٹھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار آ گئے۔ اس نے کہا —— "اوہ .... اس مریض کے متعلق تو ہمیں کچھ اور حکم ملا تھا .... اسے ڈھونڈو بھائی! وہ تو انٹیلی جنس کا آدمی تھا"۔

"ہر طرف ڈھونڈ چکے ہیں سر!" —— میجر ڈاکٹر کو جواب ملا —— "صبح سے اب تک کی تلاش کے بعد آپ کو رپورٹ دی ہے"۔

میجر ڈاکٹر کچھ کہے بغیر بہت تیز تیز چلتا کمرے سے نکل گیا اور ہسپتال کے کمانڈنٹ کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ کمانڈنٹ نے جب سنا کہ یہ زخمی لاپتہ ہو گیا ہے تو اس نے بھی

گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا اور کہنے لگا کہ وہ انٹیلی جنس کو اطلاع دے گا۔

انٹیلی جنس کو کمانڈنٹ کا فون ملا تو وہاں بھی ہلچل مچ گئی۔ وہاں کے افسر دوڑے ہوئے پہنچے اور کمانڈنٹ سے جواب طلبی کرنے لگے۔

"مریضوں کو فرار سے روکنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں" ___ کمانڈنٹ نے جو عہدے کا بریگیڈیئر تھا' رعب دار آواز میں کہا ___ "اگر وہ آپ کا قیدی تھا تو اس پر ایسکارٹ لگانا آپ لوگوں کا کام تھا۔ آپ نے صرف ایک آدمی سویلین کپڑوں میں وہاں بٹھا رکھا تھا۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ مریض پر نظر رکھتا.... وہ تھا کون؟ کیا وہ آپ کا قیدی تھا؟"

"قیدی تو نہیں تھا سر!" ___ انٹیلی جنس کے ایک میجر نے جواب دیا ___ "ہمیں بتانا تو نہیں چاہئے لیکن آپ بریگیڈیئر ہیں اس لئے ہم یہ راز آپ کو دے دیتے ہیں کہ وہ پاکستانی ہے اور ہمارا بڑا ہی کار آمد ایجنٹ ہے۔ ہم اسے یہاں مزید ٹریننگ اور کچھ برین واشنگ کے لئے لائے تھے"۔

"ہاں ہاں' مجھے یاد آ گیا" ___ بریگیڈیئر ڈاکٹر نے کہا ___ "اسے وہ انجکشن دیئے جا رہے تھے .... لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ ان انجکشنوں کے باوجود وہ نکل کیسے گیا؟"

"کیا آپ کے سٹاف میں مسلمان ڈاکٹر وغیرہ بھی ہیں؟" ___ انٹیلی جنس کے میجر نے پوچھا۔

"ہیں تو سہی!" ___ بریگیڈیئر نے جواب دیا ___ "میں سمجھ گیا ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آپ کو یہ شک ہے کہ یہاں کے کسی مسلمان نے اسے ورغلا لیا ہو گا"۔

"یس سر!" ___ انٹیلی جنس کے دوسرے افسر نے جواب دیا۔

"میں نہیں مان سکتا" ___ بریگیڈیئر نے کہا ___ "اسے جو انجکشن دیئے جا رہے تھے وہ اس کے ذہن کو کسی اور طرف جانے کی اجازت نہیں دے سکتے"۔

"سر!" ___ انٹیلی جنس کے میجر نے کہا ___ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے انجکشن دیئے ہی نہ گئے ہوں ...."

"اسے انجکشن کون دیا کرتا تھا؟" ___ انٹیلی جنس کے ایک اور میجر نے پوچھا۔

"ایک مسلمان ڈاکٹر" ___ بریگیڈیئر نے جواب دیا ___ "ڈاکٹر عبدالرشید.... لیکن میں نہیں مان سکتا کہ ڈاکٹر مسلمان ہو یا ہندو' یہ جرأت کرے کہ وہ مریض کو پوری دوا

بھی نہ دے اور پھر ڈاکٹر عبدالرشید نہایت شریف اور دیانتدار ڈاکٹر ہے۔ میں اس پر شک نہیں کر سکتا کہ اس نے اس مریض کو انجکشن نہ دیئے ہوں"۔

"ایکسکیوزمی سر!" ___ انٹیلی جنس کے میجر نے کہا ___ "آپ ڈاکٹر ہیں۔ آپ انسانوں کو کسی اور نظر سے دیکھتے ہیں۔ آپ کے سامنے دشمن ملک کا زخمی یا مریض لایا جائے تو آپ اسے صرف مریض اور ایک دکھی انسان سمجھیں گے اور یہ بھول جائیں گے کہ یہ دشمن کا آدمی ہے اور تندرست ہو کر دشمن ہی رہے گا لیکن سر! ہم انسانوں کو کسی اور نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہم انسانوں کو اندر سے جھانکتے ہیں۔ آپ نے جس مسلمان کو شریف اور دیانتدار ڈاکٹر کہا ہے وہ مسلمان بھی ہے۔ انڈیا میں کسی بھی مسلمان کا وجود دیانتدار ہو سکتا ہے لیکن انڈیا کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کو یہ شک ہے کہ ہمارے زخمی کو انجکشن نہیں دیئے گئے ہوں گے تو میں وثوق سے کہتا ہوں کہ اس میں اس مسلمان ڈاکٹر کا ہاتھ ہے اور یہی ڈاکٹر اس کے فرار کا ذریعہ بنا ہو گا"۔

"میرا دل نہیں مانتا میجر پرشاد!" ___ بریگیڈیئر نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا ___ "رشید صحیح معنوں میں ڈاکٹر ہے"۔



اتنے میں انٹیلی جنس کا ایک کرنل جو ہندو تھا آ گیا۔ صغیر کے فرار کی اطلاع جب انٹیلی جنس کے دفتر میں پہنچی تھی' یہ کرنل دفتر میں نہیں تھا۔ وہ دفتر میں آیا تو اسے بتایا گیا کہ اس کے افسر ملٹری ہسپتال چلے گئے ہیں اور کس اطلاع پر گئے ہیں۔ کرنل جیپ میں بیٹھا اور ملٹری ہسپتال بریگیڈیئر کمانڈنٹ کے دفتر میں جا پہنچا۔ وہ خاصی پریشانی کے عالم میں تھا۔ اس نے اپنے طور پر بریگیڈیئر سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ بھی بریگیڈیئر سے جواب طلبی کر رہا تھا۔ بریگیڈیئر ڈاکٹر نے اسے بھی وہی جواب دیا جو وہ میجر کو دے چکا تھا' بلکہ اس نے کرنل کو تھوڑا سا ڈانٹ بھی دیا اور کہا کہ ایسے مریض پر انہیں ایسکارٹ کا انتظام کرنا چاہئے تھا۔ ہسپتال والوں کا کام علاج معالجہ ہے۔

"یہ بھی سوچو کرنل!" ___ بریگیڈیئر نے کہا ___ "کہ آپ مجھ سے ایک ایسا کام کرواتے رہے ہیں جو کوئی ڈاکٹر کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ آپ مجھ سے اس مریض کو ایسے انجکشن دلواتے رہے ہیں جو مینٹل ہاسپٹل میں بھی ڈاکٹر انتہائی خطرناک پاگلوں کو دینے سے پہلے کئی بار سوچتے ہیں"۔

"ہم نے آپ کو بتا دیا تھا کہ اس شخص کو یہ انجکشن کس مقصد کے لئے دیئے جا رہے ہیں" — کرنل نے کہا — "امریکہ کی سی آئی اے ان انجکشنوں کا استعمال بے دھڑک کرتی ہے"۔

"میں جانتا ہوں" — بریگیڈیئر ڈاکٹر نے کہا — "یہی سوچ کر میں یہ انجکشن اس شخص کو دلواتا رہا ہوں .... میں پھر کہتا ہوں کہ یہ انجکشن اسے نہیں دیئے گئے"۔

"ایک بات بتائیں سر!" — کرنل نے پوچھا — "کیا ان انجکشنوں کا ایسا اثر بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی باہر نکل جائے اور ان انجکشنوں کے زیر اثر یہ جانے بغیر کہ وہ کہاں جا رہا ہے، چلتا ہی چلا جائے؟"

"نہیں" — بریگیڈیئر نے جواب دیا — "ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اسی ماحول میں رہنا پسند کرے گا جس میں اسے نشہ مل رہا ہے حالانکہ اسے پتہ نہیں ہو گا کہ اسے نشہ دیا جا رہا ہے .... اس پہلو پر بھی غور کریں کہ وہ زخمی تھا اور اس کی ٹانگ اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ اس کے جسم کا بوجھ چند قدم دور تک اٹھا سکتی"۔

"تو کیا اسے کوئی اٹھا کر لے گیا ہے؟" — کرنل نے پوچھا۔

"یہ سراغ لگانا آپ کا کام ہے کرنل!" — بریگیڈیئر نے کہا — "میں نے اپنی جو رائے دینی تھی دے دی ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا"۔

"سر!" — کرنل نے کہا — "مجھے کچھ اور بھی پوچھنا ہے۔ ان سوالوں کے جواب مجھے مل جانے چاہئیں .... کیا یہ مسلمان ڈاکٹر رات کو بھی ڈیوٹی پر ہوتا ہے؟"

بریگیڈیئر نے میجر ڈاکٹر کی طرف دیکھا جو وہاں موجود تھا۔

"نہیں سر!" — میجر ڈاکٹر نے کہا — "ڈاکٹر عبدالرشید کی نائٹ ڈیوٹی ان دنوں نہیں ہے"۔

"کیا پاکستان کی انٹیلی جنس اتنی تیز ہے کہ اسے پتہ چل گیا ہو کہ یہ شخص پاکستانی ہے اور انڈین انٹیلی جنس کے جال میں آیا ہوا ہے؟" — بریگیڈیئر نے پوچھا — "میں سوال یہ سوچ کر پوچھ رہا ہوں کہ اگر اس شخص کو لے جایا گیا ہے تو یہ پاکستان کی انٹیلی جنس کے ایجنٹوں کا کام ہو سکتا ہے جو یہاں موجود ہیں"۔

"آپ کا یہ شک صحیح ہو سکتا ہے سر!" — کرنل نے کہا — "اگر میں یہ کہوں کہ پاکستان کی انٹیلی جنس میں اتنی تیزی اور اہلیت نہیں تو میں بہت بڑا احمق ہوں گا۔ دشمن

کمزور اور نالائق سمجھنا بہت بڑی حماقت ہوتی ہے۔ انڈیا کے مسلمانوں کو انڈیا کا وفادار سمجھنا بھی ایک حماقت ہے۔ ہم تو یہاں کے مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں پر بھی اعتبار نہیں کرتے"۔

"اس زخمی کے کمرے میں دو نرسوں کی ڈیوٹی تھی" — میجر ڈاکٹر نے کہا — "ایک مسلمان اور دوسری کرسچین"۔

"مجھے افسوس ہے کہ ہم آپ کو پوری انسٹرکشن نہ دے سکے" — کرنل نے کہا — "اس مریض کے ساتھ نہ مسلمان نرس لگانی چاہئے تھی نہ کرسچین۔ ہم کسی کرسچین پر بھی اعتبار نہیں کرتے۔ بے شمار کرسچین فیملیوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اچھوت آہستہ آہستہ مسلمان ہوتے چلے جا رہے ہیں"۔

"کیا یہ مسلمان نرس رات کو ڈیوٹی پر تھی؟" — انٹیلی جنس کے کرنل نے پوچھا۔

"نہیں سر!" — میجر ڈاکٹر نے جواب دیا — "ان دنوں وہ دن کی ڈیوٹی پر ہے"۔

"تفتیش کی ابتدا اپنے آدمی سے کریں" — بریگیڈیئر نے کہا — "پہلے تو اس سے پوچھیں کہ وہ رات کمرے کے باہر موجود تھا یا کہیں چلا گیا تھا!"

"تھینک یو سر!" — کرنل نے اٹھتے ہوئے کہا — "ہمیں فوری طور پر تفتیش شروع کر دینی چاہئے۔ ہمیں آپ کے سٹاف کے تعاون کی ضرورت ہو گی"۔

بریگیڈیئر نے میجر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور ذرا سا سر ہلایا جو ایک حکم تھا کہ انٹیلی جنس کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا جائے۔

"یس سر!" — میجر ڈاکٹر نے کہا۔

انٹیلی جنس کے افسر بریگیڈیئر ڈاکٹر کو سلیوٹ کر کے کمرے سے نکل گئے۔



پاکستان میں میجر عثمان اپنی بیوی وینا اور دو بچوں کے ساتھ سمندر کے سینے پر تیر رہا تھا۔ وینا کراچی کی سیر کرنا چاہتی تھی اسی لئے وہ اس کے ساتھ کراچی گئی تھی۔ اس روز عثمان بیوی اور بچوں کو سمندر کی سیر کے لئے لے گیا تھا۔ اس نے ایک لانچ کرائے پر لے لی تھی اور وہ سمندر میں کچھ دور چلے گئے تھے۔ وینا عثمان کو اپنے قریب پا کر بہت ہی خوش تھی۔ ان کا تین سالہ بچہ لانچ میں اچھل کود رہا تھا۔

بندرگاہ میں کھڑے بحری جہازوں کو دیکھ دیکھ کر وینا پر کچھ عجیب سا تاثر طاری ہوتا جا

رہا تھا۔ وہ عثمان سے پوچھ رہی تھی کہ پاک بحریہ کے جہاز کون کون سے ہیں۔ عثمان نے لانچ والے سے کہا کہ وہ لانچ بحری جہازوں کے قریب سے گزارے۔ جب لانچ جہازوں کے قریب سے گزرنے لگی تو عثمان نے وینا کو بتانا شروع کر دیا کہ فلاں فلاں جہاز اپنی نیوی کا ہے۔

"کیا ہمارے پاس اتنی بحری طاقت ہے کہ ہم انڈیا کا مقابلہ کر سکیں؟" —— وینا نے عثمان سے پوچھا۔

"نہیں وینا!" —— عثمان نے جواب دیا —— "ہماری بحری طاقت کھلے سمندروں میں انڈیا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انڈیا کے پاس طیارہ بردار بحری جہاز بھی ہے اور دوسرے بحری جہاز بھی زیادہ بڑے اور تعداد میں بھی زیادہ ہیں .... ہمارا ملک بھکاری ملک ہے۔ امریکہ ہماری جھولی میں جو بھیک ڈالتا ہے وہ افسر شاہی اور بادشاہی کرنے والے حکمران اوپر ہی اوپر کھا پی جاتے ہیں"۔

"میں پاکستان کو ایک طاقتور ملک بنا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں" —— وینا نے جذباتی سے لہجے میں کہا —— "اتنا طاقتور کہ انڈیا ہماری سرحد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے... اور پھر عثمان صاحب! میں جب اُس وقت کی باتیں سنتی ہوں جب پاکستان بنا تھا تو ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ کم و بیش ایک لاکھ مسلمان لڑکیاں سکھوں نے اغوا کر لی تھیں اور معلوم نہیں کتنے ہزار لڑکیاں سکھوں کے تشدد سے شہید ہو گئی تھیں۔ ہم نے ان معصوم لڑکیوں کا انتقام لینا ہے"۔

"انتقام غیرت والے لیا کرتے ہیں وینا!" —— عثمان نے کہا —— "یہاں تو ہر اس حکمران کو جس کے ہاتھ پاکستان کی حکومت آئی' اپنا ہی گھر بھرنے کی فکر لگی رہی اور ملک کا کاروبار دوسرے ملکوں سے بھیک مانگ مانگ کر چلایا"۔

"ایک سوچ مجھے اکثر پریشان کیا کرتی ہے" —— وینا نے کہا —— "دو ملکوں کی لڑائی ہو' لمبی جنگ ہو یا فرقہ وارانہ فسادات ہوں' پہلا شکار عورت ہوتی ہے۔ ہندو تو پہلا حملہ مسلمان عورت پر کرتے ہیں۔ کشمیر میں عورتوں کی بے حرمتی ہوتی چلی آ رہی ہے۔ پاکستان اور انڈیا کی جب بھی جنگ ہوئی' ہندو فوجی سرحدی دیہات سے ہماری عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔ یہ سوچ کر مجھے خیال آتا ہے کہ پاکستان اور کشمیر کی نوجوان لڑکیوں کو لڑنے کی اور مختلف ہتھیار استعمال کرنے کی ٹریننگ ملنی چاہئے اور انہیں اس قسم کی

نگ بھی ملنی چاہئے جیسے فوجیوں کو ملتی ہے کہ انہیں جنگلوں میں لے جا کر مشکلات اور ت میں کچھ دن رکھتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہماری عورتوں کو ہر طرح کی مشکل تکلیف دہ صورتِ حال میں اپنے آپ کو اور اپنی عصمت کو بچانے کی ٹریننگ دی ے"۔

"یہاں تو مردوں کی ٹریننگ کا بھی کوئی رواج نہیں" —— عثمان نے بیزاری سے کہا "کالجوں کے لڑکے اسی وجہ سے غلط اور اخلاق سوز مشغلے اپنا لیتے ہیں کہ انہیں کوئی ب العین نہیں دیا جاتا نہ انہیں قومی تشخص سے آگاہ کیا جاتا ہے"۔

لانچ سمندر کو چیرتی جا رہی تھی۔ سمندر کی ہوا بڑی خوشگوار اور روح افزا تھی۔ ان اور وینا کا بڑا بچہ لانچ میں اِدھر اُدھر دوڑتا اور سمندر سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہنے لگا رہا تھا۔ وینا اسے اور کبھی اپنی گود میں لئے ہوئے چھوٹے بچے کو دیکھتی تھی۔

"میں اپنے دونوں بچوں کو آپ کی طرح فوج میں بھیجوں گی" —— وینا نے کہا —— پ کا کیا خیال ہے' فوج میں بھیجیں یا نیوی میں؟"

"ایک کو تو میں پاکستان ایئر فورس میں فائٹر پائلٹ بناؤں گا" —— عثمان نے کہا۔

عثمان نے یہ کہہ تو دیا کہ وہ اپنے ایک بیٹے کو فائٹر پائلٹ بنائے گا لیکن وہ وینا کی یں صرف سن رہا تھا۔ اس کا دھیان نہ پاک بحریہ کے جہازوں کی طرف تھا نہ اپنے ں کی طرف اور نہ ہی اسے وہ وقت یاد آیا تھا جب پاکستان اور انڈیا الگ ہوئے تھے اور ؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کو اغوا کیا تھا۔ کے ذہن پر لوسی کی باتیں سوار تھیں۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ یہی لانچ تیرنے کی بجائے ا شروع کر دے اور اسے لوسی تک پہنچا دے لیکن وینا کے ساتھ وہ ایسا رویہ اختیار رنے کی کوشش میں تھا جس سے وینا کو یہ تاثر ملے کہ وہ وینا کے سوا کسی اور عورت کا ال ذہن میں لانے کو گناہ سمجھتا ہے۔ لوسی نے اسے کہا تھا کہ وہ وینا کو ذرا سا بھی شک نہ رنے دے کہ اس کی توجہ وینا سے ہٹ گئی ہے۔ لوسی نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ خود ینا کے ساتھ بے تکلف ہو جائے گی۔

لوسی غیر معمولی طور پر چالاک اور ذہنی طور پر ہوشیار لڑکی تھی۔ اس نے لاہور میں لا تجربہ یہ کیا تھا کہ عثمان کو یہ تاثر دیا تھا کہ وہ اس کے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ ی' اور عثمان کو اپنا مجنوں بنانے کے لئے اس کے دل میں وینا کی نفرت پیدا کر دی تھی۔

اس کے نتیجے میں لوسی وینا کے بھائیوں اور عثمان کے دوستوں کے ہاتھوں اغوا ہوئی اور پ
اسے لاہور کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑا۔ یہ تجربہ اتنا مہنگا پڑا تھا کہ اب وہ اسے دہرانے
جرأت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی بجائے اس نے اب یہ پینترہ بدلا کہ عثمان کو اس لا
پر چلا دیا کہ وہ وینا کو کوئی شک نہ ہونے دے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ وینا کو ایسا
دے جیسے وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہے۔ یہ طریقہ عثمان کو بھی اچھا لگا تھا۔

وینا اپنے اغوا کے سلسلے میں مطمئن تھی۔ عثمان نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ لوسی
دوستی کا جھانسہ دے کر پھندے میں لائے گا ورنہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا کہ وہ ا
خاوند، چھوٹے چھوٹے بچوں اور گاڑی سمیت اغوا ہو گئی تھی۔ اگر لوسی نہ آ جاتی تو
معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونا تھا، لیکن یہ سوال اس کے لئے اور زیادہ پریش
کن اور حیران کن بھی تھا کہ لوسی سندھ کے دور اندر کے اس علاقے میں ڈاکوؤں
ہاں کیا کرنے آئی تھی۔

"عثمان صاحب!" ـــــ وینا نے کہا ـــــ "مجھے اغوا یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے
جاتے ہیں.... کیا آپ اسے جلدی پکڑوا دیں گے؟"

"ہاں ہاں" ـــــ میجر عثمان نے جواب دیا ـــــ "اگر صرف لوسی کو پکڑوانا ہوتا
ایک دن میں اسے پکڑوا سکتا ہوں لیکن اس اکیلی کے پکڑے جانے سے اس کا باقی گ
چھپ جائے گا۔ میں لوسی کے ذریعے اس کے گروہ کے تمام افراد کا سراغ لگا لوں گا تم
نہ کرو"۔

لانچ واپس کیماڑی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد عثمان اور وینا اپنی گاڑی میں
ہوٹل کو جا رہے تھے۔



شام کے بعد میجر عثمان وینا کو یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ ملیر کینٹ اپنے ایک میجر دو
سے ملنے جا رہا ہے۔

"کھانا کھا کے نہیں جائیں گے؟" ـــــ وینا نے پوچھا۔

"نہیں وینا!" ـــــ عثمان نے بڑے پیارے انداز میں جواب دیا ـــــ "آج تم
کھانا کھا لو۔ اگر میں کھانے کے لئے رک گیا تو اس میجر سے ملاقات نہیں ہو سکے گی
کوئی رسمی ملاقات نہیں۔ یہ میجر انٹیلی جنس میں ہے۔ میں نے اسے اپنے اغوا کا سا

اور لوسی کے متعلق سب کچھ بتانا ہے پھر وہ جیسے کہے گا میں ویسے ہی کروں گا۔ شاید
مجھے وہاں زیادہ وقت لگ جائے۔ تم جانتی ہو کہانی ذرا لمبی ہے"۔

"ہاں ہاں!" ـــــ وینا نے پیارے سے لہجے میں کہا ـــــ "یہ کام کھانے سے زیادہ
ضروری ہے آپ فوراً چلے جائیں"۔

وینا جذبات میں ایسی الجھی کہ محسوس نہ کر سکی کہ اس کے خاوند نے جھوٹ بولا
ہے۔ وینا تو خوش تھی کہ اس کا خاوند اسے واپس مل گیا ہے لیکن خاوند اب جھوٹ کے پر
لگا کر پھر انہی فضاؤں میں اُڑنے لگا تھا جہاں سے وینا سمجھتی تھی کہ وہ نیچے آ گیا ہے۔

عثمان نے زندگی کا جو راستہ اختیار کر لیا تھا اس میں جھوٹ لازمی تھا۔ جھوٹ کے بغیر
وہ ایک قدم نہیں چل سکتا تھا۔ ایسے آدمی کو جھوٹ بول کر عجیب سی لذت محسوس ہوتی
ہے۔ عثمان کو معلوم نہیں تھا کہ جھوٹ دل سے خوفِ خدا کو بھی مٹا دیتا ہے۔ اسے
صرف یہ دلچسپی تھی کہ جھوٹ ایک ایسی چیز ہے جو تمام زنجیریں توڑ دیتا ہے اور انسان کو
آزاد کر دیتا ہے کہ وہ جو جی میں آئے کرے۔ عثمان کو معلوم نہیں تھا کہ خوفِ خدا کو دل
سے نکال دینے سے اللہ کی قوت کو ختم یا کمزور نہیں کیا جا سکتا۔ جھوٹ اللہ کی لاٹھی کو
نہیں روک سکتا۔ عثمان صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ جھوٹ بڑے ہی کام کی چیز ہے۔

جھوٹ جب ایک عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو یہ ایک نشہ سا بن جاتا ہے
اور کچھ عرصے بعد انسان جھوٹ نہ بولنا چاہے تو بھی اس کے منہ سے جھوٹ ہی نکلتا ہے
اور پھر ایک دن اچانک اُس اللہ کی لاٹھی چل پڑتی ہے جس کا خوف جھوٹ بولنے والا
آدمی دل سے نکال چکا ہوتا ہے۔ اس وقت جھوٹ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

جھوٹ اور عورت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی عورت کسی غیر مرد کے ساتھ
تعلقات قائم کرے گی تو وہ جھوٹ کا ہی سہارا لے گی اور کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ
ناجائز مراسم پیدا کرے گا تو وہ بھی اپنے بیوی بچوں اور گھر والوں کے ساتھ جھوٹ ہی
بولے گا۔ عورت ایک ایسا نشہ ہے جو کسی کو لگ جائے تو وہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا اور
اس کے ساتھ جھوٹ اس کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ اس
نے سب کو بے وقوف بنا لیا ہے۔

خدا کے بندوں کو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے، خدا کو نہیں ـــــ یہ الگ بات ہے کہ
خدا اپنے جھوٹے بندے کو سنبھلنے اور سنورنے کی مہلت دیتا ہے اور جب وہ گناہگار بندہ

خدا کی دی ہوئی مہلت سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو خدا اسے ایسا پکڑتا ہے کہ اسی دنیا میں اسے جہنم دکھا دیتا ہے۔

عثمان اللہ کے انہی بندوں میں سے تھا جو سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کو بھی دھوکا دے سکتے ہیں۔ یہ اللہ کا فرمان ہے اور دنیا کے تمام مذاہب اس اصول کو اہمیت دیتے ہیں کہ جھوٹ وہ گناہ ہے جو ہر گناہ کو جنم دیتا ہے اس لئے صرف اس گناہ سے یعنی جھوٹ بولنے سے باز آجاؤ تو ایک سو گناہوں سے بچ جاؤ گے۔

عثمان نے جھوٹ کا سہارا لیا تو وہ ان لوگوں میں پہنچ گیا جو اللہ کے دین کے اور قرآن کی سرزمین پاکستان کے دشمن تھے۔ لوسی اس کی منتظر تھی۔ پچھلی ملاقات میں اس نے لوسی کو بتا دیا تھا کہ وہ وینا کو سمندر کی سیر کے لئے لے جائے گا اور شام کے بعد لوسی کے پاس پہنچ جائے گا۔

اس شام اس کوٹھی میں جس میں لوسی رہتی تھی ایک تو راما راؤ تھا جو سندھ میں کام کرنے والے گروہ کا انچارج تھا' لوسی تھی اور ایک لڑکی اور وہاں موجود تھی جس کی عمر چوبیس پچیس سال تھی۔ عثمان لوسی کو بڑی خوبصورت لڑکی سمجھا کرتا تھا اور پھر وہ کسی لڑکی کو حسین سمجھتا تھا تو وہ وینا تھی لیکن اس لڑکی کو اس نے دیکھا تو کچھ دیر کے لئے لوسی اور وینا اس کے ذہن سے نکل گئیں۔ عثمان کو دیکھ کر جس طرح اس لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی وہی عثمان پر جادو کا اثر کر گئی۔ چند سیکنڈ کے لئے عثمان اس لڑکی میں کھو گیا۔

ایک تو وہ حسن ہوتا ہے جو خدا کسی عورت یا مرد کو عطا کرتا ہے اور ایک حسن وہ ہے جو عورت اپنے آپ میں پیدا کرتی ہے۔ عام فہم زبان میں اسے ناز و انداز کہا جاتا ہے لیکن اکثر عورتیں ناز و انداز میں سے تصنع اور بناوٹ نہیں نکال سکتیں۔ کوئی کوئی عورت ایسی ہوتی ہے جو اپنی ڈیل ڈول میں' چال ڈھال اور بات کرنے کے انداز میں ایسا رنگ پیدا کر دیتی ہے جو قدرتی لگتا ہے اور قدرتی حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ اگر عورت کو کوئی استاد مل جائے تو وہ اسے ٹریننگ دے کر اس کے حسن میں طلسماتی اثر پیدا کر دیتا ہے۔

"عثمان!" ــــ لوسی نے کہا ــــ "یہ فوزی ہے.... فوزیہ کلیم.... یہ تمہیں ملنے کے لئے بیتاب تھی"۔

"مجھے؟" ــــ عثمان نے حیران سا ہو کر کہا ــــ "یہ مجھے کیسے جانتی ہے؟"

"آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں عثمان بھائی!" ــــ راما راؤ نے کہا ــــ "آپ کو کون نہیں جانتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ انڈیا کا پرائم منسٹر بھی آپ کے نام سے واقف ہو گا"۔

"یہ ہے عثمان" ــــ لوسی نے فوزی سے کہا ــــ "اچھی طرح دیکھ لو۔ تم صبح شام میرے پیچھے پڑی رہتی تھیں کہ عثمان سے ملواؤ"۔

"تم سب نے ان کی تعریفیں ہی اتنی کی تھیں کہ میں انہیں دیکھنے کو بے تاب ہو گئی" ــــ فوزی نے بڑے پیارے سے انداز سے مسکراتے اور شرماتے ہوئے کہا ــــ "یہ تو اس سے بہت زیادہ اچھے اور پیارے لگتے ہیں جتنا تم لوگ بتاتے رہے ہو"۔

"عثمان بھائی!" ــــ راما راؤ بولا ــــ "تم نے اپنے آپ کو چھوٹا سا آدمی سمجھ رکھا ہے۔ تمہارے والد صاحب کو تو دنیا جانتی ہے۔ میں دہلی گیا تو دو آدمیوں نے تمہارے ڈیڈی کا ذکر کیا۔ ایک نے تو یہاں تک کہا کہ ان کا بیٹا عثمان ان سے زیادہ نامور ہے"۔

لُوسی اور راما راؤ اپنے مخصوص اور پُراثر انداز سے عثمان کو غبارے کی طرح پھُلا رہے تھے۔ ان کی باتوں کے ساتھ ساتھ فوزی کا عثمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بار بار دیکھنا اور ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم لے آنا عثمان پر نشے کی سی کیفیت طاری کر رہا تھا اور عثمان بڑی تیزی سے اونچا ہی اونچا اڑتا جا رہا تھا۔ وہ اتنا اونچا چلا گیا جہاں سے اسے پاکستان کی زمین بھی اور اپنے بیوی بچے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

"عثمان بھائی!" ــــ راما راؤ نے کہا ــــ "گاڑی بدل لو۔ تم اس پرانے ماڈل کی کار میں اچھے نہیں لگتے"۔

"کم از کم مرسڈیز ہو" ــــ لُوسی بولی ــــ "پجارو ہو"۔

"ہونڈا اکارڈ بھی اچھی گاڑی ہے" ــــ راما راؤ نے کہا ــــ "میرا مطلب ہے گاڑی اپنی حیثیت کے مطابق ہونی چاہئے' تم فوج میں میجر ہو جو کوئی اتنا بڑا رینک نہیں لیکن سوسائٹی میں تمہارا مقام بہت اونچا ہے"۔

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا" ــــ عثمان نے کہا ــــ "لیکن ذرا بجٹ کا معاملہ ہے' پھر بھی گاڑی تو ضرور لوں گا"۔

"بجٹ کا کیا معاملہ ہے!" ــــ راما راؤ نے کہا ــــ "بجٹ کا معاملہ ہم پر چھوڑو گاڑی مل جائے گی۔ ہم تمہیں اس گاڑی میں نہیں دیکھنا چاہتے" ــــ راما راؤ نے لوسی سے کہا ــــ "انہیں کھو کھانا لگادیں"۔

لوسی چلی گئی پھر راما راؤ اٹھا اور یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا کہ ابھی آتا ہوں کمرے میں فوزی اور عثمان رہ گئے۔

"شکر ہے یہ لوگ یہاں سے اٹھے" ___ فوزی نے کہا ___ "میں کچھ دیر آپ پاس بیٹھنا چاہتی تھی"۔

"کیوں؟" ___ عثمان نے مسکراتے ہوئے پوچھا ___ "مجھ میں تم نے کیا خوبی د ہے جو تم میرے پاس بیٹھنا چاہتی ہو؟"

"بعض خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو نظر آتی ہیں لیکن بیان نہیں کی جاسکتیں"۔ فوزی نے اس طرح جھجکتے شرماتے ہوئے کہا جیسے وہ چودہ پندرہ سال کی کمسن لڑکی ہو بڑی مشکل سے ایک جوان آدمی کے ساتھ بات کر رہی ہو۔ وہ کہہ رہی تھی ___ " حال میرا ہے۔ بڑے خوبصورت جوان بھی دیکھے ہیں لیکن ایک نظر میں ہی جو بات میں دیکھی ہے وہ کسی اور میں نظر نہیں آئی لیکن مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہو رہی ہے لوسی آپ کی ملکیت کا دعویٰ کرتی ہے۔ میں آپ کو لوسی سے چھیننا نہیں چاہتی لیکن کی قربت حاصل کئے بغیر رہ بھی نہیں سکتی.... کیا کبھی تھوڑا سا وقت مجھے دیا کریں گے

"وقت تو دے دیا کروں گا لیکن میں پرسوں صبح واپس لاہور جا رہا ہوں"۔

"پھر تو اور زیادہ اچھا ہے" ___ فوزی نے کہا ___ "میں بھی لاہور جا رہی ہوں"

"کب؟" ___ عثمان نے پوچھا۔

"میں دو تین دنوں تک پہنچ جاؤں گی"۔

"کیا تم لوسی کی جگہ جا رہی ہو؟" ___ عثمان نے پوچھا۔

"ہاں" ___ فوزی نے جواب دیا ___ "وہاں مجھے آپ کے ساتھ کی اور آپ کی کی بہت ضرورت ہوگی"۔

"ساتھ بھی مل جائے گا اور مدد بھی" ___ عثمان نے کہا ___ "تمہارا گروپ کم تمہیں پوری ہدایات دے گا اور کچھ باتیں میں تمہیں بتاؤں گا"۔

"مجھے تو اس کی بڑی خوشی ہے کہ آپ وہاں ہوں گے" ___ فوزی نے کہا۔

کچھ دیر بعد نوکر نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔ عثمان اور فوزی اٹھ کر ڈا روم میں چلے گئے۔ اتنے میں راما راؤ اور لوسی بھی آگئے۔ اس وقت تک عثمان آ سے باہر ہو چکا تھا۔ اسے اپنی اصلیت یاد نہیں رہی تھی۔ ان لوگوں نے مل جل کرا

شہزادہ بنا دیا تھا۔ کھانے کے دوران راما راؤ، لوسی اور فوزی نے سوائے اس کے اور کوئی بات ہی نہ کی کہ عثمان کو ہوا دیتے رہے اور وہ کھوکھلا غبارہ بن کر پھولتا چلا گیا۔

دشمن کے جاسوس وہی بنتے ہیں جو اپنی اصلیت، شخصیت اور قومیت کو بھول جاتے ہیں۔ کردار کی یہ کمزوری ایسی کمزوری ہے جسے دشمن نہایت خوبصورت طریقے سے استعمال کرتا ہے اور اپنے شکار کو یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ وہ تو بہت ہی اونچی شخصیت ہے اور وہ غلط ملک میں اور غلط گھر میں پیدا ہوا ہے۔ ایسے انسان کو پستی میں بلندی اور اپنے ایمان کی بے حرمتی میں وقار نظر آتا ہے۔

غداروں میں یہی کمزوری پیدا کی جاتی ہے۔ وہ اپنے ملک کے دشمن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جاتے ہیں لیکن انہیں تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے بھی اور دشمن کے ملک کے بھی بادشاہ ہیں۔ تجربہ کر کے دیکھیں، کسی انتہائی گھٹیا اور بے وقار انسان کے سامنے جھک جائیں اور اسے فرشی سلام کریں تو وہ عجز و انکسار کی بجائے گردن کو اکڑا کر رعونت کا رنگ پیدا کر لے گا اور آپ کو چھوٹا سا آدمی سمجھے گا۔

عثمان کی شخصیت میں تو پہلے ہی خامیاں موجود تھیں۔ وہ امیر ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ انگریزوں کا پروردہ جاگیردار تھا اور عثمان ڈسکو سوسائٹی میں پلا اور بڑھا تھا۔ میجر ہوتے ہوئے وہ ڈسکو سوسائٹی کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی محفلوں میں جاتا تھا اور اس کے ذاتی اخراجات اتنے زیادہ تھے جو میجر تو دور کی بات ہے، بریگیڈیئر بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایسے انسان تو پھونک اور ہوا کو فوراً" قبول کرتے اور اپنی شخصیت غیروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ عثمان کے ذہن پر دو ہی چیزیں غالب تھیں ___ خوبصورت لڑکی اور روپیہ پیسہ ___ روپیہ پیسہ بھی اتنا جو ختم نہ ہونے پائے اور جس ذریعے سے بھی ملے، حلال ہے۔ عورت بازی کے ساتھ روپے پیسے کا جو تعلق ہے وہ لازم و ملزوم ہے۔ عورت کوئی عام قسم کی ہو تو اور بات ہے، عورت لوسی اور فوزی جیسی تربیت یافتہ ہو تو پیسے کے ساتھ دین و ایمان بھی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

کھانے کے بعد راما راؤ اور فوزی کمرے سے نکل گئے۔ لوسی عثمان کو اپنے کمرے میں لے گئی اور کافی وہیں منگوالی۔

"فوزی لاہور جا رہی ہے" ___ لوسی نے عثمان سے کہا ___ "میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ تمہاری زندگی میں میرا جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ فوزی ایسے طریقے سے پُر کر دے گی

کہ تم مجھے بھول جاؤ گے"۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں بھول جاؤں؟" ـــ عثمان نے پوچھا۔

"ہاں عثمان!" ـــ لوسی نے کہا ـــ "میں یہی چاہتی ہوں اور اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ میرے اغوا نے صورتِ حال بدل ڈالی ہے۔ میں شاید انڈیا چلی جاؤں۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری زندگی میں کوئی خلا پیدا ہو۔ میں تمہیں اپنے سے زیادہ خوبصورت لڑکی دے کر جا رہی ہوں۔ تمہارا خوب ساتھ نبھائے گی"۔

"میں شاید تمہیں دل سے اتار نہ سکوں" ـــ عثمان نے کہا ـــ "لیکن اب ایک پہلو میرے سامنے آگیا ہے۔ تم نے اپنی اصل حقیقت بتا کر میرا کام کچھ آسان کر دیا ہے۔ تم نے میرے ساتھ جو محبت کی ہے وہ اسی کام کے لئے کی تھی جو تم نے اب مجھے بتایا ہے اور اب تم اپنی جگہ ایک اور لڑکی مجھے دے کر جا رہی ہو .... لیکن لوسی تمہاری کمی تم ہی پوری کر سکتی ہو، پھر بھی میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے میری پسند کی لڑکی مجھے دے دی ہے"۔

"عثمان!" ـــ لوسی نے کہا ـــ "لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔ ہم نے مرسڈیز اور پجارو کی جو بات چھیڑی تھی، وہ بلا مقصد نہیں۔ ہم تمہیں مرسڈیز دیں گے۔ اس کے علاوہ تمہیں ہماری وجہ سے جو سوشل سٹیٹس حاصل ہو گا وہ تم تصور میں نہیں لا سکتے.... میں کوئی زیادہ بات نہیں کروں گی۔ لاہور تمہیں وہی لوگ ملیں گے جنہیں میں اپنے رشتہ دار بتایا کرتی تھی۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتی ہوں کہ ایم اے خان دراصل مندر آھوجا ہے اور وہ میرا باپ نہیں۔ باقی ہدایات تمہیں وہاں سے مل جائیں گی .... میں فوزی کو تمہارے پاس بھیجتی ہوں پھر تم چلے جانا اور خیال یہ رکھنا کہ پہلے کی طرح وینا کو ناراض نہ کر دینا۔ اس کے ساتھ اس قدر پیار اور محبت کرنا کہ اس کا دماغ خراب ہو جائے"۔

کافی پیتے پیتے عثمان نے سرور اور خمار سا محسوس کرنا شروع کر دیا جیسے وہ یورپ کی اعلیٰ درجے کی شراب پی رہا ہو۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی کافی میں ایک خاص قسم کا نشہ شامل کر دیا گیا تھا جس کا کوئی ذائقہ نہیں تھا، البتہ اس کا اثر ایسا تھا جو انسان کو جہنم سے جنت میں پہنچا دیتا تھا۔

لوسی اٹھی اور عثمان کو اس نے ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اس طرح اپنے سینے سے

لگایا جیسے ماں اپنے بچے کو لگاتی ہے۔ یہ ان کی الوداعی ملاقات تھی جو اتنی جذباتی تھی کہ دونوں کی پسلیاں چٹخنے لگیں اور دونوں کی سانسیں ایک ہو گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں جسم ایک ہو گئے ہوں اور دونوں دل ایک دوسرے سے مل کر دھڑک رہے ہوں۔

اگر لوسی عثمان سے الگ نہ ہوتی تو عثمان اس جذباتی ملاپ میں رات یہیں گزار دیتا۔

"میں فوزی کو بھیجتی ہوں" ـــ لوسی نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

فوزی یوں کمرے میں داخل ہوئی جیسے وہ دروازے کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ عثمان نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ فوزی نئی نویلی دلہن کی طرح آہستہ آہستہ عثمان کی طرف بڑھی۔ اس کے چہرے پر دلہنوں والی شرمیلی سی مسکراہٹ تھی اور اس کے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ چلنا تو چاہتی ہے لیکن رکنا بھی چاہتی ہے۔ دو تین لمحوں بعد فوزی عثمان کے بازوؤں میں تھی۔

عثمان جب اس کمرے سے نکلا تو اس پر کچھ اور ہی نشہ طاری تھا۔ فوزی کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جس میں شرمیلا پن نمایاں تھا لیکن عثمان جیسی شخصیتیں یہ سمجھنے سے قاصر ہوتی ہیں کہ یہ مسکراہٹ شرمیلی نہیں بلکہ فاتحانہ ہے۔

عثمان جب ہوٹل میں اپنے کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے وینا کو دیکھا تو اس وقت بھی اس کے نتھنوں میں فوزی کے جسم اور سانسوں کی بُو رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک فوزی کے جسم کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ اس کیفیت میں وینا اسے اچھی نہ لگی لیکن اسے یاد آگیا کہ وینا کے ساتھ تو بنا کر رکھنی ہے۔

"لو وینا!" ـــ عثمان نے کہا ـــ "کام ہو گیا۔ آٹھ دس دنوں تک لوسی اور اس کے سارے گروہ کو تم جیل میں دیکھو گی۔ میں تمہیں جیل میں لے جا کر لوسی کو سزائے قید دکھاؤں گا اور گروہ کے ہر آدمی کو تم وہاں دیکھو گی"۔

"اللہ!" ـــ وینا نے خوش ہو کر اور دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا ـــ "آپ کتنے اچھے ہیں۔ میں اس خوبصورت چڑیل کو جیل میں دیکھنے ضرور جاؤں گی"۔

بجے سو گئے تھے۔ وینا عثمان کے گلے لگ گئی اور عثمان اسے اپنے بازوؤں میں بھینچتے ہوئے فوزی کے تصور میں گم ہو گیا۔

انبالہ کے فوجی ہسپتال میں صغیر کے فرار کی تفتیش شروع ہو چکی تھی اور یہ تفتیش ہسپتال کے مین گیٹ سے شروع ہوئی تھی۔ فرار کی رات جو آدمی مین گیٹ پر ڈیوٹی دے رہے تھے' انہوں نے بتایا کہ رات ساڑھے بارہ ایک بجے کے درمیان ایک آدمی اوور کوٹ پہنے ہوئے باہر نکلا تھا۔ اس نے چوکیدار سے کہا تھا کہ میرے ڈرائیور کو بلاؤ۔ چوکیدار کے جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی' ایک سوزوکی کار آئی جس میں ڈرائیور کے علاوہ دو آدمی' ایک آگے اور ایک پیچھے' بیٹھے ہوئے تھے اور ہسپتال سے نکلنے والا آدمی اس کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا اور کار چلی گئی۔

"نمبر تو نہیں دیکھا صاحب!" ـــ چوکیدار نے کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے ـــ "مجھے کچھ یوں شک ہوتا ہے کہ کار کا نمبر تھا ہی نہیں" ـــ چوکیدار پھر یاد کرنے کوشش کرنے لگا اور اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا ـــ "ہاں صاحب کار کے نہ آگے نمبر تھا نہ پیچھے"۔

"کیا تم ہسپتال سے نکلنے والے آدمی کا حلیہ بیان کر سکتے ہو؟"

چوکیدار سوچ میں پڑ گیا اور اس نے آہستہ آہستہ' سوچ سوچ کر صغیر کا حلیہ بیان لیکن وہ صغیر کا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکنے کی وجہ سے بیان نہ کر سکا۔

چوکیدار کے بیان سے تفتیش کرنے والے افسروں نے یہ رائے اخذ کی اوور کوٹ پہنے ہوئے یہ شخص اگر صغیر ہی تھا تو اسے مسلمانوں نے باقاعدہ پلان کے تحت فرار کروایا ہے اور اس میں ہسپتال کے سٹاف کے ایک دو آدمی ضرور شامل ہوں گے ڈاکٹر عبدالرشید پر بجا طور پر شک کیا جا سکتا تھا۔ وہ مسلمان تھا اور اس کے ساتھ بریگیڈیئر ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے پختہ شک ہے کہ صغیر کو انجکشن نہیں دیئے گئے انجکشن دینے کی ذمہ داری ڈاکٹر عبدالرشید کی تھی۔

"کیا گذشتہ رات ڈاکٹر عبدالرشید یہاں آئے تھے؟" ـــ انٹیلی جنس کے ایک نے ان آدمیوں سے پوچھا جو گیٹ پر ڈیوٹی پر تھے۔

"جی ہاں" ـــ چوکیدار نے جواب دیا ـــ "وہ تقریباً بارہ بجے آئے تھے اور پھر ا بجے کے کچھ بعد یہاں سے نکلے تھے"۔

"کیا یہ ڈاکٹر اس وقت یہاں سے گیا تھا جب اوور کوٹ والا آدمی گاڑی میں بیٹھ کر گیا تھا؟" ـــ تفتیشی افسر نے پوچھا۔

"جی ہاں" ـــ چوکیدار نے جواب دیا۔

تفتیشی افسروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہسپتال کے کمانڈنٹ بریگیڈیئر کے دفتر میں چلے گئے۔

"ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالرشید گذشتہ رات ڈیوٹی پر تھا؟" ـــ تفتیش کرنے والے میجر نے بریگیڈیئر سے پوچھا۔

بریگیڈیئر نے اس افسر کو بلایا جو اس سوال کا صحیح جواب دے سکتا تھا۔ اس افسر نے بتایا کہ گذشتہ رات ڈاکٹر عبدالرشید ڈیوٹی پر نہیں تھا اور ان دنوں اس کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی نہیں ہے"۔

"سر!" ـــ انٹیلی جنس کے میجر نے بریگیڈیئر سے کہا ـــ "ہمیں تفتیش کے لئے ایک کمرہ چاہئے پھر جب ضرورت ہوئی تو ہم جس جس کو بھی شامل تفتیش کریں گے اسے اپنے ہاں لے جائیں گے"۔

بریگیڈیئر کے حکم سے انہیں ایک الگ کمرہ دے دیا گیا اور ڈاکٹر عبدالرشید کو اس کمرے میں بلایا گیا۔

"ڈاکٹر صاحب!" ـــ میجر نے ڈاکٹر رشید سے پوچھا ـــ "کیا آپ گذشتہ رات ڈیوٹی پر تھے؟"

"نہیں" ـــ ڈاکٹر رشید نے جواب دیا۔

"پھر آپ ہاسپٹل میں کیوں آئے تھے؟"

"ایک مریض کو دیکھنے!" ـــ ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ـــ "کل اس کا آپریشن ہُوا تھا۔ چونکہ میں بھی اس آپریشن میں شامل تھا اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ رات کو مریض کو دیکھ آؤں"۔

"کیا ہر اُس مریض کو آپ رات کو دیکھنے آتے ہیں جس کا اس دن آپریشن ہُوا ہو؟"

"ہر مریض کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا" ـــ ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ـــ "بعض مریض ایسے ہوتے ہیں جنہیں دیکھنا ضروری ہوتا ہے مثلاً" اس مریض کے پتے میں پتھریاں تھیں اس لئے یہ پتّہ نکالنا ضروری تھا۔ پتّہ نکال دیا جائے تو پہلے ایک دو دن کے دوران کوئی پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے"۔

"یہ مریض کون سے وارڈ میں ہے؟" ___ میجر نے پوچھا ___ "اس کا نام کیا ہے اور بیڈ کا نمبر کیا ہے؟"

ڈاکٹر عبدالرشید نے اس مریض کا نام' بیڈ نمبر اور وارڈ بتا دیا۔ پھر میجر نے اپنے ساتھی تفتیشی افسر کو اس وارڈ میں بھیجا۔ یہ افسر واپس آیا تو اس نے بتایا کہ رات بارہ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر عبدالرشید اسے دیکھنے آیا تھا اور اس مریض نے تصدیق کی کہ اس کا پتّا کل نکالا گیا تھا۔

"کیا آپ نے بارہ سے ایک بجے تک اسی مریض کے ساتھ وقت گذارا؟"

"جی نہیں" ___ ڈاکٹر رشید نے کہا ___ "میں نائٹ ڈیوٹی والے ڈاکٹر کے پاس بیٹھ گیا تھا اور باتیں کرتے کرتے ایک بج گیا"۔

ڈیوٹی ڈاکٹر چونکہ نائٹ ڈیوٹی پر تھا اس لئے ڈاکٹر عبدالرشید کے جواب کی تصدیق نہ ہو سکی۔

"کیا آپ رات کو صغیر کے کمرے میں گئے تھے؟"

"نہیں" ___ ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ___ "اسے رات کو دیکھنا قطعاً" ضروری نہیں تھا اس لئے اُدھر نہ گیا"۔

انٹیلی جنس کا ایک کیپٹن ان دو افسروں سے الگ تھلگ ہسپتال کے ملازموں سے پوچھ گچھ کرتا پھر رہا تھا۔ اس کے سامنے سوال یہ تھا کہ رات بارہ بجے سے کچھ دیر پہلے یا بعد صغیر کے کمرے میں ہسپتال کا یا باہر کا کوئی آدمی صغیر کے کمرے میں گیا تھا یا اس کمرے کے باہر ویسے ہی کھڑا کوئی آدمی دیکھا گیا تھا۔

ایک نرسنگ سپاہی نے بتایا کہ اس نے رات بارہ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر عبدالرشید کو صغیر کے کمرے میں جاتے اور پھر آتے دیکھا تھا۔

ایک اور ملازم نے بتایا کہ اس نے دیکھا تھا کہ ڈاکٹر عبدالرشید کمرے سے نکل گیا تو ایک دو منٹ بعد اوورکوٹ پہنے ہوئے ایک آدمی کمرے سے نکلا اور باہر کی طرف چلا گیا تھا۔

کیپٹن نے یہ اطلاع تفتیش کے انچارج میجر کو دی۔ اس وقت ڈاکٹر عبدالرشید سے ہی پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔

"اب بتائیں ڈاکٹر صاحب!" ___ میجر نے ڈاکٹر عبدالرشید سے کہا ___ "اب اپنی

پوزیشن واضح کریں۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ صغیر کے کمرے میں نہیں گئے تھے اور ہاسپٹل کے دو آدمی بتا رہے ہیں کہ آپ اس کمرے میں گئے تھے"۔

"دیکھئے میجر صاحب!" ___ ڈاکٹر رشید نے کہا ___ "میں ڈاکٹر ہوں اور ڈاکٹر وارڈوں میں ہی گھومتے پھرتے اور مریضوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کس مریض کے پاس گئے تھے اور...."

تفتیش کرنے والے دونوں میجر اکٹھے ہی ہنس پڑے اور ڈاکٹر رشید چپ ہو گیا۔

"ڈاکٹر عبدالرشید صاحب!" ___ ایک میجر نے بڑے آرام سے کہا ___ "سچ بول دیں۔ آپ یقیناً" بڑے اچھے اور معزز خاندان کے فرد ہیں' تب ہی تو آپ ڈاکٹر بنے ہیں۔ اگر آپ نے سچ نہ بولا تو آپ وہ کچھ برداشت نہیں کر سکیں گے جو ہمارے تفتیشی سنٹر میں ہو گا۔ یہ مریض ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے خلاف کوئی قانونی یا محکمانہ کارروائی نہیں کی جائے گی"۔

"اور ڈاکٹر صاحب!" ___ دوسرے میجر نے کہا ___ "ان تین آدمیوں کے نام اور ایڈریس بھی ہمیں بتا دیں جو اس مریض کو سوزوکی کار میں لے گئے تھے.... ڈاکٹر صاحب! اس شہادت کو جو آپ کے خلاف ملی ہے' آپ غلط ثابت نہیں کر سکیں گے۔ آپ ڈاکٹر ہیں۔ ہم آپ کا اس سے زیادہ احترام کرتے ہیں جو عام طور پر ڈاکٹروں کا کیا جاتا ہے"۔

ڈاکٹر عبدالرشید کو پہلے تو یوں لگا جیسے وہ کمرہ جس میں تفتیش ہو رہی تھی' ایک چکر میں گھوم رہا ہو۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے خلاف شہادت واقعی مضبوط ہے جسے وہ جھٹلا نہیں سکے گا۔ اسے معلوم تھا کہ اقبال جرم کی صورت میں اسے بخشا نہیں جائے گا۔ جیل جانے کے علاوہ اس کا ڈاکٹری کا لائسنس ہمیشہ کے لئے منسوخ کر دیا جائے گا۔ اس کی تو ساری زندگی تباہ ہو گئی تھی۔ اس کا دماغ بڑی تیزی سے سوچنے لگا۔ اسے ان ساتھیوں کا خیال آیا جنہوں نے اس کا ساتھ دیا تھا اور صغیر کو کامیابی سے فرار کرایا تھا۔ اسے دوسرا خیال یہ آیا کہ انہوں نے کسی عورت کو اغوا نہیں کیا بلکہ ایک مسلمان ملک کی سلامتی کی خاطر ایک آدمی کو اپنے ہی ملک کا دشمن بنتے بنتے بچا لیا تھا۔

کمرہ جو ایک چکر میں گھوم رہا تھا' اچانک رک گیا اور ڈاکٹر عبدالرشید کے دل پر جو بوجھ آ پڑا تھا وہ یک لخت اتر گیا۔ اسے نمایاں طور پر محسوس ہوا جیسے اللہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ لیا ہے۔ اس کا ضمیر بیدار ہو گیا۔

"مت ڈرو رشید!" ــــ اس کی ذات سے جیسے اپنی ہی آواز اٹھی ہو ــــ "اسلام کی شمع اہل اسلام کے لہو سے جلتی ہے۔ قرآن کی سرزمین شہیدوں کے لہو سے لالہ زار بنی ہے۔ قربان ہو جاؤ اللہ تمہارے ساتھ ہے"۔

"ڈاکٹر عبدالرشید صاحب!" ــــ ایک میجر کی آواز سنائی دی ــــ "اتنی گہری سوچ میں نہ پڑیں۔ ہم آپ کی پوری مدد کریں گے۔ آپ ہماری مدد کریں"۔

"کیا یہ مریض آپ کا قیدی تھا؟" ــــ ڈاکٹر رشید نے پوچھا۔

"فضول باتیں نہ کریں ڈاکٹر صاحب!" ــــ میجر نے کہا ــــ "وہ ہمارا قیدی تھا، نہیں، بہرحال وہ ہمارا آدمی تھا اور آپ نے اسے غائب کر کے ہمیں کوئی ذاتی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس ملک کو نقصان پہنچایا ہے جس کے آپ باشندے ہیں اور آپ کے اس جرم کو غداری کہا جاتا ہے"۔

"اور آپ نے اپنے ملک کے ایک دشمن ملک کی مدد کی ہے" ــــ دوسرے میجر نے کہا ــــ "میں آپ کو آخری مرتبہ کہتا ہوں کہ سچ بول دیں اور ہم سے عزت کروائیں"۔

"میجر صاحب!" ــــ ڈاکٹر رشید نے کہا ــــ "میں آپ کو کوئی بیان نہیں دوں گا۔ مجھے اپنے سب سے بڑے آفیسر کے پاس لے چلیں۔ میں انہیں بیان دوں گا"۔

"ہمیں صرف یہ بتا دیں کہ صغیر کو آپ نے فرار کروایا ہے؟"

"جی ہاں" ــــ ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ــــ "میں پورا بیان آپ کے کسی بریگیڈیئر یا جنرل کو دوں گا"۔

"اس کی کوئی وجہ؟"

"آپ دونوں بہت چھوٹے آفیسر ہیں" ــــ ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ــــ "اور میری کارروائی جسے آپ جرم اور غداری کہتے ہیں، بہت بڑی ہے۔ آپ کو دیا ہوا میرا بیان کسی سٹیج پر موڑا توڑا جا سکتا ہے۔ میں پوری ذمہ داری سے کسی ذمہ دار آفیسر کو بیان دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں"۔

"اگر ہم کہیں کہ بیان صرف ہمیں دیں تو آپ کیا کریں گے؟" ــــ ایک میجر نے پوچھا۔

"میں بیان نہیں دوں گا" ــــ ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ــــ "اور پھر آپ کو پریشانی

کا سامنا ہو گا"۔

ایک میجر اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ دوسرا میجر ڈاکٹر عبدالرشید سے تفتیش کرتا رہا۔

"ڈاکٹر عبدالرشید صاحب!" ــــ اس میجر نے کہا ــــ "ایک مسلمان نرس دن کی ڈیوٹی پر ہوتی ہے اور وہ صغیر کو اٹینڈ کیا کرتی تھی۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"دیکھو میجر!" ــــ ڈاکٹر رشید نے بھڑک کر کہا ــــ "اگر تم نے اس لڑکی کا نام بھی لیا تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گا۔ تمہاری پاور صرف اتنی ہے کہ تم انٹیلی جنس کے میجر ہو، ہندو ہو اور یہ تمہارا ملک ہے"۔

"کیا یہ آپ کا ملک نہیں ہے؟" ــــ میجر نے غصے میں آنے کی بجائے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں تمہارے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا" ــــ ڈاکٹر رشید نے کہا ــــ "صرف یہ کہتا ہوں کہ اس نرس کو صرف اس لئے پریشان نہ کرنا کہ یہ مسلمان ہے اور یہ صغیر کو اٹینڈ کرتی تھی۔ انڈیا میں کوئی مسلمان لڑکی اتنی بڑی کارروائی میں شامل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ یہ تو ایک معزز گھرانے کی شریف لڑکی ہے"۔

"اگر میں تفتیش نہ کر رہا ہوتا تو میں دیکھتا کہ آپ میرے دانت توڑنے کی بات کس طرح کرتے ہیں" ــــ میجر نے کہا ــــ "میں آپ کا چیلنج قبول کر کے آپ کو کہتا کہ آؤ اور میرے دانت توڑ کر دکھاؤ۔ پھر دیکھتے کہ دانت کس کے ٹوٹتے ہیں .... آپ اچھے خاصے خطرناک آدمی نظر آتے ہیں۔ آپ پر پاکستان کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا جا سکتا ہے"۔

"لگا دیں" ــــ ڈاکٹر رشید نے طنزیہ سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ــــ "جھوٹ تو تمہاری قوم کا قابل فخر وصف ہے"۔

میجر ہنس پڑا۔

اتنے میں دوسرا میجر آ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے چلو" ــــ اس میجر نے کہا ــــ "جنرل صاحب نے کہا ہے کہ انہیں میرے پاس لے آؤ"۔

⊙

کچھ دیر بعد ڈاکٹر عبدالرشید انڈین انٹیلی جنس کے جنرل کے سامنے بیٹھا ہُوا تھا۔

"کیا وجہ ہے کہ آپ صرف مجھے بیان دینا چاہتے ہیں؟" —— جنرل نے پوچھا۔

"میں صرف بیان نہیں دینا چاہتا جنرل صاحب!" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا۔

"میں اقبالی بیان دینا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کے دونوں میجروں کو بتا دیا تھا کہ میں نے انہیں بیان دیا تو اسے موڑا توڑا بھی جا سکتا ہے"۔

"چلئے میں آپ کا بیان سن لیتا ہوں" —— جنرل نے کہا —— "اس کے بعد آپ کا بیان ریکارڈ کیا جائے گا"۔

"جنرل صاحب!" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے اپنا بیان ان الفاظ میں شروع کیا۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔ آپ جانتے ہیں ڈاکٹر کا کام ہے مریض اور زخمی کا علاج معالجہ۔ مریض یا زخمی دشمن ملک کا ہو تو بھی ڈاکٹر کا فرض ہے کہ وہ اس کا علاج اپنا دوست اور ایک انسان سمجھ کر کرے۔ یہ زخمی آیا تو اس کے علاج کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ اسے گلوکوز اور تازہ خون دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے انجکشن دیئے گئے کہ یہ ایک انجکشن روزانہ گلوکوز کی نالی میں زخمی کو دینا ہے۔ میں نے انجکشن دیکھے تو میں پریشان ہو گیا۔ میں بھی تو آخر ڈاکٹر ہوں۔ اس زخمی کو ایسے انجکشنوں کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے ایسے انجکشنوں کی ضرورت تھی کہ اس کے زخم میں پس نہ پڑے اور زخم خراب نہ ہونے پائے یا خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اسے طاقت کے انجکشنوں کی ضرورت تھی لیکن جو انجکشن اسے دیئے جانے لگے وہ تو کچھ اور ہی اثر رکھتے تھے۔ میں نے انچارج میجر ڈاکٹر کے ساتھ بات کی تو اس نے بتایا کہ یہ زخمی انٹیلی جنس کا ہے اور اسے انجکشن ضرور دینے ہیں ....

"میں نے حکم کی تعمیل شروع کر دی لیکن میرا ضمیر میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ایک روز اس زخمی سے پوچھا کہ اسے نیند نہیں آتی یا وہ ذہنی طور پر کسی قسم کی بے چینی محسوس کرتا ہے جو اس کی برداشت سے باہر ہے؟ .... اس نے بتایا کہ وہ کچھ بھی محسوس نہیں کرتا سوائے اس کے کہ وہ زخم میں درد محسوس کرتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ یہ انجکشن نہ لے تو بہتر ہے۔ اس نے کہا کہ وہ ڈاکٹروں کو کیسے مشورہ دے سکتا ہے کہ اسے فلاں دوائی نہ دی جائے اور فلاں دوائی دی جائے ....

"چونکہ میں ہی اسے اٹینڈ کر رہا تھا اس لئے کچھ بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ اس نے

بتایا کہ وہ پاکستانی ہے۔ مجھے اس نے شاید اس لئے اعتماد میں لے لیا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ قدرتی طور پر میں نے اس سے پوچھنا شروع کر دیا کہ وہ کہاں اور کیسے زخمی ہُوا ہے۔ تب اس نے بتایا کہ وہ انڈین انٹیلی جنس کا ایجنٹ ہے اور پاکستان میں جاسوسی کرتا ہے .... جنرل صاحب! میں مسلمان ہوں۔ یہ ایسا رشتہ ہے جو مجھے پاکستان سے لاتعلق نہیں ہونے دیتا"۔

"اس کا مطلب یہ ہُوا ڈاکٹر عبدالرشید!" —— جنرل نے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا —— "کہ آپ کی وفاداری پاکستان کے ساتھ ہے۔ کیا آپ اسے جرم نہیں سمجھتے؟"

"اگر بات بحث مباحثے کی ہے تو میں آپ کو تسلی بخش جواب دوں گا جنرل صاحب!" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا —— "پاکستان کے ساتھ میری وفاداری اس حد تک ہے کہ یہ ایک مسلمان ملک ہے اور یہ میرے باپ اور دادا کی جدوجہد کا حاصل ہے۔ میں ذاتی طور پر پاکستان کو اتنا ہی مقدس سمجھتا ہوں جتنا سرزمینِ عرب کو .... اور انڈیا کے ساتھ میری وفاداری اس لئے ہے کہ یہ میرا ملک ہے جہاں میں پیدا ہُوا تھا اور جو میرے خاندان کو پال پوس رہا ہے"۔

"لیکن آپ نے اپنے اس ملک کے ساتھ غداری کی ہے" —— جنرل نے کہا —— "میں نے ابھی آپ کا پورا بیان نہیں سنا اس لئے میری جرح بے موقع ہے۔ میں نے یہ بات یہ فرض کر کے کہی ہے کہ آپ اقبال جرم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ پاکستان ہمارے ملک کا دشمن ہے"۔

"جنرل صاحب!" —— ڈاکٹر رشید نے کہا —— "جہاں تک بھولنے اور نہ بھولنے کا تعلق ہے، مجھے اور بھی بہت کچھ یاد ہے جو میں نہ صرف یہ کہ مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا بلکہ یہ یادیں اپنے بچوں کے ذہنوں میں منتقل کر کے مروں گا۔ میں تو اُس وقت پیدا بھی نہیں ہُوا تھا۔ آپ اُس وقت نوجوانی کی عمر میں ہوں گے۔ آپ نے اپنی آنکھوں دیکھا ہو گا کہ ہندوؤں اور سکھوں نے کس طرح مسلمانوں کو قتل کیا تھا اور ان کی بیٹیوں کو اغوا اور بے آبرو کیا تھا۔ ان کے گھر لُوٹے تھے۔ ان کے گھروں کو نذر آتش بھی کیا تھا اور جو مسلمان کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے وہ یہاں سے پاکستان کی سرحد تک پا پیادہ، بھوکے پیاسے اور دہشت زدہ کس طرح پہنچے ہوں گے۔ مجھے یہ دردناک

داستان میرے والد صاحب نے سنائی تھی اور میں یہ اپنے بچوں کو سناؤں گا۔ آپ اُس وقت یقیناً نوجوان تھے۔ آپ نے بھی دو چار مسلمانوں کو قتل کیا ہو گا"۔

"سنو ڈاکٹر!" ___ جنرل نے جرنیلوں کی طرح کہا ___ "یہ باتیں کہہ کے تم اپنے جرم کی تصدیق کر رہے ہو"۔

"یس سر!" ___ ڈاکٹر عبدالرشید نے جرأت مندی سے کہا ___ "اگر اپنی قوم کے شہیدوں کو اور ان مظلوموں کو یاد رکھنا اور ان کی باتیں کرنا جرم ہے تو میں اس جرم مجرم ہوں۔ مجھے سزا دیں .... اور جنرل صاحب! میں کیسے آنکھیں بند کر سکتا ہوں مسلمانوں کا قتل عام اب بھی جاری ہے۔ ان کے گھر اب بھی لُٹ رہے ہیں .... اور میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ مسلمان لڑکیوں کے باپوں اور بھائیوں کو مجبور کر کے ان شادیاں ہندوؤں کے ساتھ کرائی جا رہی ہیں۔ انہیں ترقی اور روپے پیسے کے لالچ د جاتے ہیں۔ اگر کوئی ہندو لڑکی کسی مسلمان کے ساتھ اپنے دل سے مجبور ہو کر شادی لے تو ہندو اس پوری مسلمان آبادی پر قاتلانہ حملے شروع کر دیتے ہیں بلکہ باقاعدہ حملہ دیتے ہیں"۔

"پلیز ڈاکٹر!" ___ جنرل نے اکتائے ہوئے سے لہجے میں کہا ___ "اس وقت تم زخمی کے فرار کی بات کرو۔ میں یہ سمجھ گیا ہوں کہ تم پسِ پردہ پاکستانی ہو اور تم جیسے انڈین مسلم پاکستان کے جاسوس بنتے ہیں۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تمہارے اندر انڈیا خلاف اور ہندوؤں کے خلاف زہر بھرا ہوا ہے۔ تم اس ملک کے لئے خطرناک ثابت سکتے ہو اور ہو چکے ہو .... پہلے اپنا بیان پورا کرلو"۔

"میں بالکل صحیح جواب دے رہا ہوں جنرل صاحب!" ___ ڈاکٹر رشید نے کہا۔ "میں کہہ رہا تھا کہ اس نے بے تکلفی سے مجھے بتا دیا کہ وہ پاکستانی ہے اور انڈیا کے جاسوسی اور تخریب کاری کرتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ اس سلسلے میں باتیں کیں اس نے کہا کہ وہ یہاں سے پاکستان جانا چاہتا ہے لیکن اس کی مدد اور رہنمائی کرنے و کوئی نہیں"۔

"اسے ایک خاص قسم کے انجکشن دیئے جا رہے تھے" ___ جنرل نے پوچھا۔ "کیا یہ انجکشن دینا تمہاری ذمہ داری تھی؟"

"یس سر!"

"کیا تم اسے باقاعدگی سے انجکشن دیتے رہے تھے؟"

"پہلے ایک دو دن دیئے تھے" ___ ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ___ "پھر ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ اسے نیند کی شکایت ہے یا وہ بے چینی محسوس کر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اسے ایسی کوئی پرابلم نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ پھر وہ یہ انجکشن نہ لے۔ اس نے وجہ پوچھی تو میں نے اسے بتایا کہ اس انجکشن کے اثرات کیا ہیں۔ پھر جب اس نے بتایا کہ وہ پاکستانی ہے اور انڈین انٹیلی جنس کا ایجنٹ ہے تو میں سمجھ گیا کہ ان انجکشنوں کے ذریعے اس کی برین واشنگ کی جا رہی ہے اور اسے یہاں اور زیادہ ٹریننگ دے کر پاکستان بھیجا جائے گا۔ میں جس کام کی تنخواہ لیتا ہوں' مجھے وہ کام کرنا چاہئے تھا۔ اگر میں نہیں کرتا تو یہ بددیانتی ہے لیکن میری دو حیثیتیں اور بھی ہیں اور میرے اندر ضمیر بھی ہے۔ میری ایک حیثیت تو یہ ہے کہ میں ڈاکٹر ہوں اور دوسری حیثیت یہ کہ میں مسلمان ہوں۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک آدمی کی شخصیت تبدیل کی جا رہی ہے' اس کا کردار اور اس کا ایمان مسخ کیا جا رہا ہے اور اسے آزادانہ طور پر کچھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کیا جا رہا ہے۔ یہ آدمی مسلمان ہے۔ اگر ہندو' سکھ' عیسائی یا کسی اور مذہب کا ہوتا تو بھی میں اسے ان انجکشنوں سے بچا لیتا۔ یہ میرے ضمیر کی آواز ہے۔ میں نے اس مریض کو یہ انجکشن دینے بند کر دیئے۔ اس کے نتیجے میں اس کا ذہن بیدار ہو گیا پھر اس نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہے"۔

"تم نے اسے یہاں سے بھاگ جانے پر اکسایا ہو گا" ___ جنرل نے کہا۔

"میرے اکسانے کی ضرورت ہی نہیں تھی" ___ ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا ___ "وہ خود میرے پیچھے پڑ گیا تھا کہ میں اسے یہاں سے فرار کراؤں۔ میں نے اسے فرار کرا دیا"۔

"کیسے؟"

"میں نے اسے اوور کوٹ اور کپڑے لا کر دیئے" ___ ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ___ "رات کو اسے ہسپتال سے نکال دیا"۔

"ہسپتال سے اسے کہاں لے گئے تھے؟" ___ جنرل نے پوچھا ___ "اور اسے کون لے گیا تھا؟ ان کے نام پتے وغیرہ بتاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ وہ سوزوکی کار کس کی تھی جس میں اسے لے جایا گیا تھا؟ اور یہ بھی بتاؤ کہ صغیر اس وقت کہاں ہے؟"

"بارڈر کے قریب پہنچ چکا ہو گا" ___ ڈاکٹر رشید نے جواب دیا۔

"میں پوچھ رہا ہوں کیسے؟" ـــ جنرل نے جرنیلوں کی طرح پوچھا ـــ "کس نے پہنچایا؟ کیسے پہنچایا؟"

"جنرل صاحب!" ـــ ڈاکٹر عبدالرشید نے ہونٹوں پر عجیب جذباتی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا ـــ "میں احمق نہیں ہوں نہ بزدل ہوں کہ آپ سے یا سزا سے یا سزائے موت کے ڈر سے بیان دے رہا ہوں۔ میں نے مسلمان کی حیثیت سے جو کیا ہے وہ اللہ کی راہ میں ٹھیک کیا ہے۔ مجھے اللہ کی خوشنودی چاہئے' آپ کی یا آپ کی حکومت کی نہیں۔ میں اپنے ایمان کی رُو سے بیان دے رہا ہوں۔ میں ایک جہاد کر رہا ہوں جو آپ کے لئے مذاق ہو گا لیکن یہ میرا ایک مقدس فرض ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ میرے دادا جان تحریکِ پاکستان کے سرگرم رکن تھے اور وہ گرفتار ہوئے اور چند مہینے انبالہ جیل میں رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ دادا جان کو دو تین دن حوالات میں رکھ کر ان پر اتنا تشدد کیا گیا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ جب وہ ہوش میں آئے تو ان کے منہ سے پہلی بات ایک گرج کی طرح یہ نکلی ـــ 'لے کے رہیں گے پاکستان .... زندہ باد پاکستان' ـــ میں اس دادا کے نقشِ قدم پر چل رہا ہوں"۔

"کیا پاکستان تمہیں ہمارے قانون سے چھڑا لے گا؟"

"نہیں" ـــ ڈاکٹر رشید نے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیا ـــ "میں نے پہلے کہا ہے کہ میں احمق نہیں ہوں۔ میں اس قسم کی انہونی بات سوچ ہی نہیں سکتا کہ پاکستان مجھے اس جرم کی سزا سے بچا لے گا۔ میں نے تو یہ سوچ کر یہ قدم اٹھایا ہے کہ میری اس کارروائی سے پاکستان کی سلامتی کو تقویت ملے گی"۔

"میں تمہیں ایک بات بتاؤں ڈاکٹر!" ـــ جنرل نے بڑے پیارے مگر طنزیہ سے لہجے میں کہا ـــ "پاکستان کچھ دنوں کا مہمان ہے۔ اگر تم پاکستان کے بل بوتے پر اس اپنے ملک انڈیا کی جڑیں کاٹ رہے ہو تو یوں سمجھو کہ تم دلدل میں کھڑے ایک طاقتور دشمن کو للکار رہے ہو۔ دشمن تمہارے قریب کھڑا ہنس رہا ہے اور دلدل تمہیں بڑی تیزی سے نگلتی چلی جا رہی ہے .... پاکستان اس وقت ایک دلدل کی مانند ہے جس میں اتنی ہمت نہیں کہ ایک دانہ بھی اگا سکے۔ یہ انسانوں اور حیوانوں کو ایک ہی طرح کھا جانے والی دلدل ہے۔ ایک دن یہ دلدل سوکھ جائے گی"۔

ڈاکٹر عبدالرشید طنزیہ سی ہنسی ہنس پڑا اور بولا ـــ "آساں نہیں مٹانا نام و نشاں

ہمارا!"

"تم کہتے ہو میں احمق نہیں ہوں" ـــ جنرل نے کہا ـــ "لیکن تم بہت ہی زیادہ احمق ہو۔ تم کس جذباتی اور خیالی دنیا میں رہ رہے ہو۔ ہمارا ایک ایجنٹ یہاں سے بھگا کر تم نے انڈیا کا کچھ بھی نہیں بگاڑا۔ پاکستان سے ہمیں اس ایک کی بجائے دس ایجنٹ مل جائیں گے۔ اس ایک ایجنٹ کو بھگا کر تم نے پاکستان کو کچھ نہیں دیا۔ البتہ اپنے پورے خاندان کا بیڑا غرق کر لیا ہے"۔

ڈاکٹر عبدالرشید پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو چکی تھی کہ اس کی آنکھوں میں چمک اور اس کے ہونٹوں پر جاندار مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی تاثر آ گیا تھا جو راہِ حق کے شہیدوں کے چہروں پر دیکھا جاتا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس بوڑھے جرنیل کو طفلِ مکتب سمجھ رہا ہو یا جسے ہندوستان کی زبان میں مورکھ بالک کہا جاتا ہے۔

"میں تمہیں آخری بار وارننگ دیتا ہوں" ـــ جنرل نے کہا ـــ "ان تمام آدمیوں کے نام اور ایڈریس بتا دو جو تمہارے ساتھ تھے اور اس سوزوکی کار کا نمبر اور اس کے مالک کا نام اور ایڈریس بھی بتا دو۔ یہ بھی بتا دو کہ صغیر اس وقت کہاں ہے۔ میں مان نہیں سکتا کہ رات بارہ بجے ایک آدمی یہاں سے فرار ہُوا ہو اور اس وقت تک بارڈر تک پہنچ چکا ہو"۔

"نہیں بتاؤں گا جنرل صاحب!" ـــ ڈاکٹر عبدالرشید نے بڑے مستحکم لہجے میں جواب دیا ـــ "میں نے اعتراف کر لیا ہے کہ اس جرم کا مجرم میں ہوں۔ میں نے اس پاکستانی کو انجکشن دینے بند کر دیئے تھے اور اس کی جو برین واشنگ آپ لوگوں نے کی تھی وہ صاف کر دی تھی اور اس میں یہ جذبہ بیدار کر دیا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور پاکستانی ہے اور اس کے ذہن پر قبضہ کر کے اسے اللہ کی سرزمین کی تباہی کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے ... میں نے اسے فرار کرایا اور پاکستان کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ اب آپ بارڈر سیکیورٹی کو الرٹ کر دیں کہ اس شخص کو روک لے۔ یہ آپ کا کام ہے۔ میں نے اپنا کام کر دیا ہے"۔

"اور وہ جو مسلمان نرس اس کمرے میں ڈیوٹی پر تھی ...."

"جنرل صاحب!" ـــ ڈاکٹر عبدالرشید نے جنرل کی بات پوری نہ ہونے دی اور میز پر ہاتھ مار کر بولا ـــ "وہ معصوم لڑکی اتنی جرأت نہیں کر سکتی کہ اتنے بڑے جرم میں

میرا ساتھ دیتی۔ پھر یہ بھی سوچیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر یہ لڑکی میرا ساتھ دینا چاہتی تو بھی میں اسے روک دیتا۔ ہم مسلمان اتنے بے غیرت نہیں کہ اپنی نوجوان اور کنواری لڑکیوں کو جاسوسی وغیرہ میں استعمال کریں۔ یہ کام آپ کی قوم کرتی ہے۔ آپ کی بیٹیوں کو پاکستان میں جاسوسی اور تخریب کاری کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ یہ ذلت اور بے غیرتی صرف آپ کی قوم یا یہودیوں کی قوم قبول کرلیا کرتی ہے کہ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو دوسرے ملکوں میں بھیج دیا جاتا ہے کہ وہ وہاں جاسوسی کریں اور اس کے عوض اپنی عصمت معاوضے کے طور پر دیتی پھریں.... آپ کا اشارہ جس نرس کی طرف ہے وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں کیا کررہا ہوں"۔

"تم اچھے خاصے بکواسی آدمی معلوم ہوتے ہو" ـــ جنرل نے کہا ـــ "میری ڈیوٹی ایسی ہے کہ میں تمہاری بکواس تحمل سے سن رہا ہوں۔ اگر باہر کہیں تم مجھ پر بے غیرتی اور ذلالت کا الزام لگاؤ تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں"۔

"جنرل صاحب!" ـــ ڈاکٹر رشید نے کہا ـــ "یہ مسئلہ میرا اور آپ کا ذاتی نہیں۔ ہم قومی سطح پر بات کررہے ہیں۔ آپ مسلمان قوم کی بہو بیٹیوں کو بُرا بھلا کہہ لیں میں نہیں بولوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی یعنی ہندو قوم کی نگاہ میں عورت کی عزت ہوتی ہی نہیں۔ آپ کو پنڈت چانکیہ نے یہ زریں اصول دیا تھا کہ اپنے دشمن کو نقصان پہنچانے کے لئے اپنی بیوی بھی اس کے حوالے کرنی پڑے تو کردو"۔

"شٹ اپ یو فول!" ـــ جنرل نے ڈاکٹر رشید کو ڈانٹتے ہوئے کہا ـــ "میں نے جو سوال پوچھے ہیں ان کے جواب دو"۔

"میں جواب دے چکا ہوں جنرل صاحب!" ـــ ڈاکٹر رشید نے کہا ـــ "میں اپنے سوا کسی اور کا نام نہیں بتاؤں گا"۔

"تم سب کچھ بتادو گے" ـــ جنرل نے کہا ـــ "میں تمہیں اُس جہنم سے بچانا چاہتا ہوں جس میں تمہاری ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔ تم سب کچھ اگل دو گے"۔

"میں جانتا ہوں جنرل صاحب!" ـــ ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا ـــ "میں اس کے لئے تیار ہوں۔ میں اُس بلال حبشیؓ کی یاد تازہ کردوں گا جنہیں گرم ریت پر لٹا کر کوڑے مارے جاتے تھے کہ وہ اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ لیں لیکن بلالؓ ہوش میں آتے تھے تو ان کے منہ سے پہلی بات یہ نکلتی تھی کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں"۔

"تم پر مذہب کا جنون طاری ہے" ـــ جنرل نے کہا اور پھر اپنے آپ سے بات کرنے کے انداز میں بولا ـــ "اُتر جائے گا۔ یہ جنون بھی اُتر جائے گا"۔

جنرل نے گھنٹی بجائی۔ اردلی اندر آیا اور اس نے سیلوٹ کیا۔ جنرل نے اسے ایک لیفٹیننٹ کرنل کا نام لے کر کہا کہ اسے اندر بھیجے .... ایک ہندو لیفٹیننٹ کرنل اندر آیا۔ اس نے سیلوٹ کیا۔

"اسے لے جاؤ" ـــ جنرل نے کرنل سے کہا ـــ "اس نے آدھا بیان دیا ہے مگر یہ اپنے ساتھیوں کے نام نہیں بتا رہا اور یہ بھی نہیں بتا رہا کہ ہمارا مفرور اس وقت کہاں ہے.... اور بارڈر سیکورٹی کو الرٹ کردو اور بتادو کہ اس حلئے کا آدمی آرہا ہے اور اسے روکا جائے"۔



جس وقت ملٹری ہاسپٹل سے انٹیلی جنس کے میجر ڈاکٹر عبدالرشید کو اپنے ساتھ تفتیشی سنٹر میں لے گئے تھے' اُس وقت ہسپتال کا ایک مسلمان ملازم کسی بہانے ہسپتال سے نکل گیا اور ڈاکٹر رشید کے گھر پہنچا۔ اُس وقت صغیر اس مکان کے ایک کمرے میں موجود تھا اور اس کے پاس تھوڑی ہی دیر پہلے وہ دو آدمی آئے تھے جو اسے فرار کی رات ملٹری ہسپتال سے سوزوکی کار میں یہاں لائے تھے۔ ہسپتال کا ملازم اس کمرے میں گیا جس میں صغیر اور یہ دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

"انہیں یہاں سے غائب کرو" ـــ ملازم نے ان دو آدمیوں سے کہا اور صغیر کی طرف اشارہ کیا ـــ "سراغ مل گیا ہے اور ڈاکٹر رشید صاحب کو انٹیلی جنس والے لے گئے ہیں"۔

"کیا ڈاکٹر رشید نے اپنا جرم تسلیم کرلیا ہے؟" ـــ ایک آدمی نے پوچھا۔

"تمہیں جو کچھ معلوم ہے وہ بتادو" ـــ دوسرے آدمی نے کہا۔

"شہادت ایسی ملی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اقبال جرم کرنا ہی پڑے گا" ـــ ہسپتال کے ملازم نے کہا ـــ "میں پوری خبر لیتا رہا ہوں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ تفتیش کرنے والوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ رات کو ڈاکٹر رشید ہسپتال میں بغیر کسی کام کے آئے تھے اور اس مریض کے کمرے سے ڈاکٹر کے ساتھ ایک آدمی اوورکوٹ پہنے ہوئے نکلا تھا' پھر یہ

شہادت بھی مل گئی ہے کہ اوورکوٹ پہنے ہوئے ایک آدمی رات ساڑھے بارہ بجے اور ایک بجے کے درمیان ہاسپٹل کے گیٹ سے نکلا تھا اور ایک بے نمبر سوزوکی کار میں بیٹھ کر چلا گیا تھا"۔

صغیر کا اور اس کے پاس بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کے چہروں کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ یہ خبر بُری تھی۔

"رشید ایسا کچا آدمی تو نہیں" —— ایک آدمی نے کہا —— "لیکن کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ اسے ٹارچر کریں گے تو وہ سب کچھ اگل دے گا"۔

ہاسپٹل کا جو ملازم آیا تھا' اس نے مشورہ دیا کہ صغیر کو فوراً" یہاں سے غائب کر دیا جائے۔

"غائب تو ہمیں بھی ہو جانا چاہئے" —— ڈاکٹر رشید کے ان ساتھیوں میں سے ایک نے کہا —— "ہماری گرفتاری صاف نظر آنے لگی ہے"۔

"نہیں" —— صغیر بول پڑا —— "ہو سکتا ہے ڈاکٹر رشید صاحب آپ کی نشاندہی نہ کریں۔ اگر انہوں نے اقبال جرم کر لیا ہے اور آپ کی نشاندہی نہیں کی اور آپ اگر غائب ہو گئے تو آپ پر شک کیا جائے گا۔ آپ یہیں رہیں۔ بھاگ کر جائیں گے بھی کہاں۔ اگر بھاگ جائیں گے تو آپ کے گھر کے بچے بچے کو پریشان کیا جائے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ سب لوگ مصیبت میں گرفتار ہوئے"۔

"ایسی بات نہ کہیں صغیر صاحب!" —— ایک آدمی نے کہا —— "ایسے کام خطرے مول لے کر ہی کئے جاتے ہیں۔ ہم نے ڈاکہ تو نہیں ڈالا نہ کسی عورت کو اغوا کیا ہے اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ آنے دو جس مصیبت کو آنا ہے۔ آپ نے ٹھیک مشورہ دیا ہے کہ ہمیں غائب نہیں ہونا چاہئے ورنہ ہمارے گھر والوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے اور گھر کی مستورات کو بھی ذلیل و خوار کیا جائے گا۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ اب کسی بھی لمحے اس گھر کی تلاشی ہو گی"۔

باتوں کا وقت نہیں تھا۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ ان لوگوں نے ہر قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے انتظام کر رکھا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر عبدالرشید کے والد صاحب کو کمرے میں بلایا اور انہیں بتایا کہ ان کا یہ کارنامہ کس مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر رشید کے بوڑھے باپ کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ انڈیا میں مسلمانوں

کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا' اس سے وہ بے خبر نہیں تھا۔ وہاں تو بہانہ تراش کر مسلمانوں کو پریشان اور ذلیل کیا جاتا تھا۔ اب تو ان کو ایک معقول بہانہ مل گیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالرشید کے متعلق باپ زیادہ پریشان ہُوا۔ ایک اس لئے کہ وہ پکڑا گیا تھا اور دوسرے اس لئے کہ انہوں نے اس بیٹے پر بہت زیادہ خرچ کر کر کے اسے ڈاکٹر بنایا تھا' وہ اس کا بڑا ہی قیمتی بیٹا تھا' اس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو مہینوں بعد خالدہ کے ساتھ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ یہ سب کچھ سوچ کر باپ کا چہرہ مرجھا گیا لیکن کچھ ہی دم بعد اس کی جھکی ہوئی کمر سیدھی ہو گئی اور سر اونچا ہو گیا۔

"اللہ مالک ہے" —— باپ نے کہا —— "ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ کی خوشنودی اور پاکستان کی سلامتی کے لئے کر رہے ہیں .... اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟"

"صغیر صاحب کو دوسری جگہ شفٹ کرنا ہے" —— باپ کو جواب ملا —— "ہم نے دوسری جگہ تیار کر رکھی ہے .... انہیں یہاں سے فوراً" نکالنا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹیلی جنس والے یا پولیس والے فوراً" یہاں آ جائیں اور چھاپہ ماریں"۔

"فوراً" نہیں" —— ڈاکٹر رشید کے باپ نے کہا —— "اگر صغیر صاحب کو اس وقت گھر سے نکالا گیا تو گلی میں کوئی دیکھ لے گا۔ یہ کام رات کو کرنے والا ہے"۔

"اتنا وقت نہیں" —— ایک آدمی نے کہا —— "ہم نے پہلے اس صورتِ حال سے نمٹنے کی سکیم بنائی تھی' ہم اس پر عمل کریں گے"۔

صغیر کو اٹھایا گیا اور اوورکوٹ پہنانے کی بجائے ایک بڑا اچھا کمبل اسے دیا گیا جو اس نے بڑے اچھے طریقے سے اوڑھ لیا۔ اس کے سر پر جناح کیپ رکھی گئی اور اوورکوٹ لپیٹ کر ساتھ رکھ لیا گیا۔ اسے اندر صحن میں لے گئے۔ وہاں سے سیڑھیوں کے ذریعے چھت پر گئے۔ ساتھ والا مکان بھی ایک مسلمان کا تھا۔ دونوں مکانوں کی چھتوں کے درمیان فصیل تھی۔ ڈاکٹر رشید کے باپ کے ساتھ جو باتیں ہوئی تھیں وہ ذرا لمبی تھیں۔ اس دوران سورج غروب ہو چکا تھا۔ اندھیرا زیادہ گہرا تو نہیں ہُوا تھا لیکن اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ کچھ دور سے اچھی طرح دیکھنا آسان نہیں رہا تھا۔

صغیر کو پہلے بتا دیا گیا تھا کہ شفٹ کس طرح ہونا ہے۔ چھت پر جا کر صغیر نے فصیل پھاندی اور ساتھ والے مکان کی چھت پر چلا گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ ایک آدمی ساتھ والے گھر کے مالک کو بتانے چلا گیا تھا کہ صغیر آ رہا ہے۔ صغیر چھت پر چلا تو اسے سیڑھیاں نظر آ

گئیں۔ وہ ان سیڑھیوں سے اتر گیا۔ سیڑھیوں میں اس گھر کا ایک آدمی اور ایک آدمی جسے صغیر جانتا تھا اس کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔

اس گھر میں صغیر کو بٹھایا نہیں گیا۔ چند منٹ وہ صحن میں ہی کھڑے رہے اور صغیر کو بتایا گیا کہ اب اسے کہاں لے جایا جائے گا۔ اس گھر کا آدمی باہر نکلا اور اس کے پیچھے صغیر نکلا۔ دونوں اکٹھے ایک طرف چل پڑے۔ اب اگر کسی نے صغیر کو اس گھر سے نکلتے دیکھا بھی تھا تو یہ کوئی خطرے والی بات نہیں تھی۔ اگر صغیر ڈاکٹر کے گھر سے نکلتے دیکھ لیا جاتا تو دیکھنے والا یہ گواہی دے سکتا تھا کہ فلاں وقت اس گھر سے ایک اجنبی نکلا تھا۔

صغیر اس آدمی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ وہ گلی کی نکڑ سے مڑے اور چند گھر آگے جا کر ایک معمولی سے مکان میں داخل ہو گئے۔

"اب آپ کے کچھ دن یہاں گزریں گے" ——اس آدمی نے صغیر سے کہا—— "یہ ہمارے ایک غریب سے دوست کا گھر ہے۔ اس گھر پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس گھر کے آدمی اتنا بڑا جرم کرنے کی جرأت رکھتے ہیں"۔

اس گھر میں دو بھائی اکٹھے رہتے تھے۔ ایک بھائی شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا اور دوسرا کالج میں فورتھ ایئر میں پڑھ رہا تھا۔ بڑا بھائی ایک سرکاری دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ چھوٹا بھائی پڑھتا بھی تھا اور ٹیوشن بھی پڑھاتا تھا اور اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کرتا تھا۔ ان کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ یہ گھرانہ تنگ دست تو نہیں تھا لیکن دو وقت کی روٹی اور ضروریاتِ زندگی ذرا مشکل سے ہی پوری ہوتی تھیں۔ انہیں لوئر مڈل کلاس بھی کہا جا سکتا تھا اور غریب بھی لیکن دین و ایمان اور جذبے کے لحاظ سے یہ دونوں بھائی مالا مال تھے۔ ان کے اس جذبے کو دیکھتے ہوئے ہی انہیں اعتماد میں لیا گیا تھا اور انہیں پہلے بتا دیا گیا تھا کہ ضرورت پڑی تو ایک پاکستانی کو ان کے ہاں ایک آدھ دن کے لئے چھپایا جائے گا۔ انہیں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ یہ آدمی کس نوعیت کا ہے اور اصل مسئلہ کیا ہے۔ دونوں بھائیوں نے اپنے تعاون کا اور ہر طرح کی قربانی دینے کا وعدہ خندہ پیشانی سے کیا تھا۔

صغیر کو جب اس گھر میں داخل کیا گیا تھا اُس وقت اندھیرا اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ کچھ دور سے نظر نہیں آتا تھا اور اُس وقت گلی میں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا۔

○

جس وقت صغیر کو اس گھر میں چھوڑ کر ڈاکٹر رشید کا ساتھی باہر آ رہا تھا' اُس وقت انڈین انٹیلی جنس کے دو افسر اور دو تین چھوٹے عہدوں کے آدمی ڈاکٹر رشید کے دروازے پر آن رکے۔ ڈاکٹر عبدالرشید ان کے ساتھ تھا اور اسے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی جسے انڈین آرمی کے ایک باوردی نائیک نے پکڑ رکھا تھا۔ باقی تمام افسر اور دیگر آدمی پرائیویٹ کپڑوں میں تھے۔ دروازے پر دستک دی گئی۔ رشید کے باپ نے دروازہ کھولا۔

دروازہ کھلتے ہی یہ تمام آدمی اندر چلے گئے۔ دو آدمی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ باقی کمروں کی تلاشی لینے لگے۔ گھر کی عورتوں کو جن میں رشید کی ماں' دو بہنیں اور ایک بھابی تھیں' بچوں سمیت الگ کھڑا کر لیا گیا۔

کمروں کی تلاشی اس طرح لی گئی کہ چارپائیوں کے نیچے بھی دیکھا۔ الماریاں' ٹرنک' اٹیچی کیس اور گدّوں رضائیوں والی پیٹی بھی کھول کر دیکھی گئی۔ باورچی خانے میں بھی گئے۔ کوڑے کباڑ والے سٹور میں سے ہر ایک چیز اٹھا اٹھا کر صحن میں پھینکی گئی۔ بیت الخلاء اور غسل خانہ بھی دیکھا گیا۔ یوں سمجھیں جیسے اس گھر کی نیچے کی مٹی اوپر کر دی گی اور اس کے بعد گھر کے افراد سے بڑے توہین آمیز طریقے سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ مستورات بچوں کے ساتھ ایک طرف کھڑی تھیں۔ ایک میجر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"یہاں ایک آدمی آیا تھا" —— میجر نے مستورات سے پوچھا —— "آیا تھا یا نہیں؟"

چاروں مستورات نے سر ہلا کر جواب دیا کہ یہاں باہر کا کوئی آدمی نہیں آیا تھا۔

"آپ کب کی بات کرتے ہیں؟" —— رشید کی ماں نے میجر سے پوچھا۔

"گذشتہ رات کی" —— میجر نے کہا —— "ہو سکتا ہے آج صبح آیا ہو"۔

"نہ جی!" —— ڈاکٹر رشید کی ماں نے جواب دیا —— "آپ گذشتہ رات اور آج صبح کی بات کرتے ہیں۔ یہاں تو ایک مدت سے باہر کا کوئی آدمی نہیں آیا نہ ہماری کہیں رشتہ داری ہے کہ ان میں سے کوئی آ جاتا .... یہ معاملہ کیا ہے؟ میرے بیٹے کو آپ نے ہتھکڑی کیوں لگا رکھی ہے؟ کیا اس نے کسی عورت کو اغوا کیا ہے یا کہیں ڈاکہ ڈالا ہے؟"

"تمہیں یہ بھی پتہ چل جائے گا" —— میجر نے جواب دیا —— "میں جو پوچھتا ہوں وہ بتاؤ۔ یہاں پاکستان کا ایک آدمی آیا تھا" —— میجر ڈاکٹر رشید کی بہنوں سے مخاطب ہوا ——

"تم بتاؤ۔ سچ نہیں بتاؤ گی تو بہت ذلیل ہو گی"۔

دونوں بہنوں نے بھی ماں والا جواب دیا۔

بچے بہت چھوٹے تھے اور وہ یہ دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے کہ یہ کوئی ڈاکو ہیں جو بغیر بتائے کمروں میں گھس گئے ہیں اور سامان الٹ پلٹ کر رہے ہیں۔ میجر نے ان سے بھی پوچھا کہ یہاں ایک آدمی آیا تھا۔ بچوں نے اور زیادہ رونا شروع کر دیا۔

مستورات کو صغیر کی موجودگی کا علم تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ صغیر کس قسم مہمان ہے اور یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دور میں صغیر کی ماں کی عمر سوا سترہ سال تھی۔ تحریکِ پاکستان کو مرد چلا رہے تھے۔ 1946ء میں جب تحریک کا عروج شروع ہُوا اور اس ایشو پر الیکشن شروع ہوئے کہ برصغیر میں مسلمان ایک الگ تھلگ قوم ہیں اور انہیں اپنی الگ اور آزاد مسلم مملکت ملنی چاہئے، مسلمان عورتیں خصوصاً کالجوں میں پڑھنے والی مسلمان لڑکیاں بھی میدان میں آ گئیں۔ صغیر کا باپ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے اس تحریک میں پیش پیش تھا۔ صغیر کی ماں میٹرک پاس کر کے گھر میں بیٹھی تھی۔ وہ بھی دوسری عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کے ساتھ تحریک میں شامل ہو گئی تھی۔ ہندو لڑکیاں انہیں کہتی تھیں کہ اگر پاکستان کا مطالبہ منظور ہو بھی گیا تو انبالہ پاکستان میں نہیں آئے گا اور پاکستان یہاں سے بہت دور بنے گا جہاں تک یہ پہنچ بھی نہیں سکیں گی پھر ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ کانگریس میں شامل ہو جائیں اور ہندوؤں کے لئے کام کریں تاکہ آزادی ملے تو انہیں پورا حصہ ملے۔

مسلمان لڑکیاں صرف یہ جواب دیتی تھیں کہ مسلمان ایک الگ تھلگ قوم ہے اور ہندو اور مسلمان اکٹھے رہ ہی نہیں سکتے۔

پھر ایسے ہی ہُوا کہ پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھرا اور انبالہ سے بہت دور معرضِ وجود میں آیا۔ اس وقت مسلمانوں کا جو قتلِ عام ہُوا وہ اس خاتون کو یاد تھا۔ انبالہ کے بیشتر مسلمان قتل ہوئے، زخمی ہوئے۔

ایک طرف اس ماں کا جوان بیٹا ہتھکڑیوں میں بندھا کھڑا تھا جسے سزا سے بچانے کے لئے یہ ماں اپنی جان بھی قربان کر سکتی تھی اور دوسری طرف پاکستان تھا جس کا تقدس اس کے دل میں رچا بسا ہُوا تھا۔ اسے وہ خون یاد آ گیا جو اس کی آنکھوں کے سامنے پاکستان کے نام پر بہایا گیا تھا۔ یہ ماں بڑے ہی کڑے امتحان میں آ گئی تھی۔ اس نے بار بار ک

جواب دیا کہ یہاں کوئی آدمی نہیں آیا تھا۔

انٹیلی جنس کے یہ افسر ایک کمرے میں چلے گئے اور آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔

"ڈاکٹر اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ مفرور کو اپنے گھر میں چھپا لیتا" ۔۔۔ ایک میجر نے کہا۔

"میں بھی تمہیں یہی مشورہ دینا چاہتا تھا" ۔۔۔ دوسرا میجر بولا ۔۔۔ "میں نے کمروں کو بہت ہی غور سے دیکھا ہے۔ مجھے کوئی ایسا سراغ نہیں ملا کہ یہاں کوئی باہر کا آدمی آیا ہو"۔

"جانے دے یار!" ۔۔۔ پہلے میجر نے طنزیہ سے لہجے میں کہا ۔۔۔ "تم کہاں کے فرشتے آ گئے ہو جو کمروں میں گھوم پھر کر بتا سکتے ہو کہ یہاں گھر کے آدمیوں کے علاوہ باہر کا کوئی آدمی بھی آیا تھا.... میری سنو۔ اس ڈاکٹر کو لے چلتے ہیں۔ صبح تک ہمارے پاؤں میں سر رکھ کر بتائے گا کہ مفرور کہاں ہے۔ مجھے اس کا باپ بھی بڑا گہرا آدمی لگتا ہے۔ یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کا باپ بھی اس کے جرم میں شامل ہے یا نہیں"۔

"میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں" ۔۔۔ دوسرے میجر نے کہا ۔۔۔ "یہ سارا محلہ مسلمانوں کا ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ اسے اس محلے کے کسی گھر میں چھپا کے رکھا گیا ہو"۔

"ہم سارے محلے کی تلاشی تو لے نہیں سکتے"۔

"کیوں نہیں لے سکتے؟" ۔۔۔ دوسرے میجر نے کہا ۔۔۔ "پورے محلے کو گھیر کر سب آدمیوں کو باہر نکال لیں گے، عورتوں کو گھروں میں رہنے دیں گے اور محلے سے باہر جانے کی کسی کو اجازت نہیں دیں گے"۔

"یہ کارروائی ہم خود تو نہیں کر سکتے" ۔۔۔ اس کے ساتھی میجر نے کہا ۔۔۔ "یہ تو جنرل صاحب کی اجازت لینی پڑے گی اور جنرل صاحب کو بھی شاید جی ایچ کیو سے پوچھنا پڑے گا.... یہ بھی سوچو کہ ڈاکٹر نے جنرل کو یہ بتایا ہے کہ مفرور کو پاکستان کی طرف رات کو رات روانہ کر دیا تھا۔ اگر میری رائے پوچھو تو میں اس خانہ تلاشی کو بیکار سمجھتا ہوں لیکن کچھ کارگزاری تو دکھانی پڑے گی"۔

"پھر یوں کرو" ۔۔۔ دوسرا میجر بولا ۔۔۔ "ان تمام گھروں کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں اور ہر گھر کے ہیڈ آف دی فیملی کو باہر بلا لیتے ہیں۔ اس سے یہ ہو گا کہ مفرور

کسی بھی گھر میں ہُوا تو اسے جلد از جلد یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ ہم اپنے مخبر ادھر ادھر کھڑے کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے ہمیں کچھ کامیابی حاصل ہو جائے"۔

"یہ کارروائی کی جا سکتی ہے" ـــــ اس کا ساتھی میجر بولا۔



رات کے ابھی دس ہی بجے تھے کہ محلے کے تمام گھروں پر باری باری دستک ہونے لگی۔ دروازہ کھلتا تو دروازہ کھولنے والے کو یہ حکم دیا جاتا کہ بڑے میاں کو باہر بھیجو۔ اس طرح تھوڑی ہی دیر میں ہر گھر کے بڑے میاں گلی میں اکٹھے ہو گئے۔ ان میں وہ آدمی بھی تھا جس کے گھر میں صغیر کو چھپایا گیا تھا۔ ہر شخص کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ سب سے زیادہ گھبراہٹ اُس شخص پر تھی جس کا گھر ڈاکٹر رشید کے پڑوس میں تھا اور جہاں سے صغیر کو اتار کر باہر نکالا گیا تھا، یا گھبراہٹ اُس شخص کے چہرے پر تھی جس کے گھر میں صغیر چھپا ہوا تھا۔

"آپ سب میرے باپ اور میرے بڑے بھائی ہیں" ـــــ انٹیلی جنس کے ہندو میجر نے ان لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ـــــ "میں دل کی گہرائیوں سے آپ کی عزت کرنا چاہتا ہوں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آپ سب کو بھی اپنی عزت کا خیال ہے یا نہیں؟"

"بیٹا!" ـــــ ایک ضعیف العمر مسلمان نے میجر سے پوچھا ـــــ "پہلے یہ تو بتائیں آپ ہیں کون؟ کیا آپ پولیس کے افسر ہیں، سی آئی ڈی کے ہیں یا آپ فوج سے تعلق رکھتے ہیں؟ پھر یہ بتائیں کہ اصل بات کیا ہے!"

"میں اصل بات پر آ رہا ہوں بڑے میاں!" ـــــ میجر نے کہا ـــــ "میں سی آئی ڈی کا آدمی ہوں اور تفتیش کے لئے آیا ہوں۔ پہلے آپ میری بات سن لیں پھر کوئی سوال کرنا ہے تو کر لینا۔ بات یہ ہے کہ ایک پاکستانی ویزا کے بغیر یہاں آیا ہے۔ اس کے پاس پاسپورٹ بھی نہیں اور وہ غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل ہُوا ہے۔ ہمیں مخبروں نے رپورٹ دی ہے کہ وہ اس محلے میں چھپا ہُوا ہے۔ میں آپ سے عزت اور احترام سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ جس کسی کے ہاں مہمان بن کے ٹھہرا ہُوا ہے وہ اسے ہمارے حوالے کر دے۔ ہم کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس طرح کا اجنبی مہمان آ جائے تو اسے گھر سے نکالا نہیں جا سکتا۔ میرے گھر کوئی ہندو اجنبی آ جائے اور کہے کہ میں مصیبت میں ہوں، مجھے پناہ دو تو میں اسے غیر قانونی طور پر بھی ضرور

دوں گا۔ آپ مسلمان ہیں۔ اگر پاکستان کا کوئی آدمی اس طرح آ کر آپ سے درخواست کرے کہ اسے ایک دو دنوں کے لئے پناہ دی جائے تو سچے مسلمان کی حیثیت سے آپ اسے ضرور پناہ دیں گے۔ میں آپ پر کوئی الزام نہیں لگاؤں گا۔ ہمیں صرف اس آدمی کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو یہ مہلت بھی دے سکتا ہوں کہ صبح تک وہ آدمی اس گلی میں کھڑا ہونا چاہئے اگر ایسا نہ ہُوا تو گھر گھر کی تلاشی لی جائے گی اور پھر جس گھر سے وہ شخص برآمد ہُوا اس کا انجام آپ جانتے ہیں کیا ہو گا"۔

یہ خبر تو سارے محلے میں پھیل گئی تھی کہ ڈاکٹر عبدالرشید کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس کے گھر کی تلاشی ہو رہی ہے۔ جس وقت یہ میجر لوگوں کو شریفانہ انداز میں دھمکیاں دے رہا تھا، ڈاکٹر رشید کو محلے سے باہر لے گئے تھے تاکہ محلے کا کوئی آدمی اسے دیکھ نہ سکے۔

میجر کے اس دھمکی آمیز خطاب کے بعد یہ لوگ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ انٹیلی جنس کے افسر الگ کھڑے رہے۔

"مہاراج!" ـــــ ایک معمر مسلمان نے میجر کے پاس جا کر کہا ـــــ "ہم نے ایک دوسرے سے پوچھا ہے۔ سب یہی جواب دیتے ہیں کہ کسی بھی گھر میں کوئی پاکستانی نہیں آیا اور نہ ہی کوئی اتنی جرأت کر سکتا ہے کہ ملک میں غیر قانونی طور پر آئے ہوئے کسی آدمی کو پناہ دے۔ اگر آپ اپنی تسلی کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے دروازے کھلے ہیں۔ آپ تلاشی لے لیں"۔

"ہم آپ سے پورا پورا تعاون کریں گے" ـــــ ایک اور معزز بزرگ بولا۔

انٹیلی جنس کے ان افسروں کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اتنے بڑے محلے کے ہر گھر کی تلاشی اوپر والوں کی اجازت کے بغیر نہیں لے سکتے تھے کیونکہ یہ مسئلہ فرقہ وارانہ سیاست کی صورت اختیار کر سکتا تھا۔ اس کے لئے انٹیلی جنس کو کوئی خاص ہی انتظام کرنا تھا۔ ان افسروں کو اپنا رعب بھی قائم رکھنا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان لوگوں کو مرعوب کئے رکھیں۔

"میں آپ سب کا مشکور ہوں" ـــــ ایک میجر بولا ـــــ "آپ نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا ہے۔ میں آپ کی اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس محلے میں کوئی پاکستانی نہیں آیا۔ آپ لوگ جائیں اور آرام کریں"۔

یہ کہہ کر انٹیلی جنس کے دونوں میجر وہاں سے ہٹ آئے۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" ــــ دوسرے میجر نے کہا ــــ "ان لوگوں کو ڈرا کر رکھنا تھا ا صبح تک کوئی نتیجہ برآمد ہو جاتا"۔

"تم انٹیلی جنس میں رہنے کے قابل نہیں ہو" ــــ پہلے میجر نے کہا ــــ "اگر م انہیں یہ دھمکی دیتا کہ صبح ہر گھر کی تلاشی ہو گی تو اگر ہمارا مفرور یہاں ہُوا تو اسے رات ہ رات غائب کر دیں گے۔ میں نے انہیں یہ یقین دلا دیا ہے کہ اب ہم اس محلے میں آئی گے ہی نہیں اور انہوں نے جو جواب دیا ہے وہ ہم نے قبول کر لیا ہے۔ ہم جا کر مخبروں انتظام کریں گے جو اس محلے پر نظر رکھیں گے"۔

محلے کے یہ سب آدمی گھروں کو جانے کی بجائے گلی میں کھڑے رہے اور آپس می اس واردات پر تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ سب ڈاکٹر عبدالرشید کے باپ کے ارد گر اکٹھے ہو گئے تھے اور اس سے پوچھ رہے تھے کہ ان کے گھر کی تلاشی کیوں ہوئی ہے۔

"دشمنی" ــــ ڈاکٹر عبدالرشید کے باپ نے بتایا ــــ "کسی دشمن نے ملٹری انٹ جنس کو غلط اطلاع دی ہے کہ غیر قانونی طور پر آیا ہُوا ایک پاکستانی اس گھر میں چھپا ہُ ہے"۔

"تو پھر معلوم کریں کہ یہ دشمن کون ہے" ــــ ایک بزرگ نے کہا ــــ "اس م میں سے تو کوئی ہو نہیں سکتا۔ کوئی ہندو ہی ہو گا"۔

"میرا خیال ہے ملٹری ہسپتال میں میرے بیٹے کا کوئی دشمن ہے" ــــ ڈاکٹر رش کے باپ نے کہا ــــ "سروس میں آپ جانتے ہیں اس قسم کی چپقلش اور دشمنی عداو پیدا ہو ہی جاتی ہے.... دیکھو بھائیو! وار بھی کتنا زبردست اور اوچھا کیا ہے"۔

یہ تو کوئی مان ہی نہیں سکتا تھا کہ ڈاکٹر عبدالرشید یا اس کے خاندان کا کوئی دشمن ہو سکتا ہے۔ یہ ایک معزز اور شریف خاندان تھا اور سارا محلہ اس گھر کا احترام کرتا تھا۔

بہر حال ڈاکٹر رشید کے باپ نے اصل واردات پر پردہ ڈال لیا۔

"مجھے ایک اور شک ہے" ــــ ایک معمر بزرگ نے کہا ــــ "یہ سب ڈرامہ ہے۔ ان بدبخت ہندوؤں نے ہمارے خلاف کوئی اوچھی کارروائی کرنے کا ایک بہا تراش لیا ہے۔ مجھے تو شک ہے کہ یہ جو آئے تھے، ان کا تعلق نہ پولیس کے ساتھ تھا فوج کی خفیہ پولیس کے آدمی ہیں۔ یہ ہمارے خلاف ایک فتنہ کھڑا کرنے آئے تھے ا

سمجھو کہ یہاں فساد ہُوا کہ ہُوا"۔

اب ڈاکٹر عبدالرشید کے باپ کو تو حقیقت معلوم تھی۔ اس نے سب کو تسلیاں دیں کہ گھبرائیں نہیں ہو سکتا ہے کوئی پاکستانی ادھر آ نکلا ہو۔

"پھر بھی" ــــ ایک اور بزرگ نے کہا ــــ "ہمیں چوکنا رہنا چاہیے۔ ہندوؤں کو یہاں مسلمانوں کے خلاف کوئی فساد کھڑا کرتے دیر تو نہیں لگتی۔ ہمارے گھروں کی تلاشی لینے کے بہانے یہ گھروں کو آگ بھی لگا سکتے ہیں اور لُوٹ مار بھی کر سکتے ہیں"۔

سب آدمی دل میں خوف و ہراس اور گھبراہٹ لئے ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔



وہ دونوں بھائی بھی جن کے گھر صغیر چھپا ہُوا تھا، ان لوگوں میں موجود تھے۔ وہ اپنے گھر گئے تو صغیر نے ان سے پوچھا کہ باہر کیا ہو رہا تھا۔

"انٹیلی جنس کے افسر آئے تھے" ــــ بڑے بھائی نے اسے جواب دیا ــــ "ڈاکٹر عبدالرشید کے گھر کی تلاشی ہوئی ہے اور یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ڈاکٹر عبدالرشید کو ہتھکڑیوں میں ساتھ لائے تھے"۔

صغیر بدک اٹھا اور اس کی آنکھیں اس طرح کھل گئیں جیسے اس کے ڈھیلے باہر آ جائیں گے۔

"تم تو کچھ زیادہ ہی گھبرا گئے ہو صغیر بھائی!" ــــ بڑے بھائی نے کہا ــــ "یہ تو ہونا ہی تھا"۔

"یہ نہیں ہونا چاہیے تھا عابد صاحب!" ــــ صغیر نے کہا ــــ "میں تم لوگوں سے اتنی بڑی قربانی نہیں مانگوں گا۔ میں گرفتاری کے لئے پیش ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر عبدالرشید کو چھڑوا لوں گا۔ میں کہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب کی سزا بھی مجھے دو"۔

"یہ حرکت نہ کر بیٹھنا صغیر بھائی!" ــــ عابد نے کہا ــــ "اگر تم پیش ہو گئے تو ہم دونوں بھائی بھی گرفتار ہو جائیں گے.... خطرہ ٹل گیا ہے۔ انٹیلی جنس کے افسر کہہ گئے ہیں کہ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ اس محلے میں کوئی پاکستانی نہیں آیا"۔

"میں انٹیلی جنس کا تربیت یافتہ آدمی ہوں" ــــ صغیر نے کہا ــــ "وہ تمہیں دھوکہ دے گیا ہے۔ وہ کسی بھی وقت آ کر گھر گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں اور میں تمہیں خبردار

کرتا ہوں کہ کل صبح ہی صبح وہ پولیس کو لے کر آئیں گے اور آپ سب کو باہر نکال کر گھر کی تلاشی لیں گے۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہئے"۔

"کہاں جائیں گے آپ؟" —— عابد کے چھوٹے بھائی رفیق نے پوچھا اور کہا۔ "عابد بھائی جان آپ سے کہہ چکے ہیں کہ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے کی حماقت نہ کرنا"۔

"میں ڈاکٹر رشید صاحب کو چھڑانا چاہتا ہوں" —— صغیر نے کہا —— "میں کہوں گا میں خود ہسپتال سے بھاگا تھا اور کسی نے بھی میری مدد نہیں کی"۔

"صغیر بھائی!" —— رفیق نے کہا —— "آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر رشید صاحب بڑی مضبوط شہادت کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔ آپ اس شہادت کو کس طرح جھٹلائیں گے؟"

"رشید تو پکڑا گیا ہے" —— عابد نے کہا —— "اسے تو چھوڑیں گے نہیں اور تم بھی پکڑے جاؤ گے۔ اب دیکھا جائے گا جو ہو گا"۔

"میرے بھائیو!" —— صغیر نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا —— "اگر میں یہاں چھپا رہا تو کل صبح ہی صبح چھاپہ پڑے گا اور آپ دونوں بھائی پکڑے جائیں گے۔ پھر اس گھر اور بچوں کا کیا بنے گا .... نہ بھائی نہ .... میں تم لوگوں سے اتنی بڑی قربانی نہیں لوں گا۔ میں آپ کی یہ بات مان لیتا ہوں کہ گرفتاری کے لئے پیش نہیں ہوں گا لیکن یہ نہیں مانوں گا کہ میں یہاں چھپا رہوں۔ یہاں چھاپہ اتنا زبردست پڑے گا کہ یہ کافر مجھے زمین کے نیچے سے بھی برآمد کر لیں گے پھر تمہارا اور تمہارے خاندان کا بیڑہ غرق ہو جائے گا۔ ..مجھے جانے دو" —— صغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں بھائیوں نے مل کر اسے پکڑ لیا اور اسے کہنے لگے کہ وہ اچھی طرح چل تو سکتا نہیں جائے گا کہاں اور کیسے!

"میں ان کافروں کے پاس نہیں جاؤں گا" —— صغیر نے پُرعزم لہجے میں کہا —— "میں رات ہی رات یہاں سے بہت دور نکل جاؤں گا۔ مجھے اللہ کے حوالے کر دو۔ تمہیں پھر کہتا ہوں کہ میں اپنی سلامتی کی خاطر تم جیسے سچے اور مخلص مسلمانوں کو تباہ برباد نہیں کروں گا۔ میں تمہارے بچوں کا مستقبل تاریک نہیں ہونے دوں گا۔ میں کہیں پکڑا گیا تو ٹھیک ہے۔ جیل میں پڑا رہوں گا۔ اگر کہیں مر مرا گیا تو اور زیادہ اچھا ہے"۔

صغیر یک لخت جذباتی ہو گیا اور کہنے لگا —— "میں نے جو گناہ کئے ہیں ان کی مجھے سزا ملنی چاہئے"۔

"کیا آپ کو اس علاقے سے کچھ واقفیت ہے؟" —— عابد نے پوچھا۔

"کیا آپ پاکستان کی طرف جانے والے راستے اور ذرائع جانتے ہیں؟" —— رفیق نے پوچھا۔

"اللہ میری راہنمائی کرے گا" —— صغیر نے کہا —— "اللہ میری مدد کرے گا .... میں تمہارے جذبے اور تمہارے خلوص کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔ معلوم نہیں پھر کبھی مل سکیں گے یا نہیں"۔

صغیر دونوں کو گلے لگا کر ملا۔ دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور صغیر کی جذباتی کیفیت تو یہ تھی کہ روتے روتے سسکنے لگا اور اسی کیفیت میں وہ اس گھر سے نکل گیا۔ اسے نہ کسی راستے سے واقفیت تھی نہ اس علاقے سے واقف تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس کی ٹانگ زخمی تھی اور وہ اچھی طرح چل نہیں سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خطرہ یہ کہ لنگڑانے کی وجہ سے وہ شک میں پکڑا بھی جا سکتا تھا۔ انٹیلی جنس کے مخبروں کو بتا دیا گیا تھا کہ مفرور کی ٹانگ زخمی ہے اور وہ ٹھیک طرح چل نہیں سکتا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔

انبالہ سے دور، بہت دور لاہور کی ایک کوٹھی میں میجر عثمان ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ فوزی اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا سر عثمان کے کندھے پر تھا۔ اس کا ایک بازو عثمان کی کمر کے گرد لپٹا ہوا تھا اور عثمان نے فوزی کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ فوزی کے ریشم جیسے نرم و ملائم بال میجر عثمان کے ایک گال سے مس کر رہے تھے اور عثمان پر بے خودی طاری تھی۔ اس نشیلی کیفیت کے لئے وہ پورے پاکستان کی قیمت دینے پر تیار ہو چکا تھا۔

اس کے گھر میں وینا اس خوش فہمی میں مبتلا سو گئی تھی کہ عثمان اسے واپس مل گیا ہے اور اب وہ لُوسی اور اس کے گروہ کو پکڑوا دے گا۔

اگلی صبح انٹیلی جنس کا بریگیڈیئر اپنے آفس میں داخل ہونے لگا تو اُس نے دیکھا کہ وہ میجر اور کیپٹن جو صغیر کے فرار کی تفتیش کر رہے تھے اُس کے آفس کے باہر کھڑے تھے۔

"کیا رپورٹ ہے؟" — بریگیڈیئر نے اُن سے پوچھا اور اپنے دفتر میں داخل ہو گیا۔

میجر اور کیپٹن اُس کے پیچھے پیچھے اُس کے دفتر میں گئے۔ بریگیڈیئر نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُنہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں بیٹھ گئے۔

"رات کیا ہُوا؟" — بریگیڈیئر نے پوچھا۔

میجر نے اس کارروائی کی تفصیلی رپوٹ دی جو اس نے رات ڈاکٹر عبدالرشید کے گھر اور محلے میں کی تھی۔

"مفرور کا کوئی سراغ نہیں ملا" — میجر نے کارروائی کی پوری رپورٹ دے کر کہا — "ڈاکٹر رشید کے گھر کی تلاشی بڑی باریکی سے لی۔ اس گھر کے بوڑھے سے بچے تک کو ڈرا دھمکا کر پوچھا لیکن سب نے یہ ماننے سے انکار کیا کہ اس گھر میں کوئی اجنبی آیا تھا۔ بڑے تیز اور ہوشیار لوگ معلوم ہوتے ہیں.... یہ محلّہ مسلمانوں کا ہے۔ ہم نے ہر گھر کے بڑے مرد کو باہر بلا کر بہت ڈرایا لیکن سب کے سر انکار میں ہی ہلتے رہے"۔

"سر!" — میجر نے کہا — "معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ مفرور اس محلے میں آیا ہی نہیں یا لایا ہی نہیں گیا"۔

"اسے اِسی محلے میں لایا گیا تھا" — بریگیڈیئر نے کہا — "اور اس ڈاکٹر نے اُسے اپنے گھر میں رکھا تھا اور اسے پاکستان کی طرف بھیج دیا"۔

میجر اور کیپٹن حیرت زدگی کے عالم میں بریگیڈیئر کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہ انفارمیشن کہاں سے ملی سر؟" — کیپٹن نے پوچھا۔

"ڈاکٹر رشید نے خود مجھے بتایا ہے" — بریگیڈیئر نے جواب دیا — "اس نے پورا بیان دیا ہے لیکن اس سے آگے وہ نہیں بولتا۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس سارے جرم میں ڈاکٹر رشید کے ساتھ کون کون تھا۔ وہ سفید گاڑی ملنی چاہئے۔ گاڑی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں کوئی روپے پیسے والا آدمی بھی ہے ورنہ مسلمانوں میں گاڑی رکھنے کی ہمت کہاں ہے"۔

"گاڑی کی نمبر پلیٹ نہیں تھی سر!" — میجر نے کہا — اتنا ہی پتہ چلا ہے کہ گاڑی سوزوکی تھی اور اس کا رنگ سفید تھا۔ ہم انفارمر مقرر کر دیں گے جو یہ دیکھیں گے کہ رشید یا اس کے خاندان کے مراسم کسی ایسے آدمی کے ساتھ ہوں گے جس کے پاس سفید سوزوکی ہو گی۔ ہمارے انفارمر اس محلے میں بھی دیکھیں گے کہ سفید سوزوکی کس کے پاس ہے"۔

"ایک اور شخص ذہن میں رکھو" — بریگیڈیئر نے کہا — "شک ہے کہ یہاں پاکستان کی انٹیلی جنس کا کوئی آدمی موجود ہو گا۔ وہ صغیر کو جانتا ہو گا کہ یہ ہماری انٹیلی جنس کا آدمی ہے۔ اُس نے صغیر کو یہاں سے نکلوایا ہو گا۔ مجھے صغیر کے متعلق جو رپورٹ ملی ہے وہ بڑی اچھی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ پاکستان سے صغیر سے بہتر اور قابلِ اعتماد کوئی آدمی نہیں مل سکتا۔ میں نے خود اس شخص کی کارگزاری دیکھی ہے۔ یہ واقعی کارآمد اور قابلِ اعتماد ایجنٹ ہے۔ یہاں مجھے شک ہوتا ہے کہ اُسے اغوا کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرشید کے بیان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس نے پاکستان کی محبت کے جوش میں صغیر کو یہاں سے نکالا ہے' ہو سکتا ہے ورغلا کر نکالا ہو .... میں نے بارڈر سیکورٹی فورس کو الرٹ کر دیا ہے لیکن تم جانتے ہو کہ بارڈر کراس کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ صغیر بارڈر کراس کرنا جانتا ہی ہو گا۔ ہمارے لئے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ صغیر کے ساتھ اور کون کون تھا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے کہ دو تین آدمی سفید سوزوکی میں بیٹھے ہوئے تھے اور وہ صغیر کو گاڑی میں بٹھا کر لے گئے تھے .... میں رشید سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہ نہ بولا تو دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے گا"۔

"دوسرا طریقہ تو اختیار کیا ہی جائے گا سرا!" — میجر نے کہا — "ہم اس ڈاکٹر کے گھر کے تمام افراد کو یہاں بلا لیتے ہیں۔ اس کا باپ شاید کچھ اُگل دے"۔

"ہم یہ بھی سراغ لگالیں گے کہ ڈاکٹر رشید کی دوستی اور اُٹھنا بیٹھنا کس کس کے ساتھ ہے" — کیپٹن نے کہا — "مجھے اُمید ہے ہم ڈاکٹر کے دوستوں کا اتہ پتہ معلوم کرلیں گے"۔

بریگیڈیئر نے ان دونوں کو کچھ ہدایات دیں اور ایک کرنل کا نام لے کر کہا کہ وہ چلے جائیں اور اس کرنل کو اُس کے پاس بھیج دیں۔ دونوں اُٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک ہندو کرنل کمرے میں داخل ہوا اور بریگیڈیئر کے اشارے پر اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ بریگیڈیئر نے اسے صغیر کے فرار کے متعلق بتانا شروع کردیا اور یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر رشید نے کیا بیان دیا ہے۔

"اِسے تم ٹیک اوور کرلو" — بریگیڈیئر نے کرنل سے کہا — "اس سے اس کے ساتھیوں کے نام پتے معلوم کرتے ہیں۔ اس کے گھر کے ہر فرد کو بلانا ہے لیکن یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ ڈاکٹر خود بتادے۔ میں اُسے اپنے پاس بلا رہا ہوں۔ تم ابھی اپنے آفس میں جاؤ۔ میں تمہیں بلالوں گا"۔

○

ڈاکٹر عبدالرشید نے وہ رات اِسی جگہ انویسٹی گیشن سیل میں گذاری تھی۔ یہ تھانوں جیسی حوالات تھی جس میں وہ اکیلا بیٹھا رہا تھا۔ اُس کا بستر فرش پر بچھا ہُوا تھا۔ بستر کیا تھا' دو کمبل فرش پر بچھے تھے اور ایک کمبل اُوپر لینے کے لئے دیا گیا تھا۔ تکیہ ایسا جس کی روئی پتھر ہوگئی تھی اور اس میں سے بدبو آتی تھی۔

ڈاکٹر رشید کا بڑا ہی سخت امتحان شروع ہوچکا تھا۔ خدا کے سوا اُس کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ رات بھر سوچتا رہا تھا کہ اُس کے گھر والوں کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ باہر کی دنیا سے اُس کا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ اُسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اُس کے محلے میں انٹیلی جنس نے کیا تفتیش اور کیا کارروائی کی تھی اور کہیں ایسا تو نہ ہوا ہو کہ کسی نے یہ راز اُگل دیا ہو کہ صغیر کو فلاں گھر میں رکھا گیا تھا۔ سب سے بڑا اور تلخ سوال جو اُسے پریشان کر رہا تھا' وہ یہ تھا — کیا صغیر وہاں سے نکل گیا ہوگا یا انٹیلی جنس اور پولیس نے چھاپہ مار کر اُسے پکڑ لیا ہے!

ڈاکٹر رشید نے رات پریشانی کے عالم میں تڑپتے گذار دی۔ اُس میں اتنا اخلاقی حوصلہ تھا کہ اپنے سامنے آئے ہوئے خطرے کا مقابلہ جوانمردی سے کرسکتا تھا لیکن جن خطرات کو وہ صرف محسوس کرتا تھا اور دیکھ نہیں سکتا تھا اُن کا مقابلہ کرنے کے لئے اُس کے پاس صرف جذبہ تھا' طریقہ اور ذریعہ کوئی نہیں تھا۔

انہی اذیت ناک سوچوں اور وسوسوں میں رات گزر گئی۔ صبح ایک مگ میں اُس کے لئے چائے آئی۔ ایک پلیٹ میں چنے کی دال اور دو پھلکے بھی آئے۔ اُس نے دو تین لقمے کھائے اور دو تین گھونٹ چائے پی کر مگ الگ رکھ دیا۔ کچھ تو چائے پینے کے قابل نہیں تھی اور نہ پینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بہت پریشان تھا۔

اتنے میں کوٹھری کا دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ ایک حوالدار نے اُسے کہا کہ وہ بریگیڈیئر صاحب کی پیشی کے لئے چلے۔

وہ اُٹھا اور حوالدار کے ساتھ چل پڑا۔

"ہیلو ڈاکٹر رشید!" — بریگیڈیئر نے ڈاکٹر رشید کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی پُرتپاک طریقے سے کہا — "رات کیسی گزری؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

ڈاکٹر رشید ہنس پڑا۔ یہ ہنسی پُرمسرت نہیں تھی' اس ہنسی میں طنز تھی اور بریگیڈیئر کے سوال کا بہترین جواب۔ بریگیڈیئر نے بھی اپنے سوال کے جواب کا انتظار نہ کیا یا ضرورت ہی نہ سمجھی۔ رشید کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور رشید اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہارا پروفیشن ایک نوبل پروفیشن ہے" — بریگیڈیئر نے دوستانہ سے لہجے میں کہا — "بائی گاڈ' میں ڈاکٹروں کی بہت عزت کرتا ہوں۔ تمہیں ملزم کی حیثیت سے یہاں دیکھ کر میرے دل کو بہت تکلیف ہو رہی ہے.... بات کچھ بھی نہیں ڈاکٹر رشید! جو بات تھی وہ سامنے آگئی ہے' بلکہ تم نے خود بڑی دیانتداری سے اصل واقعہ مجھے بتا دیا ہے۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں تمہارا کتنا مشکور ہوں۔ یہ ذہن میں رکھو کہ صغیر کوئی مجرم تو نہیں جس نے قتل یا ڈکیتی کی واردات کی ہو اور تم نے اُسے جیل سے یا حوالات سے فرار کردیا ہو۔ یہ سمجھ لو کہ وہ ہمارا مہمان تھا اور تم نے اُسے بھگا دیا"۔

"بریگیڈیئر صاحب!" — ڈاکٹر رشید نے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا — "اگر بات کچھ بھی نہیں تو اِسے یہیں پر ختم کردیں۔ میں نے آپ کے

مہمان کو بھگا کر واقعی بدتمیزی اور بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں اِس کی معافی مانگ لیتا ہوں"۔

"ڈاکٹر رشید!" — بریگیڈیئر نے مشفقانہ سے لہجے میں کہا — "جس طرح میں تمہارے پروفیشن کے متعلق کچھ نہیں جانتا بالکل ایسے ہی تم میرے پروفیشن کی باریکیوں سے واقف نہیں۔ جس طرح آپریشن ٹیبل پر کوئی مریض مرجائے تو ہم کہتے ہیں ڈاکٹر کی کوتاہی سے یہ مریض مرگیا حالانکہ یہ صرف ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے کہ موت کا باعث کیا تھا۔ ایسے ہی میری جس کارروائی کو تم بے مقصد اور فضول سمجھتے ہو' اس کی اہمیت کو صرف میں یا انٹیلی جنس کا کوئی سینئر آفیسر ہی سمجھ سکتا ہے۔ میری ڈیوٹی کا تقاضا یہ ہے کہ تم صرف یہ بتادو کہ وہ سفید گاڑی کس کی تھی اور تمہارے ساتھ کون کون تھا"۔

"میں ان سوالوں کے جواب کل دے چکا ہوں" — ڈاکٹر رشید نے پُرعزم لہجے میں کہا — "آپ نے میرے پروفیشن کو نوبل پروفیشن کہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مَیں بھی ایک نوبل آدمی ہوں۔ مَیں اپنی اس حیثیت کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر میں اپنے دو تین دوستوں کو اس مصیبت میں پھنسا دوں جس میں مَیں پھنسا ہُوا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں نوبل آدمی نہیں ہوں اور میں بڑا ہی گھٹیا اور فریب کار انسان ہوں.... میں حیران ہوں کہ اس سارے معاملے کو آپ ایک معمولی بات کہہ رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی آپ پولیس کی طرح تفتیش کر رہے ہیں"۔

"تم میرے بیٹے ہو رشید!" — بریگیڈیئر نے کہا — "میں تمہیں بہت بڑی تکلیف سے بچانا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں کل بھی کہا تھا اور آج بھی کہتا ہوں کہ ڈاکٹر کی حیثیت سے اور ملٹری ہاسپٹل کے ایک ملازم کی حیثیت سے تم نے اور کسی کو نہیں تو اپنے پروفیشن کو اور اپنے ہاسپٹل کو بہت بڑا دھوکہ دیا ہے۔ ایک ایسے مریض کو تم نے ہسپتال سے نکال دیا ہے جس کا علاج ابھی مکمل نہیں ہوا تھا اور تم نے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ زخمی تھا اور زخم بھی ٹانگ کا تھا جس پر سارے جسم کا بوجھ پڑتا ہے۔ اس کا زخم ابھی خراب تھا کیا تم مجھے یقین دلا سکتے ہو کہ یہ زخمی کسی ایسی جگہ رکھا گیا ہے جہاں تم اس کی باقاعدہ مرہم پٹی کر رہے ہو؟.... یہی جرم ایک بڑا جرم ہے"۔

"بریگیڈیئر صاحب!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "میں نے جو کچھ کیا ہے سوچ سمجھ

کر کیا ہے"۔

"اچھا یہ بتاؤ ڈاکٹر رشید!" — بریگیڈیئر نے پوچھا — "کیا تمہارے والدین اور گھر کے دیگر افراد کو معلوم تھا کہ تم نے صغیر کو اپنے گھر رکھا ہے اور انہیں یہ بتایا ہو گا کہ یہ کون ہے؟"

"نہیں!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے گھر والوں کو میری اس کارروائی کا علم ہی نہیں اور دوسری بات یہ کہ میں صغیر کو اپنے گھر لایا ہی نہیں تھا۔ میں ایسا بے وقوف تو نہیں کہ اپنے بوڑھے اور معزز والدین کو اس مصیبت میں ڈال دیتا۔ میں جانتا تھا کہ میں ایک غلط کارروائی کر رہا ہوں اور اس کی ساری ذمہ داری صرف مجھ پر عائد ہونی چاہئے"۔

"اگر میں تمہارے والدین کو اس مصیبت میں پھنسا لوں تو کیا کہو گے؟" — بریگیڈیئر نے پوچھا۔

"میں کہوں گا کہ یہ بریگیڈیئر ایک اوچھا آدمی ہے" — ڈاکٹر رشید نے بڑی جرأت سے جواب دیا — "اور میں کہوں گا کہ انڈیا میں ہندو مسلمانوں کو پریشان کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر آپ میرے والدین اور میرے گھر کی مستورات اور بچوں کو پریشان کریں گے تو میرے دل میں آپ کی اور اس ملک کی نفرت پیدا ہو جائے گی۔ میں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا بریگیڈیئر صاحب! آپ جو چاہیں کریں اور میں جانتا ہوں کہ آپ میرے گھر کے بچے بچے کو شامل تفتیش کر لیں گے لیکن میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ آپ کو دلی تسکین تو ضرور ہو گی لیکن تفتیش کے معاملے میں آپ کو کچھ حاصل نہیں ہو گا....

"مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے گھر والے میری اس کارروائی سے واقف نہیں۔ اُنہیں پہلے ہی بہت پریشان اور ذلیل کیا جا چکا ہے مجھے ہتھکڑی لگا کر وہاں لے گئے اور میرے گھر کی تلاشی لی گئی۔ سوئے ہوئے بچوں کو جگایا گیا۔ تلاشی لینے والوں سے پوچھیں کہ وہاں سے اُنہیں کیا ملا۔ اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو وہ آپ پوری کر لیں"۔

"مجھے کسی شریف خاندان کو پریشان کرنے کا کوئی شوق تو نہیں" — بریگیڈیئر نے کہا — "تم انہیں خود ان پریشانیوں سے بچا سکتے ہو۔ سیدھی سی بات ہے کہ اپنے ساتھیوں کے نام اور پتے بتادو"۔

اس کے بعد بریگیڈیئر نے پیار اور محبت سے ڈاکٹر رشید سے اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کی پوری کوشش کر ڈالی۔ پھر وہ لالچ دینے پر اُتر آیا۔ اُس نے ڈاکٹر رشید کو یہ بھی کہا کہ وہ اُسے وعدہ معاف گواہ بنالے گا جس سے وہ سزا سے بھی بچ جائے گا اور اُس کی عزت بھی محفوظ رہے گی اور ملٹری ہاسپٹل میں اُس کی ملازمت بھی برقرار رہے گی۔

"بریگیڈیئر صاحب! مَیں نے نتائج کو سامنے رکھ کر صغیر کو یہاں سے نکالا ہے"۔ ڈاکٹر رشید نے کہا — "میں نے آپ کو کل اچھی طرح بتا دیا تھا کہ میں نے اسے یہاں سے کیوں نکالا۔ یہ ایک جذبہ ہے۔ اس میں مجھے کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہُوا۔ مَیں نے اپنے جذبے کی تسکین کی ہے۔ اس جذبے کو آپ جرم کہتے ہیں لیکن میرے مذہب میں یہ میرا فرض تھا۔ مَیں آپ کو صاف الفاظ میں بتا دیتا ہوں کہ غلام اپنی آرزوؤں کے لئے لڑتے ہیں تو اُن کے بادشاہ اُنہیں دہشت گرد کہتے ہیں لیکن غلاموں کے لئے یہ جنگ آزادی ہوتی ہے۔ آپ میرے جذبے کو جرم کہہ کر مجھے سزا دے سکتے ہیں"۔

"لیکن بیٹا!" — بریگیڈیئر نے کہا — "سزا ملنے سے پہلے ایک ایسے مرحلے سے گزرنا پڑے گا جو تمہاری برداشت سے باہر ہو گا۔ اس سے بچنا چاہتے ہو تو میرے سوالوں کا جواب دے دو ورنہ جس مرحلے کی مَیں نے بات کی ہے وہ تمہیں جسمانی طور پر ساری عمر کے لئے معذور کر دے گا"۔

"میں تیار ہوں" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا۔

بریگیڈیئر نے گھنٹی بجائی۔ اردلی اندر آیا۔ بریگیڈیئر نے کسی میجر کا نام لے کر کہا اُسے بلاؤ۔

ڈاکٹر رشید ایک بار پھر سلاخوں کے پیچھے سیل میں بیٹھا ہُوا تھا اور بریگیڈیئر اپنے آفس میں میجر سے کہہ رہا تھا کہ اس سالے مسلمان کی ہڈیاں توڑ دو۔ مرجاتا ہے تو مرنے دو۔ اس کے گھر کے بچے بچے کو بلاؤ اور دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔

○

صغیر اُس گھر سے نکل تو گیا لیکن وہ اس شہر سے اور اس سارے علاقے سے بالکل ہی ناواقف تھا بلکہ وہ اس پورے مُلک میں ایک اجنبی تھا۔ اُس نے کردار کی بلندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس کی شخصیت مکمل طور پر بیدار ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر رشید اور نرس خالدہ نے اس کی روح کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ ڈاکٹر رشید نے اسے ہسپتال سے نکلوا کر کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ یہ تو اسے وہیں ڈاکٹر رشید کے محلے کے ایک گھر میں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے فرار کی تفتیش اس محلے کے مسلمانوں کے لئے کس قدر توہین آمیز ہو رہی ہے۔ انہیں اس ذلت سے بچانے کے لئے وہ یہی کر سکتا تھا کہ یہاں سے نکل جائے اور وہ نکل گیا۔ اس نے اپنا انجام سوچا ہی نہیں۔ اگر اس کی ٹانگ زخمی نہ ہوتی تو وہ ہر مشکل برداشت کر سکتا تھا۔ اب اس کی حالت یہ تھی اس سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔

وہ شہر سے نکلا تھا تو رات کے اُس وقت سڑکیں تقریباً سنسان پڑی تھیں۔ اگر چھاؤنی کے علاقے میں ہوتا تو وہاں ابھی بہت رونق تھی۔ وہ شہر سے ویرانے کی طرف نکل گیا۔ وہ زخم میں دَرد محسوس کرنے لگا تھا اور مسلسل چلتے رہنے سے دَرد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس سے تیز چلا نہیں جا رہا تھا۔ یہ اُس کی قوتِ ارادی کا کمال تھا کہ وہ چل رہا تھا۔

انڈیا سے نکل جانا اُس کے لئے ایک چیلنج بن گیا تھا۔ اس مُلک کو وہ اپنا بدترین دُشمن سمجھنے لگا تھا۔

وہ ایک پگڈنڈی کے کنارے کنارے اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف کھیت تھے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اُس نے پینٹ اُتار کر اپنی زخمی ران ننگی کی۔ اُسے شک ہو رہا تھا جیسے اُس کے زخم سے خون رِس رہا ہو۔ یہ دیکھ کر اُسے اطمینان ہُوا کہ پٹی خشک تھی۔ چونکہ وہ ایک ٹانگ گھسیٹ کر چلتا تھا اس لئے دوسری ٹانگ بہت جلدی تھک گئی۔

رات کے پچھلے پہر کا چاند اُوپر آگیا تھا۔ صغیر نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ مُنہ میں لے کر ماچس جلائی اور اس روشنی میں اُس نے وقت دیکھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہیں کہیں صبح ہو گئی تو وہ کہاں چھپے گا۔ فصل خاصی اُونچی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اس فصل میں ہی چھپ کر دن گزار لے گا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ شہر سے دور نکل جانا بہت ضروری ہے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے زرخیز علاقے میں گاؤں بھی بہت ہوں گے۔

ان سے دُور دُور رہنا ہی بہتر رہے گا۔ یہ سوچ کر وہ اُٹھا اور چل پڑا۔

دُور سے اسے گھوڑے کے ٹاپ سنائی دیئے۔ اُس نے گھوم کے دیکھا۔ دُور ایک تانگہ چلا آ رہا تھا۔ صغیر نے سوچنا شروع کر دیا کہ چھپ جائے یا آہستہ آہستہ چلتا رہے۔ چھپنے میں اُسے یہ خطرہ محسوس ہوا کہ تانگے میں بیٹھی ہوئی سواریاں اسے دیکھ چکی ہوں گی اور اس صورت میں انہیں شک ہو گا۔ اس نے چلتے رہنا ہی بہتر سمجھا۔

تانگہ قریب آ گیا۔ صغیر نے ایک بار پھر مڑ کے دیکھا۔ تانگ کی چھت نہیں تھی اور چاندنی میں صرف تانگہ بان نظر آ رہا تھا۔ تانگے کی رفتار کم ہو گئی۔ صغیر آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ تانگے میں کوئی اور سواری نہیں۔

"کہاں جا رہے ہو بھئی؟" — صغیر کو تانگہ بان کی آواز سنائی دی۔

صغیر رُک گیا اور پھر تانگہ بھی اُس کے پاس آ کر رُک گیا۔

"آؤ بیٹھ جاؤ!" — تانگہ بان نے کہا — "جانا کہاں ہے؟ جو جی چاہے دے دینا۔ مَیں اپنے گاؤں کو واپس جا رہا ہوں"۔

صغیر کے پاس انڈیا کی کرنسی کے ڈیڑھ پونے دو ہزار روپے تھے جو اُسے پاکستان میں ہی دے دیئے گئے تھے۔ چونکہ سرحد پار کرنی تھی اس لئے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا ہو جائے اور ساتھی بچھڑ جائیں۔ صغیر کو بتا دیا گیا تھا کہ اس صورت میں وہ کہاں جائے۔ اس رقم کے علاوہ صغیر کو ایک لمبا چاقو بھی دیا گیا تھا جو اُس نے خطرے کے وقت استعمال کرنا تھا۔ ہسپتال میں اُسے ہسپتال کا پاجامہ اور بش شرٹ پہنا دی گئی تھی۔ اُس نے اپنے کپڑے اور یہ ساری چیزیں اپنے کمرے میں رکھی تھیں جو وہ فرار کے وقت اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

"کیوں بھائی!" — تانگہ بان نے ایک بار پھر اُسے کہا — "چلنا ہے تو آ جاؤ رات آدھی گزر گئی ہے"۔

"نیچے آؤ" — صغیر نے تانگے والے سے کہا — "میری ایک بات سُن لو' پھر چلتے ہیں"۔

تانگہ بان تانگے سے اُترا۔ جب وہ صغیر کے پاس پہنچا تو کھلے ہوئے چاقو کی نوک اُس کی شہ رگ پر ٹک گئی جس کی چبھن کو تانگہ بان محسوس کر رہا تھا۔

"مجھ سے تمہیں کیا ملے گا بھائی!" — تانگہ بان نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا —

"غریب آدمی ہوں پچاس ساٹھ روپے سارے دن میں کمائے ہیں' وہ تم لے لو۔ میرا گھوڑا اور میرے بچے ایک دن بھوکے رہ لیں گے"۔

"میں راہزن نہیں ہوں" — صغیر نے عام سے لہجے میں کہا — "میں تم سے ایک بات پوچھوں گا' وہ صحیح صحیح بتا دو"۔

"فوراً پوچھو بھائی!" — تانگہ بان نے بڑی تیز تیز کہا — "فوراً پوچھو' اپنے اللہ کی قسم' قرآن مجید کی قسم' بالکل سچ بتاؤں گا"۔

"بس اتنا ہی کافی ہے" — صغیر نے ہلکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا — "تم نے میرے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تم مسلمان ہو یا ہندو"۔

"ہاں بھئی!" — تانگہ بان نے کہا — "اللہ اور رسولؐ کے فضل و کرم سے مَیں مسلمان ہوں اِسی لئے تو مَیں نے اللہ اور قرآن کی قسمیں کھائی ہیں .... اب بتاؤ تم نے یہ کیوں پوچھا ہے؟"

صغیر نے چاقو بند کر کے جیب میں ڈال لیا اور تانگہ بان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔

"مجھے اِس وقت ایک مسلمان کی ہی ضرورت ہے" — صغیر نے مطمئن سے لہجے میں کہا — "لیکن ضرورت سچے اور پکے مسلمان کی ہے"۔

"ایک بات سمجھ لو بھائی میرے!" — تانگہ بان نے کہا — "اگر تم سچا اور پکا مسلمان اُسے کہتے ہو جو نمازیں پڑھتا اور روزے رکھتا ہے تو وہ میں نہیں ہوں۔ اگر مسلمانوں کے دوسرے وصف دیکھنا چاہتے ہو مثلاً قول کا پکا' یاروں کے ساتھ یاری نبھانے والا' یاروں پر جان قربان کرنے والا اور دھوکہ نہ دینے والا تو تمہیں مجھ سے زیادہ پکا اور سچا مسلمان کوئی نہیں ملے گا.... کہو کیا بات ہے"۔

"بات بتا دوں گا" — صغیر نے جواب دیا — "کوئی خطرے والی بات نہیں۔ میں ڈاکو یا مفرور ملزم نہیں ہوں نہ کسی کو قتل کر کے بھاگا ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم جا کہاں رہے ہو؟"

"مَیں اپنے گاؤں جا رہا ہوں" — تانگہ بان نے جواب دیا — "صبح سویرے تانگہ شہر لے جاتا ہوں اور رات اس وقت واپس آتا ہوں۔ تمہیں دیکھ کر اس خیال سے تانگہ روک لیا کہ جہاں تمہیں جانا ہے وہاں پہنچا دوں گا اور دو چار روپے کی آمدنی ہو

جائے گی مگر تم نے تو چاقو ہی نکال لیا تھا"۔

صغیر کے لئے یہ سوال بڑا ہی پیچیدہ اور پُرخطر تھا کہ وہ اس شخص پر اعتبار کرے یا نہ کرے۔ یہ شخص اُس سے بھید لے کر اُس کی مخبری بھی کر سکتا تھا لیکن اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ اُس نے بہتر سمجھا کہ اس آدمی کو آزما لیا جائے۔ صغیر کو پناہ اور رہنمائی کی ضرورت تھی۔ صغیر کوئی کم عقل آدمی نہیں تھا۔ اسے انٹیلی جنس کی ٹریننگ ملی تھی اور اسے خاص تجربہ بھی حاصل ہو چکا تھا۔ وہ انسانوں کو پہچان کر اس کے مطابق بات کرنے کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ تانگے والے کو دے کر دوسرا خود سلگایا۔

"میرے پاس پیسے ہیں" — صغیر نے کہا — "تمہیں پوری اُجرت ملے گی اور ہو سکتا ہے کچھ انعام بھی مل جائے"۔

"بھائی میرے!" — تانگہ بان نے جھنجھلا کر کہا — "اب اصل بات پر آجاؤ اور بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟"

تانگہ بان ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سال سے کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے بولنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ یہ گھاگ اور ہوشیار آدمی ہے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" — صغیر نے تانگے والے سے پوچھا۔

"عبدالرحمٰن" — تانگے والے نے جواب دیا — "لیکن اس سارے علاقے میں رحمو تانگے والا کے نام سے مشہور ہوں۔ یہاں کسی گاؤں میں جا کر کسی سے پوچھو کہ رحمو تانگے والا کہاں رہتا ہے تو وہ تمہیں میرے گاؤں اور میرے گھر تک پہنچا دے گا"۔

"تم اتنے مشہور کیوں ہو؟" — صغیر نے پوچھا۔

"معلوم نہیں تم مانو گے یا نہیں" — تانگے والے نے کہا — "اُلٹی کرتوت والا آدمی جلدی مشہور ہوتا ہے اور اُس کی شہرت دُور دُور تک پھیل جاتی ہے۔ شہرت نہیں ملتی تو شریف آدمی کو نہیں ملتی۔ میں شریف آدمی نہیں ہوں"۔

"پھر تو مجھے تم پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے" — صغیر نے کہا۔

"میں تمہیں ایک مشورہ دوں؟" — تانگے والے نے طنزیہ سے لہجے میں کہا — "کسی مُلاّ ملوانے پر اعتبار نہ کر بیٹھنا۔ میری شہرت صرف یہ نہیں کہ میں بدمعاش ہوں

لہ شہرت اس وجہ سے ہے کہ ہر کسی کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھتا ہوں اور ہر کسی کے کام آتا ہوں.... دوسروں کے کام ہمیشہ بدمعاش ہی آیا کرتے ہیں کسی شریف آدمی یا مولوی کی مدد کی ضرورت آپڑے تو مولوی صاحب سوچوں میں ڈوب جاتے ہیں کہ اس شخص کا کام کر دیا تو لوگ کیا کہیں گے اور کبھی یہ سوچتے ہیں کہ یہ کام کیا تو خدا ہی ناراض نہ ہو جائے۔ مجھ جیسے آدمی کسی کی ناراضگی کی پرواہ نہیں کیا کرتے۔ کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہوتا رہے' وہ کام سے کام رکھتے ہیں اور بدمعاشی وہاں کرتے ہیں جہاں بدمعاشی کرنے کی ضرورت ہوتی ہے.... تم جا کہاں رہے ہو؟"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں" — صغیر نے جواب دیا — "اگر تم واقعی قول کے پکے اور دوسروں کے کام آنے والے ہو تو مجھے بتاؤ میں کہاں جاؤں"۔

"یہ تو پتہ چل گیا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ اگر تم ہندو ہوتے تو میں کبھی تمہارے ساتھ اتنی باتیں نہ کرتا لیکن تم مسلمان بھائی ہو' میرا دل کہتا ہے کہ میں تمہیں یہاں اکیلا نہ چھوڑوں"۔

صغیر نے اس آدمی کی فطرت کو سمجھنے کی مزید کوشش اس طرح کی کہ اس کے ساتھ بہت سی باتیں کیں اور اس سے باتیں اُگلوائیں۔

"ایک بات بتاؤ!" — صغیر نے اُس سے پوچھا — "تم نے کہا تھا کہ میں ہندو ہوتا تو تم میرے ساتھ اتنی باتیں نہ کرتے۔ تم نے ایسا کیوں کہا تھا؟"

"یوں کرو" — تانگے والے نے کہا — "تانگے میں بیٹھو۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ میرے بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم جہاں کہو گے وہاں اتار دوں گا۔ تانگے میں باتیں کرتے چلیں گے"۔

"ایک بات سُن لو رحمو!" — صغیر نے کہا — "اگر تم نے مجھے دھوکہ دیا تو تمہارے بچے تمہیں ڈھونڈتے ہی رہیں گے...."

"میرے ساتھ آجا یار!" — تانگہ بان نے اس کا ایک بازو پکڑتے اور تانگے کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

صغیر جب چلنے لگا تو درد کی شدت کی وجہ سے اس کے منہ سے کربناک سی آواز نکل گئی اور اس کے لئے چلنا مشکل ہو گیا۔ تانگے والے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ یہ کیا بات ہے۔ صغیر نے اسے بتایا کہ اس کی ٹانگ زخمی ہے اور وہ

ٹھیک طرح چل نہیں سکتا اور زخم میں درد بھی ہو رہا ہے۔

تانگے والا اسے تانگے تک لے گیا اور پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔

○

تانگے والا اپنی سیٹ پر بیٹھا اور کمزور سا گھوڑا چل پڑا۔

"تم نے مجھ سے ہندوؤں کے بارے میں پوچھا تھا" — تانگے والے نے کہا۔

"مجبوری ہے کہ میں اس ملک میں رہتا ہوں۔ کوئی اور ٹھکانہ نہیں۔ تانگہ بانی ہمارا خاندانی پیشہ نہیں۔ اس انبالہ شہر میں ہم ایک پکے مکان میں رہا کرتے تھے۔ میرے ابا کی منیاری کی دکان تھی۔ دو بڑے بھائی تھے۔ ایک بھائی باپ کے ساتھ دکان پر رہتا اور باپ نے دوسرے بھائی کو الگ دکان کروا دی تھی۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ 1947ء میں ملک کا بٹوارہ ہوا۔ پاکستان الگ اور ہندوستان الگ ہو گیا تو ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ کس طرح انہوں نے مسلمانوں کا خون بہایا، کس طرح اُن کے گھر بار لُوٹے اور کس طرح ان کی عورتوں کو اغوا کیا اور کس طرح مسلمان یہاں سے بھاگے، یہ سب تو تم جانتے ہی ہو.....

"انبالے کے لوگ بھی کٹے اور مرے اور جو بچ گئے وہ قافلے بن کر پاکستان گئے لیکن مجھ پر جو ظلم کا پہاڑ گرا وہ شاید میرے حصے میں آیا تھا۔ اس وقت میری عمر تیرہ سال تھی۔ میرے گھر کا بوڑھا، بچہ، عورتیں سب قتل ہو گئے۔ میں اس طرح زندہ بچا کہ کوٹھے پر بھاگ گیا تھا..... یہ بڑی لمبی باتیں ہیں میرے بھائی ویسے بھی سنانے لگوں تو دل دُکھتا ہے اور ان ہندوؤں پر اتنا غصہ آتا ہے جو میرا ہی خون جلا دیتا ہے"۔

"نہ ہی سناؤ تو اچھا ہے" — صغیر نے اپنی آواز میں افسردگی اور اُداسی پیدا کرتے ہوئے کہا — "مجھ پر بھی یہ گزر چکی ہے میں بھی اپنے خاندان کا ایک ہی فرد رہ گیا ہوں ..... ہاں پھر کیا ہوا! تم اپنی سناؤ"۔

"ہونا کیا تھا یار!" — تانگے والے نے کہا — "یہاں تو قیامت کا منظر تھا۔ کسی کو کسی کی ہوش نہیں تھی۔ ہمیں آزادی بڑی مہنگی پڑی تھی۔ میں صبح کو کوٹھے سے اترا تو گھر کے تمام افراد اور بچے مرے پڑے تھے۔ گھر میں کوئی چیز سلامت نہیں رہی تھی۔ ایک دو سکھوں نے گھر لُوٹ لیا تھا۔ میں باہر نکل گیا۔ دل پر ایسا خوف تھا کہ رونا بھی جیسے بھول ہی گیا تھا۔ باہر بندے بندے سے ڈر لگتا تھا۔ کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ

بازاروں۔ میرے محلے میں کوئی مسلمان نہیں رہا تھا۔ میں دیہاتی علاقے میں نکل گیا۔ یقین کرنا کہ دس بارہ دن ڈرے ہوئے جانوروں کی طرح میں فصلوں اور کھڈ نالوں میں چھپتا پھرتا رہا۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا تھا کہ یہاں کہیں ریفیوجی کیمپ بنا تھا جہاں بچے کھچے مسلمان جا جمع ہوئے تھے اور وہ پاکستان چلے گئے تھے.....

"مجھے یاد نہیں نہ اُس وقت احساس تھا کہ سورج کدھر سے نکلا ہے اور کدھر ڈوب گیا ہے۔ غم اور خوف کا اثر ایسا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے میں ہوا میں اُڑ رہا ہوں اور کبھی یوں جیسے ہر طرف گھپ اندھیرا ہے اور میں ٹھوکریں کھاتا چلا جا رہا ہوں"۔

"مت سناؤ یار!" — صغیر نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا — "یہی کچھ میرے ساتھ بیتی تھی۔ بات ذرا مختصر کرو"۔

"مختصر بات یہ ہے" — تانگے والے نے کہا — "میرے اتنے بڑے مکان پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا۔ ہماری دُکانوں میں ہندو جا بیٹھے۔ مجھے جب ذرا ہوش آیا تو میں اپنے گھر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اندر سے ایک عورت نکلی۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ میرا گھر ہے۔ وہ عورت پہلے تو بڑے زور سے ہنسی پھر اس نے مجھے دھکے دے کر وہاں سے ہٹا دیا، پھر میں اپنی دُکان پر گیا۔ وہاں بھی ہندو بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے رو رو کر کہا کہ یہ دکان ہماری ہے۔ وہاں ایک ہندو نے بازو سے پکڑ کر دکان کے باہر لا کھڑا کیا اور کہنے لگا کہ پھر کبھی یہاں نہ آنا ورنہ جس طرح یہاں کے مسلمان قتل ہوئے ہیں اِسی طرح تمہارا سر بھی اُتار دیں گے۔ میں نے بھیک مانگنی شروع کر دی.....

"بازار میں دیہاتی سے ایک آدمی نے جو امیر معلوم ہوتا تھا مجھ سے اپنا کچھ سامان اٹھوایا اور اڈے تک لے گیا۔ اس نے مجھے پیسے دیئے۔ میں رو پڑا اور اسے اپنا حال سنایا۔ وہ زمیندار تھا۔ مجھے اپنے ساتھ گاؤں میں لے گیا۔ اس گاؤں میں زیادہ تر مسلمان رہتے تھے۔ یہ 1950ء کی بات ہے۔ قتل و غارت بند ہو گئی تھی۔ مسلمان جو پیچھے رہ گئے تھے انہوں نے اپنے کام کاج اور کھیتی باڑی وغیرہ شروع کر دی تھی۔ اس آدمی نے مجھے اپنے گھر رکھ لیا۔ میری عمر اب چودہ پندرہ سال ہو گئی تھی۔ میں تو اس عمر میں جوان ہو گیا تھا۔ تم جانتے ہو بھئی! بھکاری کا اخلاق کیا ہوتا ہے۔ میں نے چھوٹی موٹی چوریاں کیں اور پیٹ بھرنے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلے۔ میں بڑا ہوتا گیا اور گاؤں میں ہی میری زندگی ایک راستے پر چلتی گئی۔ پھر پانچ سات سال اور گزرے تو غریب سی ایک لڑکی

کے ساتھ شادی ہو گئی"۔

"پھر تم بدمعاش کس طرح بن گئے؟"

"کتے جب کھانے والی کسی چیز پر آپس میں لڑتے ہیں تو وہ چیز اُس کتے کے ہاتھ آتی ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے" — تانگے والے نے جواب دیا — "میری حالت یہی تھی۔ میں نے یہی سیکھا کہ سیدھے ہاتھ سے کچھ نہیں ملتا۔ میں نے لڑکپن ہی میں ہاتھ پلہ مارنا شروع کر دیا تھا۔ بڑے پکے بدمعاشوں کی شاگردی میں بڑ اُن کی خدمت کی' پھر چھوٹے موٹے ڈاکوؤں اور پیشہ ور چور اُچکوں کے ساتھ بھی بیٹھنا رہا۔ تانگہ بنایا تو وہ بھی ان لوگوں نے استعمال کیا پھر میری رسائی طوائفوں تک گئی۔ انہیں گاہکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ان کے لئے شہر سے گاہک تا میں بٹھا کر لے جانے شروع کر دیئے۔ جس طوائف کے لئے میں گاہک لے جاتا تھا سے کمیشن لیتا تھا۔ یہ سلسلہ اب بھی چل رہا ہے۔ بس یہ ہے میری زندگی .... اب اپنی کہو"۔

"میری بپتا تو تم نے اپنی زبان سے سنا ڈالی ہے" — صغیر نے جھوٹ بولا اور کہا "فرق یہ ہے کہ تم انبالہ میں تھے اور میں جالندھر میں۔ میں بھی اپنے خاندان میں ا بچا تھا۔ اس وقت میری عمر پانچ چھ سال تھی۔ شاید اِس سے بھی کم ہو۔ میرے والے مجھے پاکستان لے گئے تھے۔ تم تو شاید اپنے گھربار کو بھول چکے ہو گے میں نہ بھولا۔ میں جب بڑا ہوا تو مجھے بتایا گیا کہ میں جالندھر کا رہنے والا تھا اور میرے گھر تمام افراد قتل کر دیئے گئے تھے۔ مجھے وہ وقت خواب کی طرح یاد ہے"۔

"میرا گاؤں تو آ گیا ہے" — تانگے والے نے کہا — "تم بتاؤ کہاں جاؤ گے؟"

"تانگہ روک لو" — صغیر نے کہا — "میں اپنی بات پوری کر لوں پھر آگے چلے گے .... دراصل بھائی میرے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ جُوں جُوں بڑا ہوتا گیا مجھے میرا جالندھر والا گھر اور ماں باپ اور گھر کے دوسرے افراد روز بروز زیادہ ہی یاد آتے رہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ میں سب کو بھول جاتا۔ میں پاکستان میں جس گھر میں پل کر جوان ہوا وہ بڑے ہی خاندانی لوگ ہیں۔ انہوں نے مجھے 'اپنا بیٹا سمجھ کر پالا' پڑھایا بھی اور پڑھا لکھا کر بڑی اچھی نوکری بھی دلا دی۔ وہ تو میری شادی بھی کرا دینا چاہتے تھے لیکن میں نے معلوم نہیں کیا سوچ

کر شادی کی طرف توجہ نہیں دی"۔

"شادی کر لیتے تو اچھا تھا" — تانگہ بان نے کہا — "تم اپنے سارے خاندان کو بھول جاتے اور تمہاری زندگی سکھی ہو جاتی"۔

"اپنے والدین وغیرہ کو یاد کرتے ہوئے مجھے جو بھی دیکھتا اور سنتا تھا وہ یہی مشورہ دیتا تھا کہ میں شادی کر لوں" — صغیر نے کہا — "لیکن اپنے جالندھر والے گھر اور اپنے خاندان کی یاد میرے دماغ میں ایک جنون بلکہ ایک پاگل پن کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ میں نے تہیّہ کر لیا کہ ایک بار جالندھر جاؤں گا۔ میں نے ان لوگوں سے جو مجھے جالندھر سے لائے تھے' اپنے گھر اور محلے کی نشانیاں پوچھنی شروع کر دیں۔ اُنہیں خود بھی وہ محلہ اور چھوڑے ہوئے وہ گھر یاد آتے تھے اس لئے وہ مجھے مزے لے لے کر چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بتاتے رہتے تھے۔ میں نے یہ ساری نشانیاں اپنے ذہن میں محفوظ کر لیں۔ پھر اِدھر اُدھر سے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ مَیں جالندھر کس طرح جا سکتا ہوں۔ اگر یہاں میرا کوئی عزیز رشتہ دار ہوتا تو میں اُس سے ملنے کا جواز پیدا کر کے ویزا لے لیتا لیکن ہندوستان میں آنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا اس لئے مَیں غیر قانونی طور پر ہی اِدھر آ سکتا تھا....

"میں نے انڈین کرنسی اکٹھی کرنی شروع کر دی اور کافی پیسے جمع کر لئے اور ایک روز دماغ ایسا خراب ہوا کہ میں رات کو چل پڑا اور اندھا دھند سرحد پار کر لی۔ اتنا زیادہ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ سرحد پار کرنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن ہوا یہ کہ اچانک ایک طرف سے آواز آئی کہ رُک جاؤ' کون ہو۔ میں رُکنے کی بجائے دوڑ پڑا۔ عقل ایسی پھری کہ پاکستان کی طرف دوڑنے کی بجائے میں اس طرف کو بھاگ اٹھا۔ ایک گولی چلی جو میری ٹانگ سے گزر گئی"۔

"بڑی ہمت والے آدمی ہو یار!" — تانگہ بان نے کہا — "گولی کھا کر تم انبالہ تک پہنچ گئے؟ مرہم پٹی کہاں کراتے رہے؟"

"تم جیسا ایک دردمند مل گیا تھا" — صغیر نے نہایت چابکدستی سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا — "جس طرح تم اتفاق سے مل گئے ہو اور تم ہو بھی مسلمان اور تمہارے دل میں وہی درد ہے جو میرے دل میں ہے' اسی طرح سرحد سے تھوڑی دور ایک گاؤں میں ایک مسلمان مل گیا۔ میں نے اسے بتایا تو اس نے مجھے گھر میں چھپا لیا۔ مرہم پٹی بھی

کی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہڈی نہیں ٹوٹی۔ گولی پٹھے سے گزری تھی....

"وہ ایک غریب آدمی تھا تین چار دن اُس نے اپنے گھر رکھا اور ایک دن پولیس آ گئی۔ میں اٹھتے بیٹھتے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی ذات باری نے ہر مشکل میں میری دستگیری کی۔ پولیس گھوم پھر کر چلی گئی۔ لیکن یہ خطرہ پیچھے رہ گیا کہ میں کسی بھی وقت پکڑا جا سکتا ہوں۔ مجھے جن لوگوں نے پناہ دی تھی وہ دیہاتی اور ان پڑھ قسم کے لوگ تھے۔ وہ مجھے صرف چھپا سکتے تھے' میری رہنمائی کرنے کی عقل نہیں رکھتے تھے۔ میں ایک رات ان کے گھر سے نکل آیا۔ بدقسمتی سے میں غلط بس میں بیٹھ گیا اور اس طرح جنگل خراب ہوتے یہاں تک پہنچ گیا۔ اتنی لمبی بات کیا سنو گے"۔

"تمہاری بات سمجھ لی ہے" — رحمو تانگے والے نے کہا — "تم تو بڑے برے جال میں پھنس گئے ہو۔ اگر تم پکڑے گئے تو کہیں گے کہ تم پاکستان کے جاسوس ہو۔ اگر یہ الزام ثابت نہ ہوا تو تمہیں غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہونے کے جرم میں سزا دے دیں گے۔ تم زخمی بھی ہو۔ تمہیں پناہ چاہئے اور پناہ بھی ایسی ہو جس پر کسی کو شک بھی نہ ہو.... مجھے سوچنے دو کہ میں تمہاری یہ مدد کر سکتا ہوں یا نہیں"۔

"مدد کرو گے تو پوری اُجرت دوں گا" — صغیر نے کہا — "میرے پاس تقریباً پونے دو ہزار ہندوستانی روپے ہیں۔ جتنا مانگو گے اتنا دوں گا"۔

"لعنت ہے رحمو تانگے والے پر کہ وہ ایک پیسہ بھی وصول کرے" — تانگے والے نے کہا — "میں چرسی ہوں' افیمی ہوں' شریف آدمی بالکل نہیں ہوں لیکن یہ میں کبھی نہیں بھولا کہ میں مسلمان ہوں اور ہندو میرے دُشمن ہیں۔ میں اپنے خاندانوں کے خون کے ایک قطرے کا بھی بدلہ نہیں لے سکتا۔ میں کسی ہندو کو قتل نہیں کر سکتا لیکن ہر وہ کام ضرور کرتا ہوں جس سے ہندوؤں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر تم مجھ پر اعتبار کرو تو میں تمہیں کچھ دن چھپا کر رکھوں گا اور ایسی جگہ رکھوں گا کہ یہاں کی پولیس کو تمہاری مشک بھی نہیں ملے گی.... اگر زخم کی مرہم پٹی خود کر سکتے ہو تو سارا سامان لا دوں گا"۔

"مرہم پٹی بعد کی بات ہے" — صغیر نے کہا — "پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ تمہارے گاؤں میں مَیں کتنے دن چھپ کر رہ سکتا ہوں"۔

"میرے گاؤں میں صرف دو گھر ہندوؤں کے ہیں" — تانگے والے نے کہا —

"باقی سب مسلمان ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ سب غریب سے کسان ہیں یا محنت مزدوری کر کے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں"۔

رحمو تانگے والے نے تانگہ چلا دیا اور گاؤں کے باہر ایک گھر کے سامنے رک گیا۔ اُس نے صغیر کو بتایا کہ یہ اس کا گھر ہے۔ وہ اترا اور صغیر کو بھی تانگے سے اتارا۔ دروازہ دستک کے بغیر ہی کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی اس کی بیوی تھی جس نے تانگے کی آواز پر دروازہ کھول دیا تھا۔

○

رحمو تانگے والے کے اس کچے سے مکان کے تین کمرے تھے اور ایک کمرہ گھوڑی کے لئے تھا۔ وہ صغیر کو اندر لے گیا اور ایک کمرے میں جا کر بٹھایا۔ بیوی کھانا گرم کرنے کے لئے رسوئی میں چلی گئی۔ رحمو بھی اُس کے پاس جا بیٹھا۔

"میری ایک بات اچھی طرح سُن لو شادو!" — رحمو نے اپنی بیوی سے کہا — "یہ آدمی جو میرے ساتھ آیا ہے میرا بڑا پُرانا یار ہے۔ جالندھر سے آیا ہے اور وہیں کا رہنے والا ہے"۔

"مسلمان ہے؟" — شادو نے پوچھا۔

"کبھی کسی ہندو یا سکھ کو ساتھ لایا ہوں؟" — رحمو نے رعب دار سی آواز میں کہا — "مسلمان ہے اور بڑا پکا مسلمان ہے"۔

"تم جیسا ہی پکا مسلمان ہو گا" — شادو نے بے تکلفی کے لہجے میں کہا — "مولوی تو ہو نہیں سکتا۔ مجھے یہ بتا دو کہ کوئی مشتبہ تو نہیں؟ کل پولیس پہنچی ہوئی ہو اور مجھے بھی باندھ کے لے جائے"۔

"پوری بات تو سن لے نیک بخت!" — رحمو نے کہا — "مشتبہ تو ہے لیکن چور اُچکا نہیں' نہ شرابی کبابی ہے' ڈکیت اور بدمعاش بھی نہیں' جالندھر میں اس کا کسی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا تو ہندوؤں نے اکٹھے ہو کر اس کے خلاف کوئی پھڈا بنا دیا اور اس کی گرفتاری کا بندوبست کر دیا۔ یہ بیچارہ شریف آدمی وہاں سے بھاگ آیا اور مجھے مل گیا"۔

"تمہارے ساتھ اس کی دوستی کب سے ہے؟" — شادو نے پوچھا۔

"میں تو اِسے جانتا بھی نہیں" — رحمو نے جواب دیا — "مجھے راستے میں مل گیا

اور میں نے اِسے سواری سمجھ کر تانگے میں بٹھا لیا تب اس نے بتایا کہ اس پر واردات گزری ہے۔ ہندوؤں نے وہاں جالندھر میں اسے مارا پیٹا تھا۔ ایک چاقو اس کی ران میں لگا ہے اور یہ زخم خاصا گہرا ہے۔ اگر یہ مسلمان نہ ہوتا تو میں اسے گھر نہ لا لیکن یہ کچھ دن جالندھر سے دور رہنا چاہتا ہے۔ خیال رکھنا کہ اسے یہاں کوئی دیکھ نہ سکے۔ اگر کوئی دیکھے بھی تو اسے یہ پتہ نہ چلے کہ یہ کوئی اجنبی ہے۔ کوئی پوچھے تو بتانا کہ رحمو کا کوئی دوست ہے"۔

رحمو تانگے والے کی بیوی بظاہر غریب اور سیدھی سادی سی تھی لیکن عقل اور ہوش والی تھی اور تیز طرار بھی تھی۔ گاؤں میں لوگ رحمو کی عزت اس لئے کرتے تھے کہ اس کا اٹھنا بیٹھنا بدمعاشوں کے ساتھ تھا اور سب جانتے تھے کہ ڈاکوؤں اور رہزنوں کے ساتھ بھی اس کا دوستانہ ہے اور یہ بھی مشہور تھا کہ وہ پولیس کا مخبر بھی ہے۔ اس کے اس رعب کی وجہ سے اس کی بیوی کی بھی لوگ عزت کرتے تھے اور بیوی سینہ تان کر گاؤں میں گھومتی پھرتی تھی۔ ان کے تین بچے بھی تھے۔ سب سے بڑے بچے کی عمر پندرہ سولہ سال تھی جو لڑکا تھا۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں تھیں۔ رحمو کو اپنی بیوی پر اعتماد تھا۔ وہ دھوکہ دینے والی عورت نہیں تھی۔

رحمو بیوی کو صغیر کے متعلق بتا کر صغیر کے پاس گیا اور اسے بتا دیا کہ اس نے اپنی بیوی کے آگے کیا جھوٹ بولا ہے اور صغیر بھی یہی جھوٹ اپنے ذہن میں رکھے اور شادو کو پتہ نہ چلنے دے کہ وہ پاکستانی ہے۔

شادو دونوں کے لئے کھانا لے آئی اور ان کے آگے رکھا۔ کھانے کے بعد سب سو گئے۔

علی الصبح رحمو حسب معمول تانگہ لے کر نکل گیا۔ صغیر ابھی سویا ہوا تھا۔ وہ رات بھر کا تھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب سورج بہت اوپر آ گیا تھا۔ شادو نے اس کے آگے ناشتہ رکھا۔

"جالندھر سے آئے ہو؟" — شادو نے صغیر سے پوچھا۔

"ہاں!" — صغیر نے جواب دیا اور پوچھا — "کیا رحمو نے تمہیں میرے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے؟"

"ہاں" — شادو نے جواب دیا — "اس نے سب کچھ بتا دیا ہے.... تم بے غم رہو

کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ ہم ان ہندوؤں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن تمہیں کچھ دنوں کے لئے یہاں چھپا کر ان سے بچا سکتے ہیں۔ اب یہ تم سوچ لو کہ تم نے واپس ان ہندوؤں میں ہی جانا ہے وہ پھر تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے"۔

"اللہ مالک ہے بہن!" — صغیر نے کہا — "وہاں کچھ لوگ میرے دشمن کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُمید ہے دو چار دن تک اُن کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا"۔

"ہم بھی ہندوؤں کے ستائے ہوئے ہیں" — شادو نے کہا — "رحمو کا کوئی بھروسہ نہیں لیکن زبان کا بڑا پکا ہے۔ کسی مسلمان کو دھوکا نہیں دیتا"۔

○

صغیر نے سارا دن گھر کے اندر ہی گزارا۔ شادو نے باہر والے دروازے کی اندر سے زنجیر چڑھا دی تھی تاکہ کوئی آئے تو دروازہ کھلنے تک صغیر کمرے میں چلا جائے۔ رحمو کا بڑا بیٹا کچھ دیر صغیر کے پاس بیٹھا رہا۔ یہ لڑکا گاؤں سے تقریباً تین میل دور نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ صغیر نے یہ چیک کیا کہ لڑکا باپ کی طرح پکا ہے یا اس کی ذہانت اور فطرت کچھ مختلف ہے۔ صغیر کو یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ لڑکے کے خیالات باپ جیسے ہی تھے۔ لڑکے نے صغیر کو بتایا کہ رحمو نے اسے یہ سبق دے رکھا ہے کہ ہندو پر کبھی اعتبار نہ کرنا اور ہندو مسلمان کا بدترین دشمن ہے۔

رات کو رحمو معمول سے خاصا پہلے واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں مرہم پٹی کا سامان تھا جو اس نے صغیر کو دیا۔ صغیر نے پٹی کھولی اور اپنا زخم دیکھا۔ زخم خراب تو نہیں ہوا تھا لیکن کچھ بہتر بھی نہیں تھا۔ رحمو جو دوائی لایا تھا وہ ایک ٹیوب میں تھی۔ صغیر نے اس ٹیوب سے دوائی نکال کر زخم پر لگائی اور پٹی باندھ دی اس سے اسے درد میں خاصا افاقہ ہُوا۔

"اب مجھے یہاں سے نکلنے کا کوئی بندوبست کرو رحمو!" — صغیر نے کہا — "کسی طرح مجھے امرتسر تک پہنچا دو آگے میں خود چلا جاؤں گا"۔

"بھیجنے کو تو میں تمہیں کل بھیج سکتا ہوں" — رحمو نے کہا — "میں یہاں سے تمہیں تانگے میں بٹھا کر ریل گاڑی یا بس پر سوار کرا سکتا ہوں لیکن پکڑے جانے کا خطرہ ساتھ ساتھ لگا رہے گا۔ سوچ لو' چیکنگ ایسی بھی تو نہیں ہوتی کہ جگہ جگہ ہر مسافر کو

دیکھتے ہوں"۔

رحمو اس خیال کے پیش نظر ریل یا بس سے سفر کا مشورہ دے رہا تھا کہ صغیر کے متعلق وہ یہی یقین کر چکا تھا کہ یہ پاکستانی ہے اور غیر قانونی طور پر یہاں آیا ہے۔ یہ صرف صغیر جانتا تھا کہ وہ مفرور ہے اور انڈین انٹیلی جنس یقیناً اسے ڈھونڈ رہی ہو گی اور انٹیلی جنس نے سب سے پہلا انتظام یہ کیا ہو گا کہ بارڈر سیکورٹی فورس اور پولیس وغیرہ کو اس کا حلیہ دے کر چوکنا کر دیا ہو گا۔ صغیر انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ انٹیلی جنس کے آدمیوں کی نظریں کتنی تیز ہوتی ہیں۔ وہ اندھا دھند سرحد کی طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی پہچان یہ تھی کہ اس کی ران زخمی تھی اور وہ لنگڑا کر چلتا تھا۔ یہ ایسی نشانی تھی جس سے وہ دور سے پہچانا جا سکتا تھا۔

"مجھے زخم ٹھیک ہونے تک انتظار کرنا چاہئے" — صغیر نے رحمو سے کہا — "ایسا نہ ہو کہ میں کہیں چلنے سے معذور ہو جاؤں اور پکڑا جاؤں"۔

"میں تمہیں گھر سے نکال تو نہیں رہا" — رحمو نے کہا — "تم ٹھیک ہونے تک یہیں رہو' البتہ احتیاط لازمی ہے"۔

○

اصل ضرورت احتیاط کی ہی تھی لیکن احتیاط نہ ہو سکی۔ وجہ یہ ہوئی کہ رحمو کی دو بچیاں بھی تھیں۔ انہوں نے معصومیت میں باہر بچوں کو بتا دیا کہ ان کے گھر ایک مہمان آیا ہوا ہے جو سارا دن گھر میں ہی رہتا ہے۔ صغیر کو اس گھر میں آئے تیسرا دن تھا جب پہلی عورت نے رحمو کی بیوی شادو سے پوچھا کہ اس کے گھر میں کون مہمان آیا ہوا ہے۔ شادو کے لئے جواب دینا مشکل ہو گیا۔ اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ رحمو کا ایک دوست ہے۔

دو دن اور گزرے تو ایک عورت نے جو شادو کی گہری سہیلی تھی شادو سے پوچھا کہ اس کے گھر کون مہمان آیا ہوا ہے جو دن رات اندر بیٹھا رہتا ہے۔

"رحمو کا دوست ہے اور کچھ بیمار ہے" — شادو نے کہا — "ایک دو دن بعد چلا جائے گا"۔

"دیکھ شادو!" — اس عورت نے کہا — "گاؤں کا معاملہ ہے' لوگ بات کا بتنگڑ بنا

لیتے ہیں۔ گاؤں کی عورتوں نے طرح طرح کی باتیں کرنی شروع کر دی ہیں۔ اگر یہ مہمان رحمو کا دوست ہے تو ایک کمرے میں بند نہیں رہنا چاہئے۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ رحمو کی شہرت اچھی نہیں اور اس کا یارانہ اُلٹے سیدھے لوگوں کے ساتھ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رحمو کا یہ دوست کہیں کوئی واردات کر کے آیا ہو اور پولیس اس کے پیچھے ہو۔ تم جانتی ہو مجرم کو پناہ دینا جرم ہے جس کی سزا ملتی ہے"۔

اُسی رات رحمو گھر آیا تو شادو نے اسے بتایا کہ گاؤں کے لوگوں نے ان کے مہمان پر شک کرنا شروع کر دیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن پولیس کا چھاپہ پڑ جائے۔

رحمو کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ گاؤں کے دو آدمیوں نے اس سے بھی پوچھا تھا کہ تمہارا یہ مہمان کون ہے' کہاں سے آیا ہے اور باہر کیوں نہیں نکلتا۔ رحمو ہر کسی کے آگے جھوٹ بولتا رہا لیکن اس نے محسوس کر لیا کہ صغیر کو وہ زیادہ دن اپنے گھر میں نہیں رکھ سکے گا۔

صغیر نے رحمو کو اپنا نام اکبر علی بتایا تھا۔

"اکبر بھائی!" — ایک رات رحمو نے صغیر سے کہا — "گاؤں میں تمہارا رہنا مشکوک سا ہو گیا ہے۔ میری بچیوں نے کہیں باہر بچوں کو بتا دیا ہے کہ ہمارے ہاں ایک مہمان آیا ہے جو ایک کمرے میں بند رہتا ہے۔ گاؤں میں ہندوؤں کے دو ہی گھر ہیں لیکن یوں سمجھو کہ گاؤں میں اُنہی کی بادشاہی ہے۔ وہ تو جیسے یہی دیکھتے رہتے ہیں کہ مسلمان کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کریں تو پولیس کو جھوٹ مُوٹ کی رپورٹ دے کر انہیں پریشان کریں"۔

"تو پھر میں یہاں سے چلا جاؤں؟" — صغیر نے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگا — "میں چلا ہی جاؤں تو اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے یہاں کسی مسلمان کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچے"۔

"میں نے تمہارے چلے جانے کی بات تو نہیں کی" — رحمو نے کہا — "تمہیں پناہ میں رکھنے کے لئے میرے پاس اور جگہ بھی نہیں۔ خدا کی قسم اکبر! میں تمہیں اپنے خدا کی امانت سمجھتا ہوں۔ تم اس پاکستان کے رہنے والے ہو جس پاکستان کے نام پر میرا پورا خاندان قتل کر دیا گیا تھا۔ اگر اس پاکستان کے لئے مجھے اپنی جان دینی پڑے تو میں جان دے دوں گا"۔

رحمو جذباتی سے انداز میں بولتا جا رہا تھا اور صغیر اپنے خیالوں میں کھو گیا تھا۔ اسے اپنے آپ سے شرمساری سی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک یہ چرسی اور افیمی تانگے والا تھا جو اپنی زبان سے کہتا تھا کہ میں شریف آدمی نہیں لیکن پاکستان کے نام پر وہ اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار تھا۔ ایک وہ خود تھا کہ جس پاکستان نے اسے پالا پوسا، تعلیم دی، عزت اور آبرو دی، وہ اس پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لئے دشمن کا جاسوس بن گیا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اس نے محض روپے پیسے کی خاطر پاکستان میں تخریب کاری کی تین چار وارداتیں کی تھیں اور انڈیا کو کچھ راز بھی دیئے تھے۔

صغیر کا دل ایسا بھر آیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اس نے منہ پھیر کر ہاتھ سے پونچھ ڈالے۔ اچانک اسے خیال آ گیا کہ وہ اب صراطِ مستقیم پر آ گیا ہے اور وہ گناہوں کا کفارہ ادا کرے گا۔ اسے ڈاکٹر عبدالرشید یاد آیا جس نے پاکستان کی خاطر اپنے پورے خاندان کی عزت و آبرو کو خطرے میں ڈال کر اسے فرار میں مدد دی تھی۔

"میں گناہوں کا کفّارہ ادا کروں گا" — صغیر کو اپنے ضمیر کی آواز سنائی دی جو رحمو تانگے والے کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی" — "میں پاکستان کے نام پر اپنا آپ قربان کر دوں گا لیکن اس سے پہلے پاکستان کے جتنے بھی دشمنوں کو قتل کر سکا کروں گا اور پاکستان پہنچ کر ان تمام ہندوستانی جاسوسوں کو پکڑواؤں گا جو پاکستان کے اندر بیٹھے پاکستان کی جڑیں کاٹ رہے ہیں"۔

یہ اس کی اپنی روح یا اپنے ضمیر کی آوازیں تھیں جنہوں نے اسے نہ صرف یہ کہ زندہ و بیدار کر دیا بلکہ اسے ایک ایسی روحانی قوت دی جس سے وہ پہلے ناآشنا تھا۔ اس کی مجبوری یا کمزوری یہ تھی کہ وہ اونچے درجے کا یا افسری سطح کا جاسوس نہیں تھا۔ وہ ایک بہت بڑی اور پیچیدہ مشینری کا معمولی سا پُرزہ تھا۔ ایسا کوئی پُرزہ بگڑ جاتا ہے تو اسے مشین سے نکال کر پھینک دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ نیا پُرزہ فٹ کر دیا جاتا ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ انٹیلی جنس کے اندرونی حلقوں میں اور بالائی سطح پر کیا ہوتا ہے پھر بھی جس حد تک اس کی عقل پہنچتی تھی، اس نے تہیّہ کر لیا کہ پوری جوابی کارروائی کرے گا۔

بہت دنوں تک وہ اس ملک سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس کی ایک مجبوری تو اس کی ٹانگ کا زخم تھا۔ زخم بھی ایسا جو ایک طرف سے دوسری طرف تک چلا گیا تھا۔ دوسری

وجہ یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ انڈین انٹیلی جنس نے سرحد پر سب کو چوکنّا کر دیا ہو گا اور بہت دنوں تک وہ سرحد پار نہیں کر سکے گا۔ راستہ صاف ہونے تک اسے انڈیا میں ہی چھپے رہنا تھا۔ اگر اس کی ٹانگ زخمی نہ ہوتی تو وہ آبادیوں سے دور دور جنگلوں بیابانوں میں پیدل ہی چلتا چلا جاتا اور ایک نہ ایک دن سرحد تک پہنچ جاتا۔ بہرحال اس نے قوتِ ارادی کو ایسا بیدار کیا کہ اس کے زخم کا درد کم ہو گیا اور وہ ہر خطرے کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

"رحمو بھائی!" — صغیر نے کہا — "تم میرے بڑے بھائی ہو۔ چھوٹے تمہارے بچے ہیں اور تمہاری آمدنی بھی میں جانتا ہوں کتنی ہو گی۔ مجھ سے کچھ پیسے لے لو" — صغیر نے جیب میں سے بٹوہ نکالا۔

"میزبان مہمانوں کے منہ پر تھوکا تو نہیں کرتے" — رحمو نے اس کے بٹوے والے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا — "تم نے مجھے بڑا بھائی کہا ہے۔ کیا بڑا بھائی چھوٹے بھائی سے پیسے لے گا؟.... میں گناہگار ہوں اکبر بھائی! پاپی ہوں میں۔ مجھے یہ ایک نیکی تو کر لینے دو۔ یہ اللہ کی مرضی ہے مجھے بخشے چاہے نہ بخشے، مجھے اپنی روح کو کچھ تو تسکین لینے دو۔ ان پیسوں کی مجھے نہیں تمہیں ضرورت پڑے گی۔ میں تمہیں ایک جگہ لے جا رہا ہوں۔ وہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا سوائے میرے۔ میں وہاں تمہاری خبر لیتا رہوں گا لیکن یہ سوچ لو کہ تم اس جگہ ٹھہر سکو گے یا نہیں؟"

"کیسی ہے وہ جگہ جہاں میں ٹھہر نہیں سکوں گا؟" — صغیر نے پوچھا — "کیا تم مجھے کوئی شہزادہ یا نواب زادہ سمجھتے ہو؟ مجھے کسی جھگی میں رکھو گے نا؟"

"نہیں اکبر!" — رحمو نے کہا — "میں تمہیں طوائفوں کے ٹھکانے پر رکھوں گا۔ وہ میری اپنی جگہ ہے۔ تم شاید وہاں نہ رہنا چاہو لیکن اس سے بہتر مجھے کوئی اور جگہ نظر نہیں آتی۔ یہ نہ سمجھنا کہ وہ کنجر ہیں اور تمہیں دھوکہ دیں گے۔ ایسا نہیں ہو گا"۔

"کنجروں کے ساتھ تمہارا تعلق ہے؟"

"یہ بھی میری روزی کا ایک ذریعہ ہے" — رحمو نے کہا — "تم سمجھتے ہو گے کہ میری آمدنی تھوڑی ہے۔ تم ٹھیک سمجھتے ہو۔ یہ مریل سی گھوڑی میرے بچوں کو صرف روٹی کھلا سکتی ہے، اس کے بعد میری آمدنی حرام کی ہے جو بہت ہے۔ اس گاؤں میں میرے مقروض ہوں گے، میں نے کسی کا ایک پیسہ نہیں دینا۔ دل کھلا رکھا ہوا ہے۔

کسی حاجت مند مسلمان کو دیکھتا ہوں تو اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق اس کی مالی مدد ضرور کرتا ہوں .... میں جن کنجروں کی بات کر رہا ہوں یہ کوئی عام قسم کے عصمت فروش نہیں۔ ان کے پاس اعلیٰ درجے کی دو لڑکیاں ہیں۔ دونوں بہنیں ہیں۔ ان کے گاہک نواب زادے اور جاگیردار ہیں اور وہ بھی کوئی زیادہ نہیں۔ اگر تم ان لڑکیوں کو باہر کہیں دیکھو تو یقین نہ کرو کہ یہ پیشہ کرتی ہیں۔ اس طرح دو اور آدمی ہیں جن کا پیشہ ہی یہی ہے۔ میں ان کے لئے امیر کبیر گاہک پھانس کر ان کے حوالے کرتا ہوں اور اس کی مجھے کمیشن مل جاتی ہے۔ کبھی کبھار کوئی نامی گرامی ڈاکو آ نکلتا ہے تو اسے رات دو رات اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ وہ بھی جاتے جاتے کچھ دے جاتا ہے۔ دو مرتبہ ایک ڈاکو کے ساتھ ڈکیتی کی وارداتیں بھی کی ہیں .... لیکن اکبر بھائی دل میں کبھی میل نہیں رکھی۔ میں تمہارے دل کی خوشی کے لئے نہیں بلکہ اپنی روح کی خوشی کے لئے کہہ رہا ہوں کہ پاکستان کا نام دل میں آتا ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے خانہ کعبہ یاد آگیا ہو۔ احترام اور پیار کی ایک لہر اٹھتی ہے پھر اپنے ہی دل سے ایک آواز آتی ہے 'رحمو! پاکستان پاک لوگوں کا ملک ہے' تجھ جیسے گناہگاروں کا وہاں کیا کام!"

صغیر رحمو کے مُنہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رحمو نے جب پاکستان کو کعبہ و قبلہ سے وابستہ کر دیا اور جب یہ کہا کہ پاکستان پاک لوگوں کا ملک ہے تو صغیر کے دل سے ہوک سی اٹھی۔ کچھ دیر کے لئے تو اسے ایسے لگا جیسے اسے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہو۔ اسے خیال آیا کہ اس پاک ملک کو اس ملک کے اپنے ہی حکمرانوں نے اور لوگوں نے کس قدر ناپاک کر دیا ہے۔ وہ ملک جسے رحمو پاک لوگوں کا ملک کہہ رہا تھا' مجھ جیسے ناپاک لوگوں کا ملک بنتا جا رہا ہے۔ صغیر نے اپنے آپ کو معاف نہ کیا اس نے سوچا کہ وہ خود بھی کس قدر ناپاک ہے .... اسے رحمو کی سادگی پر دکھ سا ہوا۔ اسے خیال آیا کہ وہ رحمو سے کہے کہ عصمت فروشی' ڈکیتی' راہ زنی اور بدمعاشی ہی کرنی ہے تو میرے ساتھ پاکستان چلے چلو۔ وہاں کی مٹی ان جرائم کے لئے بڑی زرخیز ہے لیکن وہ اپنے دشمن ملک میں بیٹھ کر اپنے ملک کی توہین کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس کے سینے میں وہ ایمان بیدار ہو گیا تھا جسے اس نے بیچ ڈالا تھا۔

انسان بِک جایا کرتے ہیں۔ ایمان نہیں بکا کرتا۔

ایمان میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اُٹھتا ہے اور ایمان فروشوں کے مُنہ نوچ کر اپنی

طاقت منوا لیتا ہے۔

"ہاں رحمو!" — صغیر نے کہا — جہاں لے جاؤ گے وہاں رہوں گا.... لیکن بھروسہ میں صرف تم پر کروں گا"۔

"بھروسہ اللہ کا!" — رحمو نے کہا — "میں تمہارے لئے اللہ کا سبب بنا ہوں اور اپنی ذمہ داری آخر دم تک نبھاؤں گا"۔

○

اگلا سارا دن صغیر اِسی گھر میں رہا۔ سورج غروب ہو گیا پھر اندھیرا گہرا ہو گیا تو رحمو آگیا۔ اُس کے گھوڑے اور تانگے کی آواز نہ آئی۔ رحمو پہلے اپنی بیوی کے پاس گیا اور اپنے بڑے بیٹے کو بھی وہاں بلا لیا۔

"دونوں بڑی غور سے سن لو" — رحمو نے کہا — "میں مہمان کو لے جا رہا ہوں۔ تانگہ گاؤں سے دور کھڑا کر آیا ہوں۔ کبھی کوئی پوچھ بیٹھے کہ یہاں کوئی مہمان آیا تھا تو کہنا کہ رحمو کا ایک دوست تھا جو ایک رات رہ کر چلا گیا ہے۔ کوئی اس کا نام پوچھے تو کہنا کہ نام شاید حمید تھا .... میں اکبر کو لے جا رہا ہوں۔ رات کچھ دیر سے آؤں گا۔ تم ذرا کھانا کھلا دو"۔

رحمو صغیر کے پاس جا بیٹھا اور اُسے بتایا کہ وہ اُسے نئے ٹھکانے پر لے جا رہا ہے اور اسے یہ بھی بتایا کہ وہ جہاں اسے لے جا رہا ہے وہ کیسے لوگ ہیں اور صغیر کو وہاں کس طرح رہنا پڑے گا۔

"ایک بات بتاؤ رحمو!" — صغیر نے پوچھا — "تمہارا تو پاکستان کے ساتھ کچھ تعلق بنتا ہے اس لئے تم میری مدد کر رہے ہو' میں حیران ہوں کہ جن لوگوں کے پاس مجھے لے جا رہے ہو ان کا تو کوئی دین اور مذہب ہوتا ہی نہیں۔ وہ تمہاری طرح مجھے اللہ کی امانت کیوں سمجھیں گے!"

"او اکبر بھائی!" — رحمو نے صغیر کی ران پر ہاتھ مار کر اور مُسکراتے ہوئے کہا — "میرے ساتھ ہیرا پھیری کر کے وہ جائیں گے کہاں۔ خدا کی قسم ان کی لڑکیوں کو نچوا دوں۔ ان کی دُکھتی رگیں میرے ہاتھ میں ہیں .... یہ کوئی اور ہی دنیا ہے جسے میں سمجھتا ہوں تم نہیں سمجھ سکتے۔ تم بے فکر ہو کر چلے چلو"۔

کھانے کے بعد رحمو صغیر کو اپنے ساتھ باہر لے گیا۔ دن بھر کے تھکے ہارے لوگ

گہری نیند سو گئے تھے۔ صرف دو کتے تھے جو بیدار تھے۔ وہ رحمو کو پہچانتے تھے اس لئے بھونکے نہیں۔ رحمو اور صغیر بڑے اطمینان سے اُن کے قریب سے گزر گئے۔ صغیر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ گاؤں سے کچھ دور نکل گئے۔ آگے تانگہ کھڑا تھا۔ وہ تانگے میں بیٹھے اور تانگہ شہر کی جانب چل پڑا۔

○

خوش قسمتی سے موسم سردیوں کا تھا جس سے صغیر نے اپنے اوپر ایک کھیس لے رکھا تھا۔ یہ رحمو کا انتظام تھا۔ گاؤں سے شہر تک تو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ شہر کے اندر تھا جہاں کی سڑکیں اور گلیاں روشن تھیں اور لوگ ابھی گھوم پھر رہے تھے۔

تانگہ شہر میں داخل ہُوا تو صغیر نے کھیس سر پر لے کر بکل ماری اور پھر تانگہ اُس بازار میں داخل ہوا جس کی راتیں دن سے زیادہ روشن ہوتی ہیں۔ رحمو نے اس علاقے کے قریب تانگوں کے اڈے پر تانگہ کھڑا کیا اور صغیر کو ساتھ لے کر پیدل چل پڑا۔ وہ ایک گلی میں داخل ہو گئے جس کے دونوں طرف دروازوں میں اپنے سامنے سو سو اور دو دو سو کے بلب یا ٹیوبیں روشن کئے طوائفیں کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ گلی میں تماش بینوں کا ایک ہجوم رواں دواں تھا۔

اس گلی سے گزر کر آگے ایک کشادہ گلی آ گئی جو کچھ تاریک تھی۔ اس گلی میں اچھی قسم کے مکان تھے جن میں زیادہ تر دو منزلہ تھے۔ رحمو ایک مکان کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس نے صغیر سے کہا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئے۔

کسی مکان سے گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گھنگرو بھی بج رہے تھے۔

مکان کے اندر ایک صحن تھا اور اس کے اردگرد برآمدہ اور کمرے تھے۔ مکان اتنا اچھا اور صاف ستھرا تھا کہ یہ کسی دولت مند کا مکان معلوم ہوتا تھا۔ رحمو نے کسی کو آواز دی۔

ایک کمرے سے ایک ادھیڑ عمر آدمی نکلا۔

"آ بھئی رحمو!" — اس آدمی نے رحمو کی طرف آتے ہوئے اور ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا — "تم آ گئے .... آ جاؤ .... اچھا یہ ہیں وہ صاحب!"

اس آدمی نے رحمو اور صغیر کے ساتھ ہاتھ ملایا اور انہیں ایک کمرے میں لے گیا۔

"تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے" — رحمو نے اس آدمی سے کہا — "یہ بیچارہ ذرا

تھا۔ میں نے اسے تسلّی دے دی"۔

"ڈرنے کی کیا بات ہے یار!" — اس آدمی نے صغیر سے کہا — "جتنا عرصہ چاہو یہاں رہو۔ ہم نے تو رحمو بھائی کا حکم ماننا ہے"۔

"اور سناؤ" — رحمو نے اس آدمی سے پوچھا — "کیسا چل رہا ہے؟"

"تم تو جانتے ہی ہو" — اس آدمی نے جواب دیا — چھوٹی کو چلانا مشکل ہو رہا ہے"۔

"ابھی چھوٹی ہے نا" — رحمو نے کہا — "چل پڑے گی"۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟" — صغیر نے پوچھا۔

"نہ بھائی!" — رحمو نے کہا — "تم اس دُنیا کے معاملے نہیں سمجھ سکتے"۔

"بتاؤ تو سہی" — صغیر نے کہا — "شاید سمجھ لوں"۔

صغیر اس معاملے کو سمجھ چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پاکستان کے معاملے میں بیدار ہو گیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو یہ یقین دلا لیا تھا کہ ہندو پاکستان کا سب سے بڑا دشمن ہے اور اس نے اپنے متعلق تسلیم کر لیا تھا کہ وہ اس دشمن سے منہ مانگے پیسے لے کر مادرِ وطن کی آبرو کو پامال کرتا رہا ہے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ وہ ایمان فروش بن چکا تھا۔ اس اعتراف اور پاکستانی ہونے کے احساس نے اسے سچا پاکستانی بنا دیا تھا اور اس کے اندر یہ احساس بیدار ہو گیا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان کا شیوہ کچھ اور ہوتا ہے، لیکن وہ یک لخت شریف آدمی یا مردِ مومن نہیں بن گیا تھا۔ وہ گناہوں کے راستے پر چلا تھا تو وہ کون سا گناہ تھا جو اس نے نہیں کیا تھا۔ حرام کی کمائی اسے گناہوں کی خوشنما وادی میں بہت دور تک لے گئی تھی۔ حرام کی کمائی سے کوئی مدرسے اور مسجدیں نہیں بنایا کرتا۔

صغیر پکا شرابی بن گیا تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کی طوائفوں کے ہاں جاتا تھا اور بازارِ حُسن کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ عصمت فروشوں کی دنیا کے گوشے گوشے سے واقف تھا اور ان کے کاروباری راز بھی جانتا تھا۔ رحمو اُسے کچھ اور سمجھا تھا لیکن صغیر کچھ اور تھا۔ رحمو نے اسے جن لوگوں میں لا بٹھایا تھا ان لوگوں سے صغیر خوب واقف تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ان عصمت فروشوں کے پاس کوئی ایسی لڑکی ہے جو ان کے رستے پر نہیں آ رہی۔

عصمت فروش دُنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں، اُن کے مسائل، معاملے اور اندر

کے بھید ایک جیسے ہوتے ہیں۔ صغیر انبالہ کے بازارِ حسن میں جا بیٹھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ لاہور کی ہیرا منڈی یا کراچی کی جاپانی روڈ کے علاقے میں بیٹھا ہو۔

"تم یہاں کی بات مت پوچھو اکبر بھائی!" — اس آدمی نے صغیر سے کہا۔ "ہمارے معاملے عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کرتے"۔

"میں کچھ سوچ کر پوچھ رہا ہوں" — صغیر نے کہا — "میں نے کچھ دن یہاں رہنا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ دن زیادہ لمبے ہو جائیں۔ میں سوچتا ہوں کہ تمہیں اور تو کچھ نہ دے سکتا، تمہارے کسی کام آؤں"۔

"تم ضد کرتے ہو تو میں بتا دیتا ہوں" — اس آدمی نے کہا — "لیکن یہ تمہارے بس کی بات نہیں"۔

"سیدھی بات ہے بھائی!" — صغیر نے کہا — "تمہارے پاس کوئی لڑکی ہے جو چل نہیں رہی۔ مجھے بتاؤ۔ اس لڑکی کو میرے پاس بٹھا دو، شاید میں اسے چلا لوں"۔

رحمو اور وہ آدمی ہنس پڑے۔

"میں نے یہاں سے بھاگ تو نہیں جانا" — صغیر نے کہا — "ایسا تو کوئی خطرہ نہیں کہ میں تمہاری لڑکی کو بھگا لے جاؤں گا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں تمہارے کسی کام آؤں۔ میں باتیں کر سکتا ہوں .... کوشش ہے، کر کے دیکھتے ہیں"۔

کچھ دیر تک یہ تینوں اس مسئلے پر باتیں کرتے رہے۔ رحمو اور اس آدمی نے محسوس کیا کہ صغیر کوئی سیدھا سادا آدمی نہیں اور اس کے پاس زبان کا جادو ہے۔ صغیر نے ان دونوں پر اپنا اثر جما لیا اور اچھی خاصی بے تکلفی پیدا کر لی۔

اتنے میں باہر کوئی آدمی آ گیا جو اس جگہ کا مستقل گاہک ہی ہو سکتا تھا۔ رحمو کا دوست اُٹھ کر چلا گیا۔

"اکبر بھائی!" — رحمو نے کہا — "تم نے یہ بڑا اچھا کیا ہے کہ اِن لوگوں کے اِس مسئلے میں دلچسپی ظاہر کی ہے۔ میں جانتا ہوں تم ان کے کام نہیں آ سکتے لیکن یہ آدمی خوش ہو گیا ہے کہ تم کوئی گئے گزرے آدمی نہیں بلکہ تمہارے دل میں دوسروں کا درد بھی ہے"۔

"رحمو یار!" — صغیر نے کہا — "تم مجھے بتا دو کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں کچھ کر سکوں یا نہ کر سکوں، کم از کم ان کے دکھ سکھ میں شریک ہو جاؤں گا اور یہ خوش رہیں

گے"۔

"بات یہ ہے اکبر بھائی!" — رحمو نے کہا — "یہاں دو لڑکیاں ہیں۔ یہ دونوں بہنیں ہیں اور دونوں مسلمان ہیں اور دونوں پاکستان کے پنجاب کی ہیں"۔

"پاکستان کے پنجاب کی؟" — صغیر نے چونک کر پوچھا — "کیا اِنہیں اُدھر سے اغوا کر کے لائے تھے؟"

"اُدھر سے نہیں" — رحمو نے جواب دیا — "ان دونوں کو 1971ء میں بنگالی بدمعاشوں نے ڈھاکہ سے اغوا کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ 71ء میں بنگالیوں کا جو خون مشرقی پاکستان میں بہایا گیا تھا وہ تو تم کبھی نہیں بھولو گے۔ تمہارا پاکستان آدھا رہ گیا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ قتل و غارت اور اغوا اور ساری تباہی بنگال کے ہندوؤں نے مچائی تھی اور یہ ہندو اِدھر سے گئے تھے۔ وہاں سے زیادہ تر بہاریوں کی لڑکیاں اغوا ہوئی تھیں اور انہیں کلکتہ میں لایا گیا تھا۔ ان میں کچھ تعداد پاکستان کے دوسرے صوبوں کی لڑکیوں کی بھی تھی۔ تم نے اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ مشرقی بنگال سے اغوا کی ہوئی لڑکیوں کو کلکتہ لا کر بیچا گیا تھا۔ انڈیا کے بڑے بڑے بردہ فروش اور عصمت فروش کلکتہ پہنچ گئے تھے۔ اس جگہ جہاں ہم دونوں بیٹھے ہوئے ہیں پہلے چار اور عورتیں ہوتی تھیں جو بہت خوبصورت اور جوان تھیں پھر یہ دونوں بہنیں کلکتہ سے خرید کر یہاں لائی گئیں....

"بڑی بہن جس کی اب عمر ستائیس اٹھائیس سال ہے، یہاں آتے ہی چل پڑی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پہلے ہی اس لائن پر چلی ہوئی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ بڑے امیر گھر کی بیٹیاں ہیں اور یہ دونوں بہنیں بڑی آزاد خیال تھیں۔ چھوٹی بہن کی عمر اس وقت پندرہ سولہ سال تھی۔ اس نے اس جگہ کو قبول نہیں کیا اور نہ ہی اس عمر میں اسے اس لائن پر چلایا گیا۔ یہ اعلیٰ درجے کی عصمت فروش ہیں اور ان کے گاہک بڑے مالدار ہوتے ہیں۔ اب یہ چھوٹی لڑکی اٹھارہ اُنیس سال کی ہو گئی ہے۔ اس کے لئے پہلا گاہک تیار ہے لیکن یہ لڑکی نہیں مانتی۔ کہتی ہے خودکشی کر لوں گی یہ کام نہیں کروں گی۔ بڑی بہن نے بھی اسے بہت سمجھایا بجھایا ہے لیکن یہ نہیں مانتی....

"بڑی بہن کہتی ہے کہ اِسے کچھ عرصہ اور اِس ماحول میں رہنے دو خود ہی مان جائے گی۔ آج کل یہ لوگ اِسی چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ ویسے یہ لڑکی یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کرتی اور ٹھیک ٹھاک رہتی ہے۔ ایک مسلمان جاگیردار اس کی

بہت خواہش کرتا ہے۔ وہ اس جگہ کا مستقل گاہک ہے وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے' قیمت بتاؤ' وہ تو اس کے لئے اپنی آدھی جائیداد بیچنے کو بھی تیار ہے"۔

رحمو ان دونوں بہنوں کے متعلق صغیر کو تفصیلات بتا رہا تھا لیکن صغیر اپنے خیالوں میں نہ جانے کہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ بالکل ہی گم صم ہو گیا تھا۔ شاید اُسے 1971ء کا المیہ یا آ گیا تھا۔ کمرے میں کوئی داخل ہوا تو صغیر اپنے خیالوں سے یک لخت بیدار ہو گیا۔ اُس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دو بڑی خوبصورت لڑکیاں کمرے میں آ گئی تھیں۔

"یہ ہیں دونوں بہنیں" — رحمو نے صغیر سے کہا — بڑی شمیم ہے اور چھو نائلہ"۔

"ان صاحب کی تعریف؟" — شمیم نے رحمو سے پوچھا۔

"اپنے دوست ہیں" — رحمو نے اسے بتایا — "کچھ دن تمہارے پاس رہی گے"۔

صغیر کی نظریں نائلہ پر جم کے رہ گئی تھیں۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور دلکش لڑ تھی۔ صغیر نے دونوں بہنوں کے چہروں کو اچھی طرح دیکھا۔ یوں تو شمیم بھی خوبصور تھی لیکن اس کے اور نائلہ کے چہرے میں جو فرق تھا وہ ایسے ہی تھا جیسے ایک ستار اور مصنوعی سیارے میں ہوتا ہے۔ نائلہ کے چہرے پر معصومیت تھی اور شاید اسی لئے وہ زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔ شمیم نے ہلکا سا میک اَپ کر رکھا تھا اُس کی آنکھیں خاص طور پر دلکش اور دلوں کو موہ لینے والی تھیں لیکن ان آنکھوں میں یہ تاثر بڑا نمایاں جیسے شیرنی اپنے شکار کو بھانپ رہی ہو۔

صغیر بھی شکل و صورت کے لحاظ سے خوبرو کہا جا سکتا تھا۔ وہ جواں سال آدمی تھا وہ بھی اپنی آنکھوں سے شکار کو بھانپ لیتا تھا۔ اس کے سراپا میں ایک خاص قسم دلکشی تھی۔ اُس نے نائلہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ نائلہ نے نظریں جھکا دیں اور ایک بار پھر نظریں اُوپر کر کے صغیر کو دیکھا۔

"بیٹھ جاؤ" — صغیر نے آہستہ سے کہا۔

نائلہ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم لئے صغیر کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی اور اُس کی بہن شمیم دوسرے صوفے پر بیٹھی۔

صغیر نائلہ کے چہرے سے کوشش کے باوجود نظریں نہ ہٹا سکا۔

ایک دو دنوں کے لئے اپنے والدین کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ اُس نے عثمان ڈینا میں یہ تبدیلی دیکھی تھی کہ پہلے وہ عثمان سے کہتی تھی کہ امّی کے پاس جانا چاہتی ہوں تو عثمان اُسے حیلے بہانے سے روکنے کی کوشش کرتا تھا مگر اب کراچی سے آ کر عثمان کبھی کبھی اُسے کہہ دیتا تھا کہ جاؤ امّی سے مل آؤ۔ عثمان کو یہ نیا نکتہ سمجھا دیا گیا تھا کہ ڈینا کو اپنے ہاتھ میں رکھنا ہے اور کوئی ایسی حرکت نہ ہو جس سے ڈینا کو ذرا سا بھی شبہ ہو۔ عثمان کا ڈینا سے یہ کہنا کہ جاؤ امّی سے مل آؤ ڈینا کو اچھا لگتا تھا۔ کراچی سے آ کر پہلی بار وہ اپنے والدین کے ہاں گئی تھی۔

شام کے بعد اُس کے دونوں بھائی اختر اور امجد ڈینا کے پاس بیٹھے تھے کہ گیٹ کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے بتایا کہ میجر سمیع اور کیپٹن آصف آئے ہیں۔ اختر اور امجد نوکر سے یہ کہہ کر کہ انہیں ڈرائنگ روم میں بھیج دو' ڈینا کو ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ سمیع اور آصف نے سب سے پہلے ڈینا سے میجر عثمان کے متعلق پوچھا تو ڈینا نے بڑے خوشگوار لہجے میں جواب دیا کہ وہ کسی کام سے چلے گئے ہیں۔

جب سے میجر عثمان اور ڈینا کراچی سے آئے تھے' میجر سمیع اور کیپٹن آصف ڈینا سے پہلی دفعہ مل رہے تھے۔

"آپ اتنے دن کہاں رہے سمیع بھائی!" — ڈینا نے میجر سمیع سے پوچھا — "آپ کو تو معلوم تھا کہ عثمان کی چھٹی کب ختم ہو رہی ہے"۔

"ہمارا بریگیڈ ایکسرسائز پر چلا گیا تھا" — میجر سمیع نے کہا — "آج دوپہر واپس آئے ہیں اور سب سے پہلے اختر صاحب اور امجد صاحب سے ملنے آ گئے۔ معلوم نہیں تھا کہ آپ بھی یہیں ہوں گی۔ یہاں سے اُٹھ کر آپ کے ہاں آنے کا ارادہ تھا.... کہئے

سیر کیسی رہی؟"

"یہ تو پوری فیملی سندھ میں اغوا ہو گئی تھی" — اختر نے کہا — "اللہ نے معجزہ کیا اور یہ بچ کے نکل آئے"۔

"وہ کیسے؟" — میجر سمیع نے صوفے سے اُچھلتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ!" — کیپٹن آصف نے حیرت زدگی کے عالم میں پوچھا۔
ڈِینا نے اپنے اغوا کی پوری تفصیل سنائی۔

"اور بتاؤں کہ ہمیں رہائی کِس نے دلائی؟" — ڈِینا نے کہا — "لُوسی نے!"
میجر سمیع اور کیپٹن آصف کا ردِ عمل یہ تھا جیسے اُن کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر آ جائیں گے۔ اُن کے مُنہ کُھل گئے تھے۔

"وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟" — میجر سمیع نے پوچھا۔

"عثمان نے مجھے بتایا تھا کہ لُوسی اندرون سندھ کی سیر کے لئے آئی تھی" — ڈِینا نے کہا — "میں نے دیکھا بھائی! وہاں لُوسی کا حکم چلتا تھا۔ اُس کے ایک اشارے پر ہمیں رہا کر دیا گیا اور لُوسی ہمیں کراچی لے گئی۔ ہم ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ لُوسی وہاں آتی رہی"۔

"کیا عثمان لُوسی کے ہاں جاتا رہا ہے؟" — کیپٹن آصف نے پوچھا۔

"ہاں!" — ڈِینا نے جواب دیا — "عثمان وہاں جاتا رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ خداوند تعالیٰ نے عثمان کو جھٹکا دینے کے لئے ہمیں اغوا کرایا تھا اور ہمیں لوسی کی اصلیت دکھا دی۔ اندرون سندھ میں ان لوگوں میں لوسی کو دیکھ کر جو اغوا اور ڈکیتی کی وارداتیں کرتے ہیں، عثمان کیسے کہہ سکتا تھا کہ لوسی ایک شریف عورت ہے۔ خود لوسی اپنے متعلق کوئی جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ اس کا اثر عثمان پر یہ ہُوا کہ اُس نے کہا کہ وہ لوسی کے ساتھ دوستی لگائے رکھے گا اور اُس کے پورے گروپ کو پکڑوائے گا۔ میں نے خود لوسی کے ساتھ باہر دوستانہ تعلق پیدا کر لیا تھا اور مَیں نے اُس پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مَیں اُسے اپنا اور اپنے مُلک کا دشمن سمجھتی ہوں۔ یُوں سمجھیں کہ مَیں اُس کے سامنے بیوقوف بنی رہی۔ خود عثمان نے ایسا روّیہ اختیار کئے رکھا جیسے اُسے لوسی پر کسی قسم کا شک نہیں۔ مَیں تو بھائی جان! اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس کی ذاتِ باری نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ عثمان مجھے واپس مل گیا ہے۔ اب پتہ چلتا ہے کہ وہ میرا

خاوند اور میرے بچوں کا باپ ہے"۔

"مَیں آپ کو ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں سمیع صاحب!" — اختر نے کہا — "اس واقعہ کی تفصیل ڈِینا نے سنائی ہے۔ عثمان اس کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے یہ واقعہ نہیں سنایا اور نہ کسی ردِ عمل کا اظہار کیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے عثمان کو اس واقعہ کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمارے لئے تو یہ بہت بڑا اور بے حد خطرناک واقعہ ہے۔ میں نے میجر عثمان سے پوچھا کہ اُس نے اس کی رپورٹ اپنے کمانڈنگ آفیسر کو دی ہے یا نہیں۔ عثمان نے بالکل عام سے لہجے میں کہا کہ وہ یہ واقعہ کسی کو سنانا ہی نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ لوسی کے رِنگ کو کہیں اکٹھا کر کے پکڑوانے کا پلان بنا رہا تھا۔ عثمان کا انداز ایسا تھا جیسے اُسے اچھا نہ لگا ہو کہ ڈِینا نے یہ واقعہ سب کو سنا دیا ہے"۔

"عثمان ملے تو اس سے بات ہو گی" — میجر سمیع نے کہا — "یہ رپورٹ تو فوراً انٹیلی جنس کے پاس جانی چاہیئے"۔

"ڈِینا بھابی!" — کیپٹن آصف نے پوچھا — "کیا اس وقت میجر عثمان گھر ہوں گے؟ اگر ہیں تو ہم ابھی اُن کے پاس جائیں گے"۔

"فون کر کے پوچھ لیتے ہیں" — ڈینا نے کہا۔

"کیا فون یہاں آ سکتا ہے؟" — میجر سمیع نے پوچھا — "مَیں خود عثمان سے بات کرنا چاہتا ہوں"۔

ٹیلی فون ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ میجر سمیع نے عثمان کے گھر کا نمبر ملایا۔ رِنگ جاتی رہی اور کسی نے فون نہ اُٹھایا۔

"کہیں نکل گیا ہو گا" — ڈینا نے کہا۔

"عثمان سے جلدی ملنا ضروری ہو گیا ہے" — کیپٹن آصف نے کہا۔

"بہت ضروری ہو گیا ہے" — میجر سمیع نے کہا — "میں حیران ہوں کہ عثمان کراچی کے رِنگ کو کِس طرح گرفتار کروائے گا!"

"مَیں ایک بات بتا دیتی ہوں" — ڈینا نے کہا — "عثمان مجھے کئی بار کہہ چکا ہے کہ اغوا کا واقعہ کسی کو نہ سنانا"۔

"بیوقوف آدمی ہے" — میجر سمیع نے کہا — "معلوم نہیں وہ کِس طرح اس رِنگ کو پکڑوا سکے گا"۔



اگلی شام میجر سمیع، کیپٹن آصف اور انٹیلی جنس کا میجر امتیاز عثمان کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ وِینا وہاں نہ تھی۔ وہ اپنے والدین کے ہاں تھی۔ میجر سمیع کے کہنے پر عثمان اُنہیں اپنے اغوا کا اور لُوسی سے ملاقاتوں کا تمام تر واقعہ سنا چکا تھا۔

"میجر عثمان!" — امتیاز نے پوچھا — "آپ یہ بتائیں کہ اس رِنگ کو آپ کس طرح پکڑوانا چاہتے ہیں؟"

"میں تو یہ بھی پوچھنا چاہوں گا" — میجر سمیع نے کہا — "کہ تم خود ہی اس رِنگ کو کیوں پکڑوانا چاہتے ہو۔ یہ کام انٹیلی جنس کا ہے اور انٹیلی جنس والے ہی بہتر سمجھتے ہیں کہ کسی بھی رِنگ کو کس طرح توڑا جاتا ہے"۔

"اور دیکھئے میجر عثمان!" — میجر امتیاز نے کہا — "یہ آپ کا ذاتی کیس نہیں۔ یہ تو انٹیلی جنس کا کیس ہے۔ یہ ایسی بات تو نہیں کہ آپ کا کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہو گیا ہو تو آپ نے یہ ارادہ کر لیا کہ تھانے میں رپورٹ نہیں دوں گا اور خود انتقام لوں گا۔ کل آپ دس بجے ہمارے آفس میں آجائیں اور ہمارے چیف کو یہ سارا واقعہ سنائیں۔ یہ کوئی معمولی رِنگ نہیں۔ ذرا غور کریں۔ اس رِنگ کا رابطہ اور گہرا تعلق سندھ کے ڈاکوؤں اور رہزنوں کے ساتھ بھی ہے۔ ہم تو انہیں بھی پکڑنا چاہیں گے۔ ان کا تعلق انڈیا کے ساتھ ہے"۔

میجر عثمان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ تو خود اس رِنگ کا ایک اہم ممبر تھا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں میجر امتیاز!" — میجر عثمان نے کہا — "اسے میری حماقت کہہ لیں، میں اسے اپنا ذاتی کیس سمجھ رہا ہوں اور میں خود انتقام لینا چاہتا ہوں"۔

"لیکن کیسے؟" — میجر سمیع نے پوچھا۔

عثمان کے سامنے کوئی پلان ہوتا تو وہ بتاتا۔ اسے خاموش دیکھ کر میجر امتیاز نے ایک بار پھر کہا کہ اگلے روز دس بجے عثمان انٹیلی جنس آفس میں پہنچ جائے۔



اگلے روز دس بجے عثمان انٹیلی جنس کے کرنل کے آفس میں بیٹھا ہُوا تھا۔ میجر امتیاز ساتھ تھا۔ کرنل کے کہنے پر میجر عثمان نے اپنے اور اپنی فیملی کے اغوا کا واقعہ سنایا۔ کرنل نے لُوسی کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا۔

"سر!" — میجر عثمان نے کہا — "اس لڑکی کے ساتھ میری فرینڈشپ تھی۔ ذرا سا بھی شک نہیں ہوتا تھا کہ یہ جاسوس ہے"۔

"کیا تم اس کے گھر بھی جاتے رہے ہو؟"

"یس سَر!" — عثمان نے جواب دیا — "مَیں اس کے والدین سے بھی ملتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ اس کے والدین نہیں بلکہ اس رِنگ کے ممبر ہیں"۔

کرنل کے پوچھنے پر عثمان نے لُوسی کے متعلق وہ ساری باتیں بتائیں جو کراچی میں ہوئی تھیں۔

"کیا لُوسی نے یا اس رِنگ کے کسی ممبر نے تم سے کوئی ملٹری سیکرٹ معلوم کرنے کی کبھی کوشش کی تھی؟" — کرنل نے پوچھا۔

"یس سر!" — عثمان نے جواب دیا — "انہوں نے ایک دو باتیں پوچھی تھیں اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے کہا تھا کہ ہم تمہیں پاکستان کا شہزادہ بنا دیں گے"۔

کرنل اور میجر امتیاز نے میجر عثمان سے اور بھی بہت کچھ پوچھا جس میں لاہور کی کوٹھی اور کراچی کی کوٹھی کے ایڈریس بھی شامل تھے۔

"میجر عثمان!" — کرنل نے کہا — "مَیں تمہیں سختی سے کہتا ہوں کہ یہ بڑا سنگین کیس ہے اور اسے اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کرنا۔ تم ہمارے گائیڈ ہو گے۔ ہم ب چھاپہ ماریں گے تو تم ہمارے ساتھ ہو گے۔ سب سے پہلے تو ہم اُس جگہ کو دیکھیں گے جہاں سے تم اپنی فیملی کے ساتھ اغوا ہوئے تھے۔ تم نے اب یہ کام کرنا ہے کہ لاہور ں ان میں سے جس جس کے ساتھ 'تمہارا تعلق تھا' اُسے ملتے ملاتے رہنا تاکہ اُنہیں ی قسم کا شک نہ ہو.... اب تم جا سکتے ہو۔ ہمیں جس وقت تمہاری ضرورت پڑی، ہم ہیں بُلا لیں گے۔ تمہیں ہر وقت لاہور میں موجود رہنا پڑے گا"۔

وہاں سے اُٹھ کر میجر عثمان بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں چلا گیا۔

اُسی دن ڈھائی تین بجے میجر عثمان آفس سے اُٹھ کر اپنے سسرال چلا گیا۔ وِینا وہیں ا۔ جب سے وِینا اپنے والدین کے ہاں گئی تھی میجر عثمان کا یہی معمول تھا کہ آفس ے اُٹھ کر سسرال چلا جاتا اور کھانا کھا کر اپنے گھر آجاتا تھا۔ اُس روز بھی وہ اپنے ِرال گیا۔ اس نے وِینا سے بالکل نہ کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ وِینا تو اب اُسے ، مخلص خاوند سمجھتی تھی اور وہ خوش تھی کہ عثمان راہِ راست پر آگیا ہے۔ وِینا بھی

ایک دو دن اور اپنے والدین کے ہاں رُکنا چاہتی تھی۔ عثمان اپنے گھر چلا گیا۔

اپنے گھر جا کر عثمان نے پہلا کام یہ کیا کہ ٹیلی فون کے پاس جا بیٹھا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو' کون؟" — عثمان نے کہا — "اچھا اچھا .... فون اُنہیں دو .... ہیلو چیف! کوٹھی خالی کر دیں .... نہیں مہندر صاحب! خطرہ سر پر آ گیا ہے۔ کوٹھی خالی کر دیں اور لاہور سے نکل جائیں۔ کوٹھی میں کوئی ایسی چیز نہ رہ جائے جس سے انٹیلی جنس کو شک ہو۔ فوزیہ کو لے کر فوراً غائب ہو جائیں اور جب تک مَیں نہ کہوں واپس نہ آئیں۔ کوٹھی کے باہر تالا لگا دینا.... اور ہاں' نوکروں کو بھی وہاں سے بھیج دیں اور اُنہیں بتائیں کہ آپ کچھ دنوں کے لئے کراچی جا رہے ہیں۔ مَیں اب آپ سے ملوں گا نہیں' آپ سب سمجھتے ہیں" — عثمان نے ریسیور رکھ دیا۔

اُس نے ایک اور نمبر ڈائل کیا جو کراچی کا تھا۔

"ہیلو لُوسی!" — عثمان نے پُرجوش انداز میں کہا — "میری خوش قسمتی ہے کہ تم مل گئی ہو .... ہاں ہاں مَیں ٹھیک ہوں لیکن حالات ٹھیک نہیں رہے .... زیادہ مت پوچھو اور وہاں سے سب کو ساتھ لے کر لاپتہ ہو جاؤ .... وِینا نے یہاں سب کو اغوا کا واقعہ سنا دیا ہے اور تمہاری ملاقاتوں کا سلسلہ بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ بات اُوپر تک پہنچ گئی ہے .... ہاں ہاں مَیں نے لاہور والوں کو بھی خبردار کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے پاس ہی آ جائیں۔ بس اب تم کوٹھی خالی کرنے کا کام کرو۔ میرے ساتھ رابطہ رکھنا .... فوزی کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔ اب کچھ عرصہ جدائی برداشت کرنی پڑے گی .... او کے .... بائی بائی"۔



انبالہ کے انٹیلی جنس سنٹر کے انویسٹی گیشن سَیل میں فرش پر بچھے ہوئے کھردرے فوجی کمبل پر ایک جوان آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اُس کے اوپر میلی کچیلی سی ایک چادر ڈال دی گئی تھی۔ کمرے کی بند فضا بدبُو سے بوجھل تھی۔

کمرے کا دروازہ سلاخوں والا تھا۔ یہ دروازہ کھلا۔ دو میجر کمرے میں داخل ہوئے اور سیدھے اس لاش تک پہنچے۔ چادر ہٹائی' ایک میجر ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف فرش پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ ایک نے لاش کی نبض پر اُنگلیاں رکھیں اور دوسرے

نے اپنی ایک اُنگلی لاش کی ناک کے آگے رکھی۔

"باسٹرڈ زندہ ہے" — ایک میجر نے کہا۔

"تو کیا تمہیں یہ شک تھا کہ مر گیا ہو گا؟" — دوسرے میجر نے پوچھا۔

"حیران ہوں یہ مسلمان کِس میٹریل کے بنے ہوئے ہیں"۔

"اتنا ٹارچر گھوڑا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

دونوں میجر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"اسے ہوش میں لایا جائے؟" — ایک میجر نے پوچھا — "یا خود ہی ہوش میں آ جائے گا"۔

"ہوش میں لانا پڑے گا" — دوسرے میجر نے کہا — "کل دوپہر کو اِسے تھوڑا سا کھانا دیا گیا تھا اور اب پورے چوبیس گھنٹے گزر گئے ہیں۔ اب اسے کچھ کھلائیں پلائیں گے"۔

دونوں میجر سَیل سے نکلے اور سنتری سے کہا کہ وہ دروازہ بند کر لے۔

"کیا رات کو بھی تمہاری ڈیوٹی تھی؟" — ایک میجر نے سنتری سے پوچھا۔

"ہاں سر!" — سنتری نے جواب دیا — "رات بارہ سے دو بجے تک میری ڈیوٹی ی"۔

"کیا یہ ساری رات اِسی طرح پڑا رہا ہے؟"

"نہیں سر!" — سنتری نے جواب دیا — "پہلے تو یہ اِسی طرح پڑا رہا۔ بارہ بجے ، کچھ بعد یہ بیٹھ گیا اور چادر اُوپر کر کے مُنہ مغرب کی طرف کر لیا اور کچھ مُنہ ہی مُنہ ا پڑھتا رہا پھر اس نے ہاتھ پھیلا دیئے جس طرح مسلمان دُعا مانگا کرتے ہیں۔ پھر اس بلند آواز سے کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ میرا خیال ہے یہ اپنے قرآن کی کوئی آیتیں رہا تھا۔ مَیں نے مسلمانوں کو اونچی آواز میں قرآن پڑھتے دیکھا ہے۔ پھر یہ نماز کی ح سجدے میں چلا گیا اور بہت دیر سجدے میں پڑا رہا۔ میرا خیال تھا کہ یہ سجدے میں و گیا ہے لیکن یہ سجدے سے اُٹھا اور اس نے بلند آواز سے کہا — "یا اللہ میری ا قبول کر لے اور مجھے اتنی ہمت دے کہ میں تیری خوشی کے لئے یہ تکلیفیں ت کر لوں' — پھر اس نے زور سے اللہ اکبر تین بار کہا پھر لیٹ گیا۔ مجھے پتہ نہیں گیا تھا یا بیہوش ہو گیا تھا"۔

"میری ایک بات سنو!" — ایک میجر نے دوسرے سے کہا — "مسلمان عقیدے کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ اگر اس ڈاکٹر نے ایسے ہی کیا ہے جیسے یہ سنتری بتا رہا ہے تو یہ مر جائے گا' کچھ بتائے گا نہیں۔ ہمارے ہندو اتنا زیادہ ٹارچر برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کی جگہ کوئی ہندو ہوتا تو کل تک مر گیا ہوتا"۔

دونوں میجر چلے گئے۔

تقریباً نصف گھنٹہ بعد ایک کیپٹن ڈاکٹر سیل میں داخل ہُوا۔ اُس کے ساتھ ایک سپاہی تھا جس نے ایک ہاتھ میں دُودھ' دوسرے میں ڈبل روٹی اور ایسے ہی کھانے کی کوئی اور چیز اُٹھا رکھی تھی۔

"ڈاکٹر رشید!" — کیپٹن ڈاکٹر نے اُس جیتی جاگتی لاش کے قریب بیٹھ کر اُسے پکارا — "ڈاکٹر رشید.... رشید!" — اُس نے ہاتھ آگے کر کے ڈاکٹر عبدالرشید کا سر آہستہ آہستہ ہلایا۔

یہ ڈاکٹر عبدالرشید تھا جس نے صغیر کو فرار کروایا تھا۔ تین چار دنوں سے اسے غیر انسانی ایذارسانی کے ظالمانہ عمل میں سے گذارا جا رہا تھا اور اس پر غشی طاری تھی۔ کیپٹن ڈاکٹر کے بُلانے پر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس میں اتنی سی بھی سکت نہیں تھی کہ آنکھیں بھی پوری طرح کھول سکتا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہو ڈاکٹر رشید!" — کیپٹن ڈاکٹر نے کہا — "مَیں تمہارے مُنہ میں دُودھ ٹپکاؤں گا"۔

"اللہ اکبر" — ڈاکٹر رشید نے نقاہت زدہ آواز میں کہا اور جسم کو جھٹکا دے کر اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ اس نے کیپٹن ڈاکٹر سے کہا — "مَیں تمہاری عزت اس لئے کرتا ہوں کہ تم بھی ڈاکٹر ہو لیکن تمہارے ہاتھ سے کچھ کھانا پینا نہیں چاہوں گا کیونکہ تم ہندو ہو"۔

"ڈاکٹر رشید!" — کیپٹن ڈاکٹر نے کہا — "اپنے خون میں اتنا اُبال پیدا نہ کرو۔ تم میں بولنے کی طاقت نہیں۔ یہ لو' یہ دُودھ ہے اور یہ توش ہے' اس میں آملیٹ ہے۔ کھاؤ اور دُودھ پی لو' اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ مَیں ڈاکٹر ہوں اور اس لحاظ سے دونوں بھائی ہیں"۔

"اگر ہم کسی ہسپتال میں اپنی ڈیوٹی دے رہے ہوتے تو مَیں تمہیں اپنا بھائی سمجھتا" — ڈاکٹر رشید نے نحیف سی آواز میں کہا — "لیکن یہاں مَیں ملزم ہوں اور تم لڑنے والوں میں سے ہو۔ یہ بھی ذہن میں رکھو کہ یہ تفتیش نہیں بلکہ یہ ایک جنگ ہے جو زمین کے نیچے لڑی جا رہی ہے۔ لڑنے والے انڈیا اور پاکستان ہیں۔ پاکستان ایک اسلامی مُلک ہے اور مَیں مسلمان ہوں۔ اس جنگ میں اگر مَیں مارا گیا تو مَیں شہید کہلاؤں گا اور میری رُوح کو ابدی سکون ملے گا۔ میرے جسم کو کاٹتے چلے جاؤ' بوٹی بوٹی کردو' میرے مُنہ سے اُف یا ہائے نہیں نکلے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری رُوح زندہ ہے۔ میرے جسم کو جتنا بھی کچلو گے میری رُوح اتنی ہی زیادہ زندہ و توانا ہوتی چلی جائے گی .... اور سنو ڈاکٹر! مَیں اپنے جسم سے دستبردار ہو چکا ہوں۔ اس وقت تمہارے سامنے ایک رُوح بیٹھی ہے۔ انہیں کہہ دو کہ مَیں انہیں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا.... تم کہاں ہوتے ہو ڈاکٹر! میں نے تمہیں ملٹری ہسپتال میں تو کبھی نہیں دیکھا"۔

"کوئی دو مہینے ہوئے مَیں دلی سے آیا ہوں" — کیپٹن ڈاکٹر نے جواب دیا — "اور مجھے انٹیلی جنس کے ساتھ لگا دیا گیا.... تمہارے دل میں تو ہندوؤں کی بڑی زبردست نفرت بیٹھی ہوئی ہے"۔

"نفرت بھی' حقارت بھی!" — ڈاکٹر رشید نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا — "تمہیں شاید معلوم نہیں کہ مَیں نے کیا کیا ہے"۔

"نہیں" — کیپٹن ڈاکٹر نے کہا — "کیا کیا ہے تم نے؟"

ڈاکٹر عبدالرشید نے کیپٹن ڈاکٹر کو صغیر کے فرار کا سارا واقعہ سنا دیا اور کہا کہ اس نے اپنے اس جرم کا اقبال بڑے تفصیلی بیان میں کر دیا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتائے گا کہ اس کے ساتھ مددگار کون کون تھا۔

"کیا تمہارے دل میں عیسائیوں' پارسیوں اور سکھوں کی بھی نفرت ہے؟" — کیپٹن ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا — "مَیں عیسائیوں کو پسند کرتا ہوں۔ وہ بھی اس لئے کہ حضرت عیسیٰؑ نے محبت اور امن کا پیغام دیا ہے۔ اس کے علاوہ عیسائی بھی انڈیا میں اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مظلوم ہیں۔ خُدا کی قسم! جسے مَیں نے فرار کرایا ہے' اگر وہ عیسائی ہوتا تو بھی مَیں اُسے اپنی جان پر کھیل کر فرار کراتا۔ تم ہندو ہو۔ اپنے بریگیڈیئر اور دوسرے افسروں سے کہہ دینا کہ رشید اس قسم کی باتیں کرتا ہے"۔

"اگر مَیں ہندو ہوتا تو اُنہیں ضرور بتاتا" — لیکن کیپٹن ڈاکٹر نے کہا — "مَیں ہندو

نہیں ہوں"۔

کیپٹن ڈاکٹر نے کچھ دُور کھڑے سپاہی کی طرف دیکھا اور اُس سے کہا کہ وہ چلا جائے۔

"ڈاکٹر رشید!" — کیپٹن ڈاکٹر نے کہا — "مَیں کرسچیئن ہوں۔ مجھ پر اعتبار نہ ہو تو اس سپاہی سے پوچھ لو کہ میرا نام کیا ہے.... میرا نام فرانسس ہے" — ڈاکٹر فرانسس نے ایک گولی کا نام لیا اور پوچھا — "جانتے ہو اس گولی کے اثرات کیا ہیں؟"

"جانتا ہوں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "کوئی آدمی کوئی نشے والی چیز کھالے تو یہ گولی نشہ اُتار دیتی ہے اور نشے سے پہلے یہ دو گولیاں لے لو تو نشے کا اثر نہیں ہوتا.... کیا تم میرا امتحان لے رہے ہو؟"

"نہیں بھائی!" — ڈاکٹر فرانسس نے کہا — "یہ لوگ شاید تمہیں مزید ٹارچر نہ کریں۔ تمہیں بڑا اچھا کھانا دیں گے اور اس میں نشے والی گولیاں ملا دیں گے"۔

"مَیں جانتا ہوں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "یہ زیادہ تر ایل ایس ڈی استعمال کرتے ہیں"۔

"اور تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ ایل ایس ڈی کے اثرات کیا ہوتے ہیں" — ڈاکٹر فرانسس نے کہا — "تمہیں یہ گولیاں دی جائیں گی۔ مَیں کچھ دیر بعد آؤں گا۔ یہ گولیاں ساتھ لے آؤں گا اور یہاں کمرے میں کسی جگہ چھپا کر رکھ دُوں گا۔ تم جانتے ہو یہ ایک گولی صبح اور ایک شام کھانے سے پہلے لے لیا کرنا۔ ہوش میں رہو گے اور یہ لوگ تمہارے منہ سے کوئی بات نہیں نکلوا سکیں گے۔ یہ سوچ لو کہ تمہاری نیند اُڑ جائے گی"۔

"کوئی بات نہیں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "یہ میں برداشت کر لوں گا"۔

"لو' یہ دُودھ پی لو" — ڈاکٹر فرانسس نے دُودھ کا گلاس اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا — "اور یہ بھی کھالو۔ مَیں جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد آؤں گا"۔

"ڈاکٹر فرانسس!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "تمہاری یہ آفر بھی ایک دھوکہ ہو سکتا ہے۔ اگر میرے ساتھ دھوکہ کرو گے تو یہ کوئی بہادری نہیں ہو گی اور پھر یہ کبھی فخر سے نہ کہنا کہ تم ڈاکٹر ہو۔ مَیں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ مَیں ڈاکٹر ہوں۔ ڈاکٹروں کے پیشے کی اخلاقیات سے تم واقف ہو اور تم نے اِسی بنیاد پر حلف بھی اُٹھایا ہے"۔

"تم کیسی باتیں کرتے ہو ڈاکٹر رشید!" — ڈاکٹر فرانسس نے قدرے جھنجھلا کر کہا "مَیں تمہارے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کروں گا۔ معلوم نہیں تم اس وہم میں کیوں پڑ گئے ہو"۔

"انڈیا کی زمین ایسی ہے کہ یہاں دھوکہ اور فریب جنم لیتے ہیں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "تم کرسچیئن ہو' میرے اپنے مسلمان بھائی غدار ہو گئے ہیں.... مجھے دیکھو' مَیں غداری نہیں کر رہا۔ یہی میرا جرم ہے کہ مَیں اُن لوگوں کے نام نہیں بتا رہا جنہوں نے اس آدمی کو فرار کرانے میں مدد دی تھی.... اور میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ ڈاکٹر کی عظمت کیا ہوتی ہے۔ میں نے اس آدمی کو اس لئے فرار کرایا کہ اُس کی عقل کو بیکار کرنے کے لئے اسے ایل ایس ڈی سے بھی زیادہ خطرناک انجکشن دیئے جا رہے تھے اور اس شخص کو غلط طریقے سے استعمال کیا جا رہا تھا"۔

"میں جانتا ہوں بھائی!" — ڈاکٹر فرانسس نے کہا — "وہ انڈین انٹیلی جنس کا آدمی تھا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ پاکستانی ہے.... تم دیکھو گے ڈاکٹر رشید کہ میری طرف سے تمہارے ساتھ دھوکہ نہیں ہو گا اور تم جب تک زندہ رہو گے یاد کرو گے کہ کسی نے مشکل کے وقت مدد کی تھی۔ میں تمہیں یہاں سے نکلوا نہیں سکتا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں یہاں سے فرار کروا دیتا"۔

"مجھے جو شک تھا وہ میں نے ظاہر کر دیا ہے" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "تم دھوکہ کرو یا بھلا کرو میں نے تو جیل میں جانا ہی ہے۔ بھلا کرو گے تو واقعی ساری عمر یاد رکھوں گا اور اس کا صلہ تمہیں خُدا کی طرف سے ملے گا"۔

"میں جو کچھ کر رہا ہوں ڈاکٹر رشید!" — ڈاکٹر فرانسس نے اُٹھتے ہوئے کہا — "وہ میں خدا کے واسطے کر رہا ہوں' مجھے کسی انعام کی ضرورت نہیں"۔

ڈاکٹر فرانسس چلا گیا۔



اسی بلڈنگ میں جہاں ڈاکٹر عبدالرشید قید تھا' اوپر کی منزل پر ایک کمرہ تھا۔ یہ کمرہ کسی وزیر کا دفتر معلوم ہوتا تھا۔ اِس کے باہر اردلی کھڑا تھا۔ اندر چار پانچ فوجی افسر بیٹھے ہوئے تھے جو فوجی وردی میں نہیں تھے۔ ان میں ایک کرنل تھا اور باقی سب میجر تھے۔ یہ ایک اجلاس تھا جس کی صدارت ایک بریگیڈیئر کر رہا تھا۔

"دیکھا جائے تو بات کچھ بھی نہیں" — بریگیڈیئر نے ان افسروں سے کہا۔ "جس آدمی کو فرار کرایا گیا ہے وہ کوئی مجرم نہیں تھا یا وہ پاکستان کا جاسوس نہیں تھا' وہ تو ہمارے لئے کام کر رہا تھا۔ ہم اُسے آسانی سے پاکستان میں قتل کروا سکتے ہیں۔ جہاں ہم ایک دھماکہ کروا کے ایک درجن پاکستانی ہلاک کروا سکتے ہیں اور سندھ میں ہم جو کچھ کروا رہے ہیں وہ تم سب جانتے ہو' وہاں ایک آدمی کو قتل کروانا کوئی بڑی بات نہیں"۔

"یس سر!" — تقریباً تمام افسروں نے کہا اور کرنل بولا — "یہ تو کوئی مشکل نہیں"۔

"پاکستان میں کسی پاکستانی کو کسی پاکستانی کے ہاتھ سے ہی مروا دینا کوئی ٹیڑھا مسئلہ نہیں" — ایک میجر نے کہا۔

"لیکن" — بریگیڈیئر نے کہا — "اُسے فرار کرانے والوں کو ہم معاف نہیں کر سکتے۔ اگر ہم اس ڈاکٹر کو چھوڑ دیں تو کم از کم انبالہ کے مسلمان اور زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں کے مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک ہم نے ان میں سے کچھ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لگا لیا ہے لیکن ان پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ضرورت یہ ہے کہ اس ڈاکٹر کو عبرت کی ایک مثال بنا دیا جائے لیکن تم جانتے ہو یہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ منظّم گروہ ہے۔ اس گروہ کا ایک ایک آدمی پکڑنا ہمارے لئے بہت ضروری ہے .... مجھے تم روز بروز رپورٹ دیتے رہے ہو اور بتاتے رہے ہو کہ یہ ڈاکٹر تو جیسے لوہے کا بنا ہُوا ہے۔ میں خود حیران ہوں کہ تھرڈ ڈگری کی آخری سٹیج کو بھی اس شخص نے برداشت کر لیا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا اس کی کیا وجہ ہے"۔

"سَر!" — ایک میجر نے کہا — "مَیں ایک وجہ بتا سکتا ہوں۔ آپ شاید میرا مذاق اُڑائیں لیکن اسے ہم نظرانداز بھی نہیں کر سکتے .... میں نے ایک سنتری سے پوچھا تھا کہ رات کو ڈاکٹر رشید بیہوش پڑا رہتا ہے یا سویا رہتا ہے یا اس کی حالت کیا ہوتی ہے؟ سنتری نے مجھے بتایا کہ یہ رات کو بیٹھ کر مغرب کی طرف مُنہ کر کے کچھ پڑھتا رہتا ہے؟ سجدے بھی کرتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر قرآن کے الفاظ بلند آواز سے بولتا ہے۔ کئی بار اللہ اکبر بہت زور سے کہتا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس نے اپنی روحانی قوّت کو بیدار کر لیا ہے"۔

"یہ فیتھ ہے جسے مسلمان عقیدہ کہتے ہیں" — بریگیڈیئر نے کہا — "یہ ہمارے مذہب میں بھی ہے۔ ہمارے سادھو اور جوگی گھنٹہ گھنٹہ سانس روکے رکھتے ہیں"۔

"معاف رکھنا سرا!" — کرنل نے کہا — "ہمارے سادھو اور جوگی تو بیس بیس سال سانس روکنے کی یا کوئی سپر نیچرل طاقت پیدا کرنے کی پریکٹس کرتے ہیں۔ بعض تو اسی پریکٹس میں بوڑھے ہو جاتے ہیں پھر کہیں جا کر اُنہیں یہ طاقت حاصل ہوتی ہے۔ اس ڈاکٹر کی اتنی عمر ہی نہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہمارے سَیل میں آکر اسے یہ طاقت حاصل ہو گئی ہو۔ میرا کہنے سے مطلب یہ ہے کہ اِس نے ایسی یکسوئی پیدا کر لی ہے کہ اپنے جسم کو یہ اپنا جسم سمجھتا ہی نہیں"۔

یہ تمام افسر ہندو تھے۔ ان میں کوئی بھی یہ اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا کہ قرآن کے الفاظ میں ایسی طاقت موجود ہے جو انسان میں مافوق الفطرت قوت پیدا کر سکتی ہے' شرط یہ ہے کہ انسان گناہ گار نہ ہو اور جس کام کے لئے وہ غیر قدرتی قوّت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ کام نیکی کا ہو اور بنی نوع انسان کی بھلائی کا کام ہو۔ ڈاکٹر عبدالرشید نے اپنے جسم سے دستبردار ہو کر یہ روحانی قوّت پیدا کر لی تھی۔ ان افسروں کے چہروں کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ حیران ہیں کہ ایک نوجوان آدمی نے ایسی قوّت کیسے حاصل کر لی۔

"تھرڈ ڈگری چھوڑ دو" — بریگیڈیئر نے دو ٹوک فیصلہ دیا — "اِسے اچھا کھانا دو اور کھانے میں وہ سب کچھ ڈالو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ مَیں دیکھتا ہوں اس کی روحانی قوّت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ہمیں ہر قیمت پر اس کے گینگ کو پکڑنا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھو کہ ہمیں دِلّی والوں کو جواب دینا ہے ورنہ سب رگڑے جاؤ گے"۔

"سرا!" — کرنل نے کہا — "ابھی ایک طریقہ اور بھی ہے۔ اس کے گھر والوں کو بُلانا ہے' خصوصاً عورتوں کو۔ مسلمان بڑے غیرت مند ہوتے ہیں۔ مذہب اور اپنے گھر کی عورتوں کی عزت پر مرمٹتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ طریقہ استعمال کر لینا چاہئے"۔

"اوہ' نو!" — بریگیڈیئر نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا — "یہ طریقہ ہم ابھی استعمال نہیں کر سکتے۔ ایک ہفتہ پہلے مَیں دِلّی گیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ پرائم منسٹر کو انٹیلی جنس کے متعلق بریفنگ دینی تھی اور کچھ اُس کے آرڈر لینے تھے۔ چیف بھی ساتھ تھا۔ پرائم منسٹر نے بڑی سختی سے کہا ہے کہ الیکشن شروع ہونے والے ہیں اس لئے مسلمانوں اور عیسائیوں کو اپنے ہاتھ میں رکھنا اور ان کے مذہب کا بہت زیادہ خیال

رکھنا۔ پرائم منسٹر نے یہ بھی کہا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ اپنا رویّہ ایسا کر لو جیسے تمہیں ان کی عزت کا بہت ہی خیال ہے۔ یہ خاص طور پر خیال رکھنا کہ ان کی عورتوں اور ان کی مسجدوں کا احترام کرنا۔ الیکشن کے بعد دیکھی جائے گی .... بس یہ مجبوری ہے کہ ہم اس ڈاکٹر کے گھر کی عورتوں کو یہاں نہیں بلا سکتے۔ اگر ہم ایسا کر بیٹھیں تو یہاں کے مسلمان ایک ہنگامہ کھڑا کر دیں گے اور یہ ہنگامہ دلّی تک پہنچے گا اور نہ جانے کہاں کہاں پہنچے۔ اس کا فائدہ رُولنگ پارٹی کے مخالفین کو پہنچے گا"۔

اسی دوران چائے آ گئی اور یہ افسر چائے پینے میں مصروف ہو گئے اور اس دوران وہ اس کیس کے متعلق بھی باتیں کرتے رہے۔

اُس وقت ڈاکٹر فرانسس ایک بار پھر ڈاکٹر رشید کے سَیل میں موجود تھا۔ اُس نے ڈاکٹر رشید کو فرش پر لٹا کر ایسا تاثر پیدا کر رکھا تھا جیسے وہ اس کا تفصیلی ڈاکٹری معائنہ کر رہا ہو۔ سنتری کی اس طرف توجہ نہیں تھی۔ وہ دروازے سے ہٹ گیا تھا۔ اس سَیل کے ساتھ اٹیچ باتھ تھا اور اس باتھ کا چھوٹا سا روشندان بھی تھا۔ ڈاکٹر فرانسس باتھ روم میں گیا اور گتّے کی ایک لمبوتری سی ڈبیا کموڈ کے اوپر کھڑے ہو کر روشندان میں ایسی جگہ رکھ آیا جہاں سے نیچے کھڑے آدمی کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔

"میں نے وہاں دو چیزیں رکھی ہیں" — ڈاکٹر فرانسس نے ڈاکٹر رشید کو بتایا — "ایک نیوروبیون کی گولیاں ہیں اور دوسری تم جانتے ہو۔ نیوروبیون صبح ایک ہی لینی ہے ...."

"ہاں ہاں فرانسس!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "میں جانتا ہوں۔ دوسری صبح اور شام ایک ایک گولی لے لیا کروں گا یا ہر کھانے سے پہلے لے لوں گا"۔

"بہتر یہ ہو گا" — ڈاکٹر فرانسس نے کہا — "جس وقت کھانا آئے تم باتھ روم میں چلے جایا کرو اور کموڈ پر کھڑے ہو کر ایک گولی منہ میں ڈال لیا کرو اور اندر کے نلکے سے ہی دو چار گھونٹ پانی پی لیا کرو اور کھانا پندرہ بیس منٹ بعد کھانا"۔



ساڑھے بارہ بج رہے تھے' ڈاکٹر رشید کے سَیل کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر رشید کا کھانا آیا تھا۔ اُس نے جب کھانا لانے والے دو آدمیوں کو دیکھا تو اُسے حیرت کا دھچکہ سا لگا۔ دونوں آدمیوں کے ہاتھوں میں ایک ایک ٹرے تھی۔ اس سے پہلے فضول سی ایک چنگیر

اور ٹیڑھی میڑھی ایک پلیٹ میں کھانا آیا کرتا تھا۔ چنگیر میں دو روٹیاں اور پلیٹ میں پتلی سی دال ہُوا کرتی تھی لیکن اب اچانک ڈاکٹر رشید وی آئی پی بن گیا۔ دونوں ٹرے اس کے آگے رکھی گئیں تو وہ کھانا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کھانا مرغّن تھا۔ اس میں گوشت کا سالن تھا۔ ایک ٹکڑا روسٹ مُرغی کا تھا' سبزی بھی تھی' ساتھ چپاتیاں تھیں اور سویٹ بھی تھی۔

"لو صاحب!" — ایک آدمی نے کہا — "کھانا کھا لیں' ہم کچھ دیر بعد برتن لے جائیں گے"۔

دونوں آدمی چلے گئے۔ ڈاکٹر رشید کچھ دیر کھانے کو دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کھانے میں کیا ہے۔ وہ باتھ روم میں گیا۔ یہ کوئی صاف ستھرا نہیں بلکہ انتہائی غلیظ باتھ روم تھا جس کا کموڈ بھی بوسیدہ تھا۔ وہ کموڈ پر چڑھ گیا اور روشندان میں ہاتھ پھیرا۔ اُس کا ہاتھ ڈبیا تک پہنچ گیا۔ ڈبیا گھسیٹ کر کھولی تو اس میں اسے دو قسم کی گولیاں پڑی نظر آئیں۔ اُس نے بی کمپاؤنڈ کی ایک گولی اور ایک دوسری گولی نکال کر ڈبیا وہیں چھپا دی اور کموڈ سے اُتر آیا۔ دونوں گولیاں مُنہ میں ڈالیں اور کمرے میں آ کر وہ پانی پیا جو کھانے کے ساتھ آیا تھا۔ پھر وہ اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ اُس نے ارادہ کیا تھا کہ کم و بیش آدھے گھنٹے بعد کھانا کھائے گا۔

ڈاکٹر رشید کی جسمانی حالت بہت ہی بری تھی لیکن اُس نے اپنے آپ میں جو قوتِ ارادی پیدا کر لی تھی اس سے اُس نے دَرد اور اینٹھن وغیرہ پر قابو پا لیا تھا۔ ڈاکٹر فرانسس کو وہ فرشتہ سمجھ رہا تھا۔ اس سے اس کو یہ تاثر ملا کہ اللہ اس کی مدد کر رہا ہے۔ اس تاثر نے اس کی روحانی قوّت کو مزید تقویت دی۔

اس نے کھانا بڑے اطمینان سے کھایا اور اس کے بعد اپنا جائزہ لینے لگا کہ اس پر غنودگی طاری ہوتی ہے یا نہیں۔ کچھ دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ ڈاکٹر تھا اس لئے سمجھتا تھا کہ یہ غنودگی نیند کی ہے اور اس نیند کی وجہ یہ ہے کہ اسے دو دن اور دو راتیں سونے نہیں دیا گیا تھا اور اذّیتیں دی گئی تھیں۔ وہ نوٹ کر رہا تھا کہ اس کی ذہنی حالت نارمل تھی پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

اسے کسی نے جگا دیا۔ کمرے کا بلب روشن تھا اور دروازے کے باہر اسے برآمدے کے بلب کی روشنی میں سنتری کھڑا نظر آ رہا تھا اور اس سے پرے تاریکی تھی۔

وہ سمجھ گیا کہ وہ کم و بیش پانچ گھنٹے سویا رہا ہے۔ اس نے جگانے والے کو دیکھا جسے وہ جانتا تھا۔ یہ ایک میجر تھا اور یہی میجر اسے ایذا رسانی کے ظالمانہ عمل سے گزارتا تھا۔

ڈاکٹر رشید اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اس کمرے میں چلیں؟" — ڈاکٹر رشید نے نارمل ذہنی حالت میں میجر سے پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" — میجر نے بڑے احترام سے کہا — "آئی ایم ویری ساری ڈاکٹر رشید! سمجھ نہیں آئی مَیں آپ سے کیسے معافی مانگوں۔ مَیں درخواست دینے والا ہوں کہ مجھے میری یونٹ میں ٹرانسفر کر دیں۔ مَیں یہ کام نہیں کر سکتا کہ آپ جیسے معزز آدمی کے ساتھ ایسا سلوک کروں جو مجھ سے کروایا گیا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا"۔

"آپ کا رینک کیا ہے؟"

"میں میجر ہوں ڈاکٹر صاحب!" — میجر نے جواب دیا — "میرا تعلق انفنٹری سے ہے"۔

"میں آپ کا بہت مشکور ہوں میجر صاحب!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "لیکن مَیں حیران ہوں کہ اچانک آپ کا روّیہ کیوں بدل گیا ہے!"

"آپ تو ڈاکٹر ہیں" — میجر نے کہا — "میرے اندر انسانیت بیدار ہو گئی ہے۔ یہ میرے ضمیر کی آواز ہے"۔

ڈاکٹر رشید اُس سے پوچھنے ہی لگا تھا کیا ہندوؤں کا بھی ضمیر ہوتا ہے؟ لیکن اُس نے زبان بند رکھی۔ وہ کسی کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ کھانے میں اُسے ٹرانکولائزر دیا گیا ہے جس کا اس پر کچھ اثر نہیں ہُوا۔ ڈاکٹر رشید دیکھ رہا تھا کہ میجر جو کچھ کہہ رہا تھا وہ اُس تاثر سے مختلف تھا جو اُس کے چہرے پر تھا۔ یہ ہندو میجر ڈاکٹر رشید کو ٹیڑھی سی نگاہوں سے سر سے پاؤں تک دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر رشید ان نگاہوں کو سمجھتا تھا۔

"میرا خیال ہے آپ کو نیند آ رہی ہے" — میجر نے کہا — "ابھی ساڑھے دس ہی بجے ہیں، آپ سو جائیں"۔

"سو جاؤں گا" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "آپ میرے پاس بیٹھنا چاہتے ہیں تو بیٹھیں، باتیں کریں، باتیں سنیں"۔

"ڈاکٹر رشید صاحب!" — میجر نے کہا — "مَیں اس وقت باتیں کرنے کے ہی موڈ

ہیں ہوں لیکن زیادہ موڈ یہ طاری ہے کہ آج آپ کچھ باتیں کریں۔ مشکل یہ ہے کہ آپ ہندوؤں کو اپنا دُشمن سمجھتے ہیں اور آپ نے اپنے اِردگرد اسلام کا ایسا دائرہ ڈال رکھا ہے کہ نہ اس میں سے آپ باہر آتے ہیں نہ کسی اور مذہب کے آدمی کو اس دائرے میں داخل ہونے دیتے ہیں"۔

"نہیں میجر صاحب!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "اسلام کے اس دائرے کا ایک روازہ کھلا رہتا ہے۔ اگر آپ اس دائرے میں آنا چاہتے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہو گی کن آپ کو ہمیشہ کے لئے اس دائرے میں آنا پڑے گا جسے دوسرے لفظوں میں یہ کہہ ں کہ آپ کو مسلمان ہونا پڑے گا"۔

"اپنے دل کی بات بتاؤں ڈاکٹر رشید؟" — میجر نے کہا — "کئی بار دل میں آئی ہے کہ مسلمان ہو جاؤں"۔

"وہ کیوں؟"

"اگر آپ کی میرے ساتھ ملاقات باہر ہو جاتی تو آپ خود سمجھ لیتے" — "میجر نے ا — "میرے تین چار دوست ہیں۔ یہ سب مسلمان ہیں۔ بڑے اچھے خاندانوں کے ی ہیں۔ مَیں مسلمانوں کے ساتھ کھاتا پیتا ہوں۔ حلال گوشت کھاتا ہوں.... بائی دی ے، یہ جو گوشت آج آپ کو بھیجا گیا تھا یہ حلال تھا۔ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ آپ کو لے کا گوشت کھلاتے ہیں.... اگر مجھ پر خاندانی پابندیاں نہ ہوتیں تو میں کبھی کا مسلمان چکا ہوتا"۔

"کیا آپ مجھے اس وقت جگا کر یہی بتانے آئے ہیں؟"

"یہی سمجھ لیں" — میجر نے کہا — "میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور یہ میری ٹی میں شامل ہے کہ آپ کو دیکھوں .... آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں دیکھنے کی رت ہی محسوس نہ کرتا۔ آپ ڈاکٹر ہیں۔ میں نے آپ کا گھر دیکھا ہے۔ اس کی ٹی لی ہے۔ اس گھر کے بچے سے لے کر آپ کے والد صاحب تک کو دیکھا ہے۔ اس زیادہ معزز خاندان اور کون سا ہو گا۔ میں آپ کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرتا ں۔ آپ نے ایک پاکستانی کو فرار کرایا اور بغیر کسی لالچ یا تشدّد کے ہمارے بریگیڈیئر کو ل سے بتا دیا کہ آپ نے اُسے فرار کرایا ہے، اور اب آپ اپنے ساتھیوں کی ہی نہیں کر رہے۔ یہ بھی آپ کی عظمت کا ثبوت ہے۔ کم از کم مَیں آپ سے نہیں

پوچھوں گا کہ وہ لوگ کون ہیں .... البتہ ایک خدشہ نظر آتا ہے۔ ان میں سے کوئی خود ہی آگے نہ آ جائے اور وعدہ معاف گواہ نہ بن جائے۔ ظاہر ہے یہ آدمی آپ کے دوست ہوں گے' آپ کے محلے میں رہتے ہوں گے یا ہاسپٹل میں آپ کا کوئی کولیگ ہو گا"۔

"ظاہر ہے میجر صاحب کہ وہ میرے اعتماد کے ہی لوگ ہوں گے" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "یہی وجہ ہے کہ مَیں اُن کے نام نہیں بتا رہا۔ اگر اُن میں سے کوئی خود ہی آگے آ جاتا ہے تو یہ اُس کا اور میرا معاملہ نہیں بلکہ اُس کا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ مَیں اُنہیں دھوکہ نہیں دُوں گا"۔

"مجھ پر آپ اعتماد نہیں کریں گے" — میجر نے کہا — "اگر مجھے ذرا سا بھی علم ہو جائے تو مَیں اُن لوگوں پر نظر رکھوں"۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں میجر صاحب!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "مَیں آپ پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ آپ اپنی ڈیوٹی کے پابند ہیں اور مجھ پر اپنے ایمان کی پابندی ہے"۔

یہ دراصل ایک قسم کی معرکہ آرائی تھی جو اس ہندو میجر اور اس مسلمان ڈاکٹر کے درمیان ہو رہی تھی۔ میجر یہ دیکھ رہا تھا کہ کھانے میں جو ٹرانکولائزر ڈالے گئے تھے ان کا ڈاکٹر پر کتنا کچھ اثر ہُوا ہے' اور خود ڈاکٹر یہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کی ذہنی حالت بگڑ تو نہیں رہی۔ ڈاکٹر اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اُس کی ذہنی حالت بالکل نارمل تھی۔ اسے خیال آیا کہ اس میجر پر یہ ظاہر کر دے کہ اُس پر غنودگی طاری ہو رہی ہے تاکہ وہ اگلے کھانے میں اس سے زیادہ ٹرانکولائزر نہ ڈال دے۔ یہ سوچ کر اس نے اس طرح کی ایکٹنگ شروع کر دی کہ آہستہ آہستہ آنکھیں بند کرتا اور سر کو جھٹکا دے کر آنکھیں کھول دیتا۔

"اوہ!" — میجر نے کہا — "آپ کو نیند آ رہی ہے"۔

"نہیں" — ڈاکٹر رشید نے جھوٹ بولا — "نیند تو اتنی نہیں آ رہی جتنا میں سُرور سا محسوس کر رہا ہوں"۔

میجر کے چہرے پر رونق سی آ گئی جیسے اُس کا مقصد حل ہو رہا ہو۔

"اگر نیند آ رہی ہے تو مَیں چلا جاتا ہوں" — میجر نے کہا — "مَیں نے بتایا ہے ناکہ مَیں باتوں کے مُوڈ میں ہوں۔ اس وقت بالکل فری ہوں"۔

"آپ نے تو مجھ پر بھی باتوں کا موڈ طاری کر دیا ہے" — ڈاکٹر رشید نے ایسی آواز میں کہا جس میں ہلکا ہلکا نشے کا تاثر تھا — "بیٹھیں باتیں کریں .... آپ شادی شدہ ہیں؟"

"ہاں ڈاکٹر صاحب!" — میجر نے جواب دیا — "میرا ایک بچہ بھی ہے .... اور آپ؟"

"نہیں" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا — "میں تو ابھی رومان لڑانے کے موڈ میں ہوں۔ میری منگیتر ملٹری ہاسپٹل میں میرے ساتھ نرس ہے"۔

"اس کا نام شاید خالدہ ہے" — میجر نے پوچھا۔

"ہاں خالدہ!" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا — "آپ نے اُسے دیکھا ہو گا"۔

"ہاں .... بڑی اچھی لڑکی ہے"۔

"بہت خوبصورت لڑکی ہے" — ڈاکٹر رشید نے رومانی سے لہجے میں کہا — "اور آپ نے دیکھا ہے کہ کتنی پیاری اور دلکش ہے۔ وہ میری منگیتر ہے اور ابھی ہم رومان لڑا رہے ہیں"۔

"اُسے یہ بھی معلوم ہو گا کہ آپ نے یہ جرم کیا ہے" — میجر نے کہا۔

"نہیں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "مَیں اُسے نہیں پھنسانا چاہتا تھا۔ ویسے بھی مسلمانوں کا یہ دستور ہے کہ وہ اس قسم کی خفیہ کارروائیوں میں کسی عورت کو شامل نہیں کیا کرتے۔ خالدہ کو تو معلوم ہی نہیں کہ میں نے کبھی صغیر کو فرار کرانے کی سوچی بھی تھی"۔

اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر رشید نے خالدہ کے متعلق رومانی باتیں جھوم جھوم کر کرنی شروع کر دیں۔ اسے کوئی بھی دیکھتا تو یہی کہتا کہ یہ شخص نشے میں ہے۔

"آپ شملہ تو جاتے ہوں گے" — میجر نے پوچھا — "آپ جیسے رومان پسند نوجوان گرمیوں میں شملہ ضرور جاتے ہیں"۔

"ہاں ہاں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "مَیں ہر گرمیوں میں جاتا ہوں"۔

"آپ کی اپنی گاڑی تو نہیں؟"

"نہیں" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا — "کبھی گاڑی بھی مل جائے گی"۔

"آپ کے دوستوں میں سے تو کسی کی گاڑی ہو گی!" — میجر نے کہا — "جو مزہ اپنی گاڑی میں ہے وہ بس وغیرہ میں کہاں"۔

"میرے کسی دوست کے پاس اپنی کار نہیں" — ڈاکٹر رشید نے کہا۔

ڈاکٹر عبدالرشید کا ذہن زندہ و بیدار تھا اور وہ چوکنّا تھا۔ میجر نے جب گاڑی کا ذکر کیا تو ڈاکٹر رشید فوراً سمجھ گیا کہ اُس کا اشارہ کِس گاڑی کی طرف ہے۔ صغیر کو ہسپتال سے ایک سوزوکی کار میں لے جایا گیا تھا۔

میجر اس یقین کے ساتھ کہ ڈاکٹر رشید پر ٹرانکولائزر کا اثر ہو چکا ہے اس سے دوستانہ اور اُستادانہ طریقے سے راز کی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ڈاکٹر رشید نشے کی ایکٹنگ سے اُس کے یقین کو پختہ کر رہا تھا۔

میجر نے گھڑی دیکھی۔ اُسے ڈاکٹر رشید کے پاس آئے ڈیڑھ گھنٹہ گُزر چکا تھا۔ وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ نشے کا اثر عروج پر ہونا چاہئے لیکن رشید کے منہ سے راز کی کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ ڈاکٹر رشید نے آنکھیں بند کرنی شروع کر دیں۔ میجر بھی اُکتا گیا تھا۔

"اچھا ڈاکٹر صاحب!" — میجر نے اُٹھتے ہوئے کہا — "آپ کو نیند آ رہی ہے۔ سو جائیں۔ پھر آؤں گا۔ کوشش کریں کہ آپ کا دل میری دوستی کو قبول کر لے۔ مَیں ثابت کر دوں گا کہ مَیں آپ کا دوست ہوں"۔

اُس نے ڈاکٹر رشید سے ہاتھ ملایا اور چلا گیا۔

ڈاکٹر رشید کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے نیند کی ایکٹنگ کی تھی۔ اسے اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر فرانسس نے اس کے ساتھ دھوکہ نہیں کیا۔ وہ لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔



صغیر اُن ہی عصمت فروشوں کے ہاں چھپا بیٹھا تھا جہاں رحمو تانگے والا اسے چھوڑ آیا تھا۔ ان عصمت فروشوں کے پاس دو بہنیں تھیں .... شمیم اور نائلہ .... شمیم تو عصمت فروشی کی منڈی میں نام پیدا کر چکی تھی لیکن نائلہ اس لائن کو قبول نہیں کر رہی تھی۔ صغیر نے ان کے آقاؤں کو یقین دلایا تھا کہ وہ نائلہ کو تیار کر لے گا۔ رحمو تانگے والے نے صغیر کے متعلق ان عصمت فروشوں کو ایسا تاثر دیا تھا جیسے یہ جرم و گناہ کی دُنیا کا کوئی اُستاد ہے اور اِسے تھوڑے عرصے کے لئے روپوش رہنے کی ضرورت ہے۔ ان عصمت فروشوں کو رحمو پر اعتماد تھا اس لئے انہوں نے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس

نہیں کی تھی کہ صغیر کہاں کا رہنے والا ہے اور اس کی ہسٹری کیا ہے۔

صغیر نے دو تین دنوں میں ہی ان لوگوں پر اپنا رُعب اور اپنا اعتماد پیدا کر لیا تھا۔ ان لوگوں نے اُس کی زخمی ٹانگ کی مرہم پٹی کا انتظام بھی خفیہ طریقے سے کروا دیا تھا۔ چونکہ اُس نے کہا تھا کہ وہ نائلہ کو اس لائن پر چلا لے گا اس لئے نائلہ کو موقع دیا جاتا تھا کہ وہ صغیر کے پاس الگ تھلگ بیٹھ جایا کرے۔ صغیر نے اپنا نام اکبر بتایا تھا۔

"تم جس طرح یہاں پہنچی ہو وہ مَیں یہاں آنے سے پہلے ہی سُن چکا ہوں" — صغیر نے نائلہ سے پہلی تنہائی کی ملاقات میں کہا — "مجھے بتایا گیا ہے کہ تم اس راستے پر چلنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر رہی جس طرح تمہاری بہن چل پڑی ہے۔ مَیں نے تمہارے مالکوں کو یہ امید دلائی ہے کہ میں تمہیں اس کام کے لئے تیار کر لوں گا لیکن نائلہ! میں ایسا گناہ کبھی نہیں کروں گا لیکن تمہارے مالکوں کو یہ بتاتا رہوں گا کہ اس لڑکی کو میں تیار کر رہا ہوں۔ تم انہیں ایسا تاثر نہ دینا کہ تم میرے ساتھ بہت خوش ہو لیکن ایسی ایکٹنگ کرتی رہنا جیسے تم تیار ہو رہی ہو"۔

"تمہیں میرے ساتھ کیا دلچسپی ہے؟" — نائلہ نے پوچھا۔

"یہ اُس وقت بتاؤں گا جب تم پر میرا اعتماد پکا ہو جائے گا" — صغیر نے جواب دیا — "میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔ تمہارے مطلب کی بات میں نے پہلے ہی کہہ دی ہے کہ تمہیں نہ بدکاری کے لئے تیار کروں گا اور نہ تمہیں اس راستے پر چلنے دوں گا خواہ خود تم آمادہ بھی ہو جاؤ۔ مَیں تمہیں یہاں سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا"۔

"مجھے یقین نہیں آتا" — نائلہ نے کہا — "اس غلیظ دنیا میں جہاں عصمتیں نیلام ہوتی ہیں، کسی ہمدرد کا وجود قابلِ یقین نہیں لگتا"۔

"دیکھو نائلہ!" — صغیر نے کہا — "تم نے پوچھا تھا کہ میرے دل میں تمہاری ہمدردی کیوں پیدا ہوئی ہے۔ میں اسی پنجاب کا رہنے والا ہوں جہاں کی تم رہنے والی ہو۔ میرا مطلب پاکستانی پنجاب سے ہے۔ 1971ء میں پاکستان آدھا رہ گیا تھا لیکن اصل یہ تھا کہ تم جیسی ہزاروں لڑکیاں کلکتہ کے بازاروں میں پہنچا دی گئی تھیں۔ ان میں سے تم ایک مجھے مل گئی ہو۔ میں اسے ایک نیکی سمجھوں گا کہ تمہیں یہاں سے نکال کر تمہارے گھر تک پہنچا دوں"۔

"تم پاکستانی پنجاب کے ہو" — نائلہ نے کہا — "پھر یہاں کیا لینے آئے ہو؟ کیا یہ

لوگ تمہارے رشتہ دار تھے؟"

"میرے متعلق مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھو" — صغیر نے کہا — "اگر اپنا بھلا چاہتی ہو تو مجھے ایک انسان اور مسلمان سمجھو۔ میری اصلیت کو یہ لوگ بھی نہیں جانتے اور یہ جان بھی نہیں سکیں گے۔ میں تمہیں یہاں سے نکال کرلے جاؤں گا"۔

یہ تو پہلی ملاقات تھی۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ پہلی ملاقات میں ہی نائلہ اس اجنبی پر اعتماد کرلیتی۔ ایسی دو تین ملاقاتیں ہوئیں تو نائلہ کو یقین آنے لگا کہ صغیر پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ صغیر کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ اس نے تو اپنا مُلک اور اپنا ایمان بھی بیچ ڈالا تھا۔ اس سے زیادہ گھناؤنا جرم اور گناہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے انٹیلی جنس سے تربیت حاصل کی تھی۔ وہ لوگوں کی آنکھوں میں ڈھول جھونکنے کی مہارت رکھتا تھا اور چرب زبانی کا بھی ماہر تھا۔ اس نے نائلہ پر اپنا اثر پیدا کرلیا اور پھر ایسے بھی ہُوا کہ نائلہ آدھی رات کو اٹھ کر بھی اس کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔

پھر ان کی یہ ملاقاتیں محبت کی صورت اختیار کر گئیں۔ یہاں تک بھی ہُوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب بیٹھنے لگے کہ ان کے درمیان سے ہوا کا گزر بھی ناممکن ہو جاتا تھا۔ ان کی سانسیں ٹکراتی تھیں۔ ان کی انگلیاں ایک دوسری سے الجھ جاتی تھیں اور دلوں کی دھڑکنیں کہیں زیادہ تیز ہو جایا کرتی تھیں پھر بھی صغیر نے پاکیزگی کا دامن نہ چھوڑا اور یہ احتیاط بھی کی کہ محبت کے رومانی جذبات سے مغلوب ہو کر بھی اس نے اپنی اصلیت نائلہ پر ظاہر نہ ہونے دی۔



"نائلہ!" — ایک ملاقات میں صغیر نے نائلہ سے پوچھا — "مَیں حیران ہوں کہ تمہاری بڑی بہن کس طرح پختہ کار طوائف بن چکی ہے"۔

"مَیں بتاتی ہوں" — نائلہ نے کہا — "شمیم تو جوان ہوتے ہی رومان پسند ہو گئی تھی۔ ہم ڈھاکہ میں ہُوا کرتے تھے۔ ہمارے ابّا جان بہت بڑے ٹھیکیدار تھے۔ ٹھیکے لینے کے لئے انہیں ٹھیکے دینے والے افسروں کی بہت خدمت کرنا پڑتی تھی۔ شمیم اُس وقت جوان تھی۔ ابّا جان نے اسے افسروں کے ساتھ فری ہونے کا موقع دیا اور ساتھ ہی یہ ٹریننگ بھی دی کہ وہ اپنی عزت کو بچا کر رکھے۔ اُس وقت شمیم کالج میں پڑھتی تھی۔ میں چھوٹی تو تھی لیکن اتنی چھوٹی بھی نہیں کہ کچھ سمجھ نہ سکتی۔ میں جانتی تھی کہ شمیم

نے کالج میں دوستیاں لگا رکھی ہیں۔ ہمارے گھر میں پیسے کی فراوانی تھی۔ شمیم نوجوان اور خوبصورت تھی، ہماری ماں تک کا دماغ دولتمندی کی وجہ سے خراب ہو گیا تھا۔ وہ خوش ہوتی تھی کہ اس کی بیٹی ماڈرن ہے۔ میں جانتی تھی کہ شمیم ماڈرن بننے کی کیا قیمت دے رہی ہے۔ اُس وقت اور آج کے وقت میں فرق صرف یہ ہے کہ اُس وقت شمیم کو کوئی طوائف نہیں کہتا تھا اور اب یہ طوائف کہلاتی ہے....

"مَیں بھی اِسی فیملی کی لڑکی تھی لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ میرا دماغ اس طرح ماڈرن بننے کی طرف نہ گیا۔ شاید اس لئے کہ بچپن سے ہی میری سہیلیاں اُن گھروں کی لڑکیاں بنیں جن میں مذہب اور اخلاق موجود تھا۔ اس سے ذرا بڑی ہوئی تو مشرقی پاکستان میں قیامت کا طوفان آ گیا۔ ابّا جان قتل ہو گئے۔ ماں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک ہی بھائی تھا، اس کا بھی کچھ پتہ نہ چلا اور ہم دونوں اغوا ہو گئیں۔ مجھے شروع سے ہی ہندوؤں سے نفرت تھی۔ ہمیں بہت ذلیل و خوار کر کے یہاں تک پہنچایا گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں جب اغوا ہوئی اور یہاں تک پہنچی اُس وقت تک میں چھوٹی تھی اس لئے میری عصمت محفوظ رہی۔ میں یہاں جوان ہوئی ہوں اور ابھی تک باعصمت ہوں....

"یہاں کا ایک جاگیردار میرا پہلا گاہک بننے کی خواہش کرتا ہے لیکن میرا ذہن قبول نہیں کر رہا۔ ایک بار اس جاگیردار نے شمیم کو اور مجھے اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ ہمارے یہ مالک بھی ساتھ تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یہ عام قسم کے عصمت فروش نہیں بلکہ یہ شریفوں کی کسی بڑی اونچی محفل میں جا بیٹھیں تو انہیں نہ جاننے والے یہی کہیں گے کہ یہ تو بڑے شائستہ اور تہذیب یافتہ لوگ ہیں۔ جاگیردار کوئی زیادہ عمر کا آدمی نہیں۔ میرا خیال ہے اُس کی عمر پینتیس سال سے کم ہی ہو گی اور وہ خوبرو آدمی ہے"۔

"ایسا خوبرو تو نہیں کہ تم اس کی محبت میں گرفتار ہو جاؤ؟" — صغیر نے جذباتی سے انداز میں کہا۔

"تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو اکبر!" — نائلہ نے کہا — "مَیں ایسی تو نہیں کہ کسی بدکار خوبرو آدمی کو دیکھوں تو اُس کی شکل و صورت اور دولت پر مر مٹوں۔ میں تمہیں یہ ساری باتیں اس لئے بتا رہی ہوں کہ شاید تم یہاں سے نکلنے اور مجھے یہاں سے نکالنے کا کوئی راستہ یا ذریعہ سوچ سکو"۔

یہ الگ بات ہے کہ صغیر کا دماغ قومی جذبے کے تحت اپنے اصل مقام پر آ گیا تھا

لیکن یہ دماغ ہندو جیسی عیّار قوم کا تربیت یافتہ تھا اور پھر اسے انٹیلی جنس کی ٹریننگ تھی اس لئے وہ بہتر سے بہتر راستے اور ذریعے سوچ سکتا تھا۔ اس معاملے میں بھی اس نے ایک راستہ دیکھ لیا۔

"نائلہ!" — صغیر نے کہا — "ذہن میں ایک بات آتی ہے۔ یہ سوچ لو کہ میں یہاں کیوں چھپا ہُوا ہوں۔ میں کوئی چور اور ڈاکو نہیں۔ بات یہ ہے کہ مَیں بغیر ویزا اور پاسپورٹ کے یہاں آ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا خاندان یہاں سے ہجرت کر کے پاکستان گیا تھا۔ میرے والدین مجھے ایسی باتیں سناتے رہے ہیں کہ میرے خون میں اُبال آ گیا اور مَیں اس عمر میں آ کر اس اُبال کے جوش میں اندھا دُھند سرحد پار کر کے یہاں آ گیا۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ مَیں کتنا جذباتی آدمی ہوں۔ تمہارے متعلق پتہ چلا کہ تم عصمت فروشی کو قبول نہیں کر رہیں تو مَیں اپنی مشکلات کو بھُول کر تمہاری مدد کے لئے تیار ہو گیا۔ معلوم نہیں تم جانتی ہو یا نہیں کہ انڈیا کی پولیس مجھ جیسے پاکستانیوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ اگر کوئی مجھ جیسا آدمی انہیں مل جائے تو اُسے جاسوس کہہ کر جیل میں ڈال دیتے ہیں اور پھر اسے پاکستان کے خلاف جاسوسی کے لئے تیار کرتے ہیں۔ میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا نائلہ! یہاں کی پولیس نے مجھے دیکھ لیا ہے اور وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں"۔

"میں بھی تمہاری ہی طرح پاکستان کے معاملے میں جذباتی ہوں" — نائلہ نے کہا — "اگر تمہاری یہ مشکل ہے تو تم نے بیان کی ہے تو خدا کی قسم، میں تمہاری پوری مدد کروں گی اور جان پر کھیل جاؤں گی"۔

"میں نے ایک راستہ سوچا ہے" — صغیر نے کہا — "میں اگر اس جاگیردار سے ملوں اور اس سے کہوں کہ اگر تمہیں نائلہ کی ضرورت ہے تو اسے میں لے آؤں گا شرط یہ ہے کہ مجھے یہاں سے نکالو"۔

"وہ دھوکہ بھی دے سکتا ہے" — نائلہ نے کہا۔

"میں اتنا کچا نہیں نائلہ!" — صغیر نے کہا — "میں اگر اس سے ملا تو اس کی نیت بھانپ لوں گا۔ مجھے اس کا گھر معلوم ہونا چاہئے"۔

"یہ تو میں بھی بتا سکتی ہوں" — نائلہ نے کہا۔

"مشکل یہ ہے نائلہ!" — صغیر نے کہا — "مَیں اس شہر سے واقف نہیں"۔

"اس کا گھر ڈھونڈنا بڑا آسان ہے" — نائلہ نے کہا — "میں تمہیں موٹی موٹی نشانیاں بتا دوں گی اور تم آسانی سے اس کے پاس پہنچ جاؤ گے .... اس سے زیادہ آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ مشہور آدمی ہے۔ تانگے والے بھی اسے جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی تانگے والے کو اس کے گھر کا نام بتاؤ گے تو وہ تمہیں وہاں تک پہنچا دے گا۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ تمہارا اس سے ملنا ٹھیک ہے یا نہیں"۔

"یہ میں سوچ لوں گا" — صغیر نے کہا۔



صغیر کو نائلہ کے ساتھ دلچسپی تھی یا نہیں، اس کا اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ پاکستان پہنچنے کا کوئی ذریعہ نکل آئے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ نائلہ کو وہ یہاں سے نکالنے کا ارادہ کر چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں نائلہ کی وہ محبت پیدا ہو گئی تھی جس کی خاطر انسان بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ اس نے اس پر بھی غور کیا کہ وہ اکیلا نہیں نکل سکتا تو نائلہ کو ساتھ لے کر پاکستان تک کیسے پہنچے گا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک راستہ سوچ لیا۔

اُسے رحمو تانگے والے کا خیال آیا اور وہ سوچنے لگا کہ رحمو کے ساتھ وہ بات کر لے تو کیا رحمو اُسے اس جاگیردار تک پہنچا دے گا؟ سوچ سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ان عصمت فروشوں کے ساتھ رحمو کا بڑا پرانا یارانہ ہے اور یہ عصمت فروش اُس کی آمدنی کا ذریعہ بھی ہیں اس لئے رحمو تعاون نہیں کرے گا بلکہ وہ دھوکا بھی دے سکتا ہے۔ بیشک رحمو کے دل میں ہندو کی نفرت اور پاکستان کی محبت موجود تھی لیکن وہ کوئی اتنا زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔ قدرتی بات تھی کہ اُس نے اپنا مفاد بھی سوچنا تھا۔

اُتنے دن صغیر نے شیو نہیں کی تھی۔ اُس کی داڑھی خاصی نکل آئی تھی جس سے اس کا چہرہ کچھ ڈھانپا گیا تھا۔ وہ اب لنگڑائے بغیر چل سکتا تھا۔ ایک رات اُس نے اپنے عصمت فروش میزبانوں سے کہا کہ وہ ذرا گھومنے پھرنے کے لئے جانا چاہتا ہے۔ انہوں نے اُسے روکا کہ وہ باہر نہ نکلے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پکڑا جائے۔ صغیر جاگیردار تک پہنچنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے سوچ لیا تھا کہ کوئی نہ کوئی خطرہ تو مُول لینا ہی پڑے گا۔ اندر بیٹھے بیٹھے تو انڈیا سے فرار کا کوئی ذریعہ پیدا نہیں ہو گا۔

تھوڑی دیر بعد صغیر بازارِ حسن میں سے گزر رہا تھا۔ اُسے نائلہ کے مالکوں نے اپنے کپڑے دیئے تھے۔ ان میں ایک چغہ بھی تھا۔ سر پر اُس نے مولویوں جیسی پگڑی لپیٹ لی تھی۔ کندھے پر تولیہ ڈال لیا تھا۔ وہ کسی مدرسے یا مسجد کا مولوی لگتا تھا۔

یہ رات کا وقت تھا جب عصمت فروشی کے بازار میں دن کا سماں ہوتا ہے۔ بازار کی رونق جوبن پر تھی۔ کوئی کسی کو پہچاننے کی کوشش نہیں کر رہا تھا بلکہ ہر کسی کی کوشش تھی کہ کوئی اُسے نہ پہچان لے۔ صغیر تماش بینوں کے اس متحرک ہجوم میں سے گزرتا تانگوں کے اڈے تک پہنچ گیا۔ دو تین تانگے والے اُس کی طرف دوڑے اور پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔

"چوہدری قادر بخش کا گھر جانتے ہو؟" — صغیر نے اُن سے پوچھا اور کہا — "وہ جو بہت بڑے جاگیردار ہیں" — اور اُس نے ایک نشانی اور بھی بتائی۔

"مَیں جانتا ہوں" — ایک کوچوان نے کہا — "آیئے مولوی صاحب' اِدھر آ جائیں"۔

تانگے والے نے اُسے جاگیردار کے گھر پہنچا دیا اور منہ مانگے پیسے لے لئے۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے جب صغیر ایک اجنبی جاگیردار کے دروازے پر کھڑا تھا۔ یہ ایک عالیشان کوٹھی تھی۔ اندر کمروں میں روشنی تھی۔ صغیر نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی گھنٹی کا سوئچ دبا دیا جس کے جواب میں اندر سے دو کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں اور پھر ایک نوکر باہر آیا اور صغیر سے پوچھا کہ وہ کس سے ملنا چاہتا ہے۔

"چوہدری صاحب سے ملنے آیا ہوں" — صغیر نے کہا — "اگر وہ آرام نہ کر رہے ہوں تو انہیں اطلاع دو .... اور یہ ضرور کہنا کہ وہ مجھے نہیں جانتے' کام بہت ضروری ہے"۔

نوکر کچھ کہے بغیر چلا گیا اور جلد ہی واپس آکر اُس نے صغیر سے کہا کہ وہ آ جائے۔

چوہدری قادر بخش ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہُوا تھا۔ نوکر نے صغیر کو ڈرائنگ روم میں داخل کر دیا۔ چوہدری قادر بخش نے بڑے اچھے طریقے سے صغیر کا استقبال کیا اور اُسے احترام سے بٹھایا۔

"آپ آرام تو نہیں کر رہے تھے؟" — صغیر نے پوچھا۔

"آرام کر رہا تھا تو کیا!" — چوہدری قادر بخش نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا —

"آپ نہ جانے کتنی دُور سے آئے ہیں تو کیا مَیں یہ جواب دیتا کہ مَیں آرام کر رہا ہوں؟ آپ حکم کریں مَیں کیا خدمت کر سکتا ہوں"۔

صغیر نے چوہدری قادر بخش کے انداز سے ہی اندازہ کر لیا کہ یہ شخص اُن جاگیرداروں سے بالکل مختلف ہے جن کی کہانیاں ہم سنتے سناتے رہتے ہیں اور جو ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے علاقے کے لوگوں کے لئے فرعون بنے رہتے ہیں۔

"مَیں بغیر تمہید کے بات کروں گا" — صغیر نے کہا — "آپ مجھے ایک معزز آدمی سمجھ رہے ہوں گے لیکن میری بات کا تعلق عصمت فروشوں کے ساتھ ہے .... البتہ یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ میرا اِن لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میرا تعلق ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ ہے جو ان کے پاس ہے اور معلوم ہُوا ہے کہ آپ اس لڑکی میں دلچسپی رکھتے ہیں"۔

"آپ نائلہ کی بات تو نہیں کر رہے؟" — چوہدری قادر بخش نے پوچھا۔

"جی چوہدری صاحب!" — صغیر نے جواب دیا — "مَیں آپ کو سب سے پہلے یہ بتا دوں کہ مَیں اس لڑکی کا سودا کرنے نہیں آیا بلکہ اُسے وہاں سے نکالنے کے لئے آیا ہوں"۔

صغیر نے یہ بات اندھا دُھند کہہ دی تھی۔ جاگیردار نے تو یہی کہنا تھا کہ ہاں بھئی اُس لڑکی کو نکال لاؤ اور میرے گھر لے آؤ۔ صغیر نے یہ خاص طور پر دیکھا تھا کہ یہ جاگیردار جوان آدمی ہے' خوبرو ہے اور اس کی طبیعت میں شگفتگی بھی ہے۔

"پہلے آپ یہ بتائیں" — چوہدری قادر بخش نے پوچھا — "آپ کا اس لڑکی کے ساتھ کیا تعلق ہے اور آپ اِسے وہاں سے کیوں نکالنا چاہتے ہیں۔ مجھے آپ کی بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے .... جس طرح آپ نے اپنے متعلق بتایا ہے کہ آپ کا تعلق عصمت فروشوں کے ساتھ نہیں اس طرح مَیں آپ کو صاف الفاظ میں بتا دیتا ہوں کہ مَیں اس لڑکی کا گاہک نہیں بننا چاہتا۔ مجھ میں یہ خرابی ہے کہ مَیں گانے سننے کا عادی ہوں بدکاری کا نہیں۔ مَیں نے اس لڑکی کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ یہ مجھے اتنی اچھی لگی اور اتنی بھولی بھالی کہ مَیں نے اس کے حالات معلوم کیئے' پتہ چلا یہ دو بہنیں ہیں۔ بڑی بہن اس پیشے میں رواں دواں ہے اور یہ چھوٹی انکار کر رہی ہے۔ مَیں نے اس کے مالکوں سے یہ ضرور کہا تھا کہ مَیں اس کا پہلا گاہک بننا چاہتا ہوں لیکن مَیں نے دل میں یہ رکھی

ہوئی تھی کہ ایک بار یہ لڑکی میرے پاس آ جائے تو پھر خدا کے سوا اِسے مجھ سے کوئی واپس نہیں لے سکتا۔ مَیں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

"الحمدللہ" — صغیر نے کہا — "اس سے زیادہ نیک ارادہ اور کیا ہو گا.... اب مَیں آپ کو بتاتا ہوں کہ میرا اس لڑکی کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ دونوں بہنیں 1971ء میں ڈھاکہ سے اغوا ہوئی تھیں"۔

"یہ مَیں جانتا ہوں" — چوہدری قادر بخش نے ہنستے ہوئے کہا — "مَیں ان کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں"۔

"پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ یہ دو بہنیں پاکستانی ہیں" — صغیر نے کہا۔ "اور مَیں ان کا قریبی رشتہ دار ہوں۔ اگر مَیں آپ کو بتاؤں کہ مَیں ان تک کس طرح پہنچا تو اس میں ایک خطرہ تو یہ ہے کہ آپ یقین نہیں کریں گے اور دوسرا خطرہ یہ کہ آپ میرے خلاف کارروائی بھی کر سکتے ہیں۔ یہ مَیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہاں کے مسلمان ہندوؤں سے مرعوب اور ہندوؤں کو خوش کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں"۔

"میرے ہاں ایسی کوئی بات نہیں" — چوہدری قادر بخش نے کہا — "مجھے کسی کی خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری اپنی ایک حیثیت ہے جسے ہندو بھی مانتے ہیں۔ بڑے بڑے افسروں تک میرا اثر و رسوخ بھی ہے۔ آپ دل سے تمام خطرے اُتار دیں اور کُھل کر بات کریں"۔

"مَیں پاکستانی ہوں" — صغیر نے کہا — "مَیں یہاں بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے آیا تھا" — صغیر نے وہی چھوٹی کہانی چوہدری قادر بخش کو بھی سنا دی جو وہ رحمو اور نائلہ کو بھی سنا چکا تھا — "اتفاق دیکھئے کہ ایک تانگے والا مل گیا۔ وہ بھی میری طرح کا زخم خوردہ تھا۔ اُس نے مجھے ان عصمت فروشوں کے ہاں چھپا لیا اور وہاں شمیم اور نائلہ سے ملاقات ہوئی۔ مجھے پتہ چلا کہ نائلہ اپنے جسم کو بیچنا نہیں چاہتی۔ ان عصمت فروشوں نے مجھ پر بھروسہ کیا۔ مَیں تو کہتا ہوں کہ یہ اتفاق اللہ نے پیدا کیا ہے کہ مجھے ان لڑکیوں تک پہنچا دیا۔ میرا خیال ہے نائلہ بھی آپ کو چاہتی ہے۔ اگر آپ سچے دل سے اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں تو مَیں اُس لڑکی کو یہاں تک لا سکتا ہوں۔ اس اُمید کے ساتھ کہ آپ سچے دل سے اس کے ساتھ شادی کریں گے۔ مَیں آپ سے صرف یہ اُجرت

لُوں گا کہ مجھے پاکستان پہنچا دیں"۔

"کیا آپ مجھ سے قرآن پر حلف لینا چاہتے ہیں؟"

"نہیں چوہدری صاحب!" — صغیر نے کہا — "مَیں آپ سے کوئی قسم نہیں لینا چاہتا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ قسمیں کھانے والے لوگ سچے نہیں ہوتے .... میری دیانتداری کا اندازہ اس سے کریں کہ مَیں آپ سے لڑکی کی قیمت کا مطالبہ نہیں کر رہا۔ میرا مطالبہ یا میری ضرورت یہ ہے کہ مجھے اپنے گھر میں چھپائے رکھیں اور جب آپ موقع محل دیکھیں، مجھے یہاں سے نکال دیں"۔

"آپ لڑکی کو لائیں گے کیسے؟" — چوہدری قادر بخش نے پوچھا۔

"وہاں سے نکال لاؤں گا" — صغیر نے کہا — "آگے آپ کا ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ یہاں تک خیریت سے پہنچ جائیں۔ یہ بھی دیکھ لیں کہ میری ٹانگ زخمی ہے"۔

"یہ کوئی مشکل کام نہیں" — چوہدری قادر بخش نے کہا — "اُس بازار کے باہر میری گاڑی کھڑی ہو گی۔ لڑکی کو وہاں سے گاڑی تک پہنچانا آپ کا کام ہے۔ گاڑی تک پہنچ گئے تو وہاں سے میری ذمہ داری شروع ہو جائے گی"۔

دونوں نے نائلہ کے فرار کی ترکیبوں پر تبادلۂ خیالات کیا اور آخر ایک بات طے ہو گئی۔ صغیر نے کہا کہ کل ہی رات گاڑی آ جائے اور جتنے گھنٹے انتظار کرنا پڑے ڈرائیور انتظار کرے۔

چوہدری قادر بخش نے صغیر کی خاطر مدارات کی اور اپنی گاڑی پر اُسے واپس بھیجا۔ صغیر نے ڈرائیور کو جگہ بتا دی کہ کل رات گاڑی یہاں ہونی چاہئے۔



صغیر واپس عصمت فروشوں کے ٹھکانے تک پہنچ گیا۔ وہ لوگ اُس کے لئے پریشان تھے۔ کہتے تھے کہ وہ تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ صغیر پکڑا گیا ہے۔ نائلہ تو اور زیادہ پریشان تھی۔ وہ صغیر کے پاس بیٹھ گئی۔ اُس کے مالکوں نے انہیں تنہا چھوڑ دیا۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ صغیر نائلہ کو عصمت فروشی کے لئے تیار کر رہا ہے اور یہ یقیناً کامیاب ہو گا۔

"وہ تو تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے نائلہ!" — صغیر نے نائلہ کو بتایا اور چوہدری کے ساتھ اُس کی جتنی باتیں ہوئی تھیں وہ سب سنائیں اور اپنی رائے یہ دی

— "وہ شادی کے ارادے میں مکمل طور پر سنجیدہ نظر آتا ہے۔ باتوں باتوں میں اُس نے مجھے بتایا تھا کہ اُس کی شادی ہوئی تھی۔ ایک تو اولاد نہ ہوئی، دوسرے یہ کہ وہ لڑکی اُس کی پسند کی نہیں تھی اور وہ اس سے ازدواجی زندگی میں خاصا پریشان رہا پھر اُس کی یہ بیوی مرگئی۔ اب گزشتہ تین برسوں سے وہ اپنی پسند کی لڑکی کی تلاش میں ہے"۔

"لیکن اکبر!" — نائلہ نے کہا — "مَیں تمہیں صاف بتادیتی ہوں کہ مَیں پاکستان جانا چاہتی ہوں اور تمہارے ساتھ شادی کروں گی۔ مَیں ایک جاگیردار کی بیوی نہیں بننا چاہتی۔ مَیں جانتی ہوں کہ ایسے جاگیردار بیوی تو ایک ہی رکھتے ہیں لیکن بے نکاحی بیویوں کا کوئی شمار نہیں ہوتا۔ اگر مَیں اُس کے ساتھ شادی کرلوں تو مجھے ہمیشہ اِسی مُلک میں رہنا پڑے گا جو مجھے منظور نہیں۔ میرے دل میں ہندوؤں کی نفرت اس قدر زیادہ ہے جس پر مَیں قابو پا ہی نہیں سکتی"۔

صغیر پر خاموشی طاری ہوگئی۔

"غور کرو نائلہ!" — صغیر نے کہا — "مَیں اکیلا اس مشکل سے نہیں نکل سکتا۔ مَیں تم جیسی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو ساتھ لے کر کیسے نکلوں گا۔ مَیں نے دیکھ لیا ہے کہ یہ جاگیردار مجھے یہاں سے نکلوانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم اُس کے ساتھ شادی کرلو اور مَیں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ اس چوہدری نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کا وعدہ کرلیا ہے۔ کچھ دِنوں بعد اِسے اُکسائیں گے کہ پاکستان کی سیر کے لئے ویزے بنوائے اور ہم دونوں کو ساتھ لے چلے۔ پاکستان پہنچ گئے تو مَیں اِسے آسانی سے قتل کرسکتا ہوں۔ اس سے یہ ہوگا کہ تم پاکستان میں بھی پہنچ جاؤ گی اور میرے ساتھ شادی بھی کرسکو گی۔ اس چوہدری کا اتنا اثر و رسوخ ہے کہ یہ تمہیں بیوی کی حیثیت سے اور مجھے نوکر کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے۔ یہ تو مَیں نے بھی محسوس کیا ہے کہ یہ شخص طوائفوں کے گانے سننے کا عادی ہے۔ تمہارے ساتھ شادی کرکے بھی یہ اپنا شغل جاری رکھے گا اور کسی اور نوجوان طوائف کو پسند کرکے تمہیں گھر میں قید کرلے گا لیکن یہاں سے نکلنا ہے تو اس کا ذریعہ یہی ہے جو مَیں نے بتایا ہے۔ کل رات اُس کی گاڑی آرہی ہے اور ہم نے یہاں سے نکل جانا ہے"۔

"مَیں تیار ہوں" — نائلہ نے کہا۔

○

وہ ایک تین منزلہ بلڈنگ تھی۔ نیچے سے اُوپر تک طوائفیں رہتی تھیں۔ نیچے تین چار کمرے ان لوگوں نے کرائے پر لے رکھے تھے جن کے پاس شمیم اور نائلہ تھیں۔ صغیر نے مین گیٹ کے علاوہ ایک راستہ دیکھ لیا تھا۔ یہ بلڈنگ کے پچھواڑے چھوٹا سا ایک دروازہ تھا جو عام طور پر آنے جانے کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا اور رات کو اُدھر اندھیرا ہی رہتا تھا۔ صغیر نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ اُدھر نکل گئے تو اتنی تاریکی ہے اور گلیوں کی بھول بھلّیاں ایسی ہیں کہ تعاقب کرنے والوں کو خاصی دشواری پیش آتی ہے۔

رات بارہ بجے کے بعد نائلہ صغیر کے پاس آئی۔ اُس وقت اس بلڈنگ میں خاصی رونق تھی۔ شمیم اپنے مستقل گاہوں کے ساتھ مصروف تھی۔ ان کے گاہک بڑی موٹی آسامیاں ہوتی تھیں۔ ان کے مالک ان گاہکوں کے ساتھ مصروف تھے۔ صغیر نے نائلہ کو ایک چادر دی جو اُس نے اپنے اُوپر اس طرح لے لی کہ چہرہ بھی ڈھانپا گیا۔ دونوں اللہ کا نام لے کر خاموشی سے اُٹھے اور جس طرف سے لوگ اس بلڈنگ میں داخل ہوتے تھے، اُدھر جانے کی بجائے پچھلی طرف چلے گئے اور پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ گلیوں میں گھومتے پھرتے اس علاقے سے بالکل ہی باہر چلے گئے اور پھر صغیر نے اُدھر کا رُخ کرلیا جدھر چوہدری قادر بخش کی گاڑی نے آنا تھا۔ صغیر نے دُور سے ہی دیکھ لیا کہ سٹریٹ لائٹوں کی روشنی میں گاڑی کھڑی ہے۔

صغیر اُس روشنی میں جانے سے گریز کر رہا تھا۔ اُس نے نائلہ کو اندھیرے میں کھڑا کردیا اور خود گاڑی کی طرف چل پڑا۔ ڈرائیور گاڑی کے باہر کھڑا تھا۔ تانگے اور کاریں آجا رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے رات گزرنے کے ساتھ ساتھ اس علاقے کی رونق بڑھتی جارہی ہے۔ ڈرائیور نے اس طرف دیکھا تو صغیر نے ہاتھ اُوپر کرکے اشارہ کیا۔ ڈرائیور بڑی تیزی سے گاڑی میں بیٹھا اور دو منٹ بعد گاڑی صغیر کے پاس آکر رُک گئی۔

"آگے لے چلو" — صغیر نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔

کار اُس جگہ رُک گئی جہاں نائلہ کھڑی تھی۔ صغیر نے اُسے دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھالیا۔

"چلو بھائی!" — صغیر نے ڈرائیور سے کہا — "تیز چلنا ہے"۔

"مجھے معلوم ہے" — ڈرائیور نے کہا۔

کار چل پڑی اور موڑ کاٹتی ہوئی چوہدری قادر بخش کی کوٹھی تک پہنچ گئی۔ چوہدری بیتابی سے انتظار کر رہا تھا۔

چوہدری نے صغیر اور نائلہ کی خاطر تواضع کی۔

"دیکھو نائلہ!" — چوہدری قادر بخش نے کہا — "مجھے غلط نہ سمجھنا۔ نکاح سے پہلے تم ان کے ساتھ الگ کمرے میں رہو گی۔ کل نکاح خواں آ جائے گا اور نکاح ہو جائے گا.... مَیں تمہیں موقع دیتا ہوں کہ اچھی طرح سوچ لو۔ مَیں تمہیں باقاعدہ شریعت کے مطابق بیوی بنا رہا ہوں۔ تم اکیلی ہو۔ اکبر صاحب کے سوا تمہارا یہاں کوئی وارث نہیں۔ مَیں یہ نہیں کہلوانا چاہتا کہ مَیں نے تمہارے ساتھ زبردستی یا تمہاری کسی مجبوری کے تحت شادی کی ہے۔ خدا نے مجھے بادشاہی بخشی ہے۔ میرے لئے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں لیکن مجھے وہ بیوی چاہئے جسے میرا دل قبول کرے۔ میں نے تم میں صرف یہ خوبی نہیں دیکھی کہ تم خوبصورت اور نوجوان ہو بلکہ یہ خوبی دیکھی ہے کہ تم اپنے جسم کو پاک رکھنا چاہتی ہو اور تمہارا ضمیر تمہیں بدکاری کی طرف نہیں جانے دے رہا۔ مَیں تمہیں پاک لڑکی سمجھتا ہوں"۔

نائلہ نے سر جھکا لیا اور مُنہ سے کچھ بھی نہ بولی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ رضامند ہے۔

چوہدری نے اُنہیں الگ کمرے میں بھیج دیا۔

صبح ہوئی تو ان کا ناشتہ کمرے میں ہی آیا۔ یہ دونوں ناشتہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بڑا ہی پُر تکلف ناشتہ تھا۔

دن کے بارہ بج رہے تھے جب چوہدری ان کے کمرے میں آیا اور انہیں اطلاع دی کہ نکاح خواں آگیا ہے اور وہ تھوڑی دیر تک نائلہ کے پاس ایجاب و قبول کے لئے آئے گا۔

نائلہ نوخیز لڑکی تھی۔ اُس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ صغیر اُس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔

"امّی اور ابّو یاد آ رہے ہیں" — نائلہ نے روتے ہوئے کہا — "اگر اُن کی زندگی میں میری شادی ہوتی تو سینکڑوں لوگ مدعو ہوتے اور مَیں اب بھی تصور کر سکتی ہوں کہ

کیسی رونق لگتی لیکن خدا نے معلوم نہیں کس گناہ کی سزا دی ہے کہ کس حال میں میری شادی ہو رہی ہے اور آگے نہ جانے کیا ہو۔ میرا میکہ تو کوئی ہے ہی نہیں"۔

"دل کو مضبوط کرو نائلہ!" — صغیر نے کہا — "یہ عارضی شادی ہے۔ دُعا کرو کہ ہم نے جو سکیم سوچی ہے وہ کامیاب ہو جائے۔ شکر والی بات تو یہی ہے کہ تم گناہوں کی اُس دُنیا سے نکل آئی ہو۔ یہ اللہ کی مدد ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اللہ آخر دم تک ہمارا مددگار رہے گا"۔

اتنے میں ایک مولوی کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ مولوی نائلہ کے پاس بیٹھ گیا اور اُس نے ایجاب و قبول کا فرض پورا کر دیا۔ نائلہ نے دبی دبی سی آواز میں "ہاں" کہی تھی اور اُس نے نکاح نامے پر دستخط بھی کر دیئے۔ نکاح خواں اُس آدمی کے ساتھ چلا گیا اور صغیر کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

ڈرائنگ روم میں پانچ چھ آدمی بیٹھے تھے۔ نکاح خواں نے جا کر اعلان کیا کہ لڑکی نے دُولہا کو قبول کر لیا ہے۔ اس کے بعد نکاح کی باقی رسمیں پوری کی گئیں اور یہ سب لوگ ڈائننگ روم میں چلے گئے جہاں کھانا لگا ہُوا تھا۔

"اکبر صاحب!" — چوہدری قادر بخش نے صغیر کے کان میں کہا — "نائلہ اکیلی ہے۔ آپ اس کے پاس چلے جائیں۔ آپ کا کھانا وہیں آ جائے گا"۔

صغیر نائلہ کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں ایک نوکرانی موجود تھی۔ نوکرانی سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ چوہدری قادر بخش کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ اس کی صرف دو بہنیں ہیں۔ دونوں شادی شدہ ہیں اور جائیداد سے اپنا حصہ لے کر کبھی کی الگ ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ چوہدری کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم میں جو مہمان موجود تھے وہ چوہدری کے یار دوست تھے۔

چوہدری قادر بخش اور نائلہ میاں بیوی بن گئے۔ چوہدری نے نائلہ کے لئے بہت سے زیورات اور کپڑے تیار کروا رکھے تھے جو نوکروں نے نائلہ کے آگے لا کر ڈھیر کر دیئے۔



صغیر کو الگ کمرہ دے دیا گیا اور چوہدری نے اُس کی مرہم پٹی کا انتظام کر دیا۔ اب اُس کا زخم تقریباً ٹھیک ہو چکا تھا اور وہ بڑے آرام سے چل پھر سکتا تھا لیکن وہ چوہدری

کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا زخم ٹھیک ہو گیا ہے۔ اُسے یہ خدشہ محسوس ہوتا تھا کہ اُس نے ایسا بتا دیا تو چوہدری اُسے فوراً پاکستان بھجوانے کا بندوبست کر دے گا۔ وہ اتنی جلدی نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ سکیم کے مطابق اُس نے نائلہ کو بھی ساتھ لے جانا تھا۔

اگلے روز جب نائلہ کا نکاح پڑھا جا رہا تھا اُس کے مالک ریلوے سٹیشن کے قریب رحمو تانگے والے کے پاس کھڑے اُسے بُرا بھلا کہہ رہے تھے کہ وہ کس چور اچکے کو اُن کے پاس چھوڑ گیا تھا جو لڑکی کو بھی بھگا کر لے گیا ہے۔ رحمو بڑی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

"میری بات پر غور کرو" — رحمو نے کہا — "اُسے چوہدری قادر بخش اُڑا لے گیا ہو گا"۔

"لیکن یہ بھی تو سوچو" — ایک آدمی نے کہا — "تمہارا یہ یار تو چوہدری کو جانتا ہی نہیں تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ چوہدری اسے بھی اغوا کر کے لے گیا ہو"۔

"یہ ہو سکتا ہے" — ایک اور آدمی نے کہا — "اس آدمی کو چوہدری نے ہی بھیجا ہو گا اور اس نے تمہارے ساتھ یہ جھوٹ بولا ہو کہ وہ بغیر ویزے کے آیا ہُوا پاکستانی ہے۔ چوہدری نے اس آدمی کو نائلہ کو اغوا کرنے کے لئے ہی یہاں بھیجا ہو گا"۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ لڑکی اکبر کے ساتھ پاکستان کی طرف روانہ ہو گئی ہو" — ان میں سے کسی نے کہا — "اکبر نے تو بہرحال پاکستان ہی جانا تھا"۔

"کیوں نہ چوہدری کے پاس چلیں" — ایک نے مشورہ دیا — "اور اُسے بتائیں کہ تمہارا مال تو چوری ہو گیا ہے"۔

وہ سب چوہدری قادر بخش کے ہاں گئے اور وہاں سے بے عزتی کروا کر نکل آئے۔ چوہدری نے انہیں بہت گالیاں دیں اور کہا کہ وہ اس شک کی بناء پر آئے ہیں کہ اُس نے ان کی لڑکی اغوا کرائی ہے۔ اُس وقت نائلہ اور صغیر اِسی کوٹھی کے ایک کمرے میں بیٹھے ہنس رہے تھے۔ اُنہوں نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر ان لوگوں کو آتے بھی دیکھا تھا اور جاتے بھی دیکھا۔

وہاں سے آ کر وہ اس علاقے کے تھانے میں چلے گئے۔ تھانیدار انہیں دیکھ کر احترام سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ اونچی حیثیت کے عصمت فروش ہیں اور ان سے اسے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ انہوں نے تھانیدار کو بتایا کہ ایک لڑکی

کے ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ نائلہ زیادہ تر چوہدری کے ساتھ ہی رہتی تھی اور صغیر کے پاس اُس نے بیٹھنا کم کر دیا تھا۔

"نائلہ!" — ایک روز صغیر نے نائلہ سے کہا — "چوہدری کو پاکستان کے لئے تیار کرو"۔

"کر لوں گی" — نائلہ نے کہا — "ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی وہ کم از کم ایک مہینہ شملہ میں رہنا چاہتے ہیں.... اچھا مَیں چلتی ہوں، وہ میرے انتظار میں ہوں گے"۔

صغیر کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ وہ نائلہ کو اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا لیکن نائلہ نے کھڑے کھڑے بات سنی اور جواب دے کر چلی گئی۔

سولہ سترہ روز گزر گئے۔ صغیر نے نائلہ میں یہ تبدیلی دیکھی کہ اُس نے اُس کے پاس آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک روز صغیر نے نائلہ کو بازو سے پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھا لیا۔

"تم مجھ سے دُور ہٹتی جا رہی ہو نائلہ!" — صغیر نے اُداس سے لہجے میں کہا۔

"مَیں صاف بتا دوں؟" — نائلہ نے کہا — "مَیں جانتی ہوں تمہیں دُکھ ہو گا لیکن اکبر! چوہدری کی وارفتگی اور والہانہ محبت نے مجھے ایسی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے کہ مَیں چوہدری کے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی۔ اس شخص سے مجھے ایک دوست کا پیار بھی ملا ہے، خاوند کی وفا بھی ملی ہے اور اس شخص نے میرے باپ کی شفقت کی کمی بھی پوری کر دی ہے.... تم جب تک ہمارے ساتھ رہنا چاہتے ہو رہو، مَیں چوہدری سے کہوں گی کہ وہ تمہیں پاکستان تک پہنچانے کا بندوبست کر دے"۔

نائلہ نے یہ کہا اور چلی گئی۔ صغیر کو بہت ہی دُکھ ہُوا لیکن اُس نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلّی دی کہ پاکستان جانے کا بندوبست ہو جائے گا، پھر اُس نے اپنے آپ کو یہ تسلّی بھی دی کہ اُس نے ایک نیک اور پاک لڑکی کو گناہوں کی دُنیا سے نکال کر کسی کی بیوی بنا دیا ہے اور یہ لڑکی اس آدمی میں گھل مل گئی ہے۔

اگلے روز سورج شملہ کی پہاڑیوں سے پیچھے چلا گیا اور تاریکی ذرا گہری ہونے لگی تو صغیر نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا تو اُسے ایک تھانیدار اور ایک کانسٹیبل اس مکان کے احاطے میں داخل ہوتے نظر آئے جن میں اُن کی رہائش تھی۔ صغیر کا خون جم کے رہ گیا۔ پولیس کی آمد کا مطلب یہ تھا کہ اُس کی نشاندہی ہو گئی ہے اور اب اُسے گرفتار کر